بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْیَاءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ یُرْزَقُوْنَ ٥

اور جو لوگ خدا کی راہ میں شہید کیے گئے انہیں ہرگز مردہ نہ سمجھنا بلکہ وہ لوگ زندہ ہیں اپنے پروردگار کے یہاں سے وہ روزی پاتے ہیں

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

(جوشؔ)

شہیدِ انسانیت

ازافادات

مفکرِ اسلام مجتہد العصر نابغہ روزگار سید العلماء الحاج علامہ سید علی نقی النقوی مدظلہ العالی

سابق ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی علی گڑھ یونیورسٹی

ناشر:

امامیہ مشن پاکستان ٹرسٹ ۷۔ انارکلی لاہور

1/2

(جملہ حقوق بحق پبلشر محفوظ)

بار ـــــــ سوم
اشاعت ـــــــ سنہ ۱۹۸۶ء
تعداد ـــــــ ایک ہزار
باہتمام ـــــــ علی محتشم جعفری
مطبع ـــــــ اظہار سنز ریٹی گن روڈ لاہور
طابع ـــــــ اظہار الحسن رضوی
کتابت ـــــــ محمد اصغر قریشی طاہر رقم
طباعت ـــــــ آفسٹ
کاغذ ـــــــ سفید اعلیٰ
قیمت

عرضِ ناشر

انسان کو پروردگارِ عالم نے اشرف المخلوقات بنایا اور اس کی خلقت کی غرض معرفتِ خالق قرار دی۔ فکری رہنمائی کا اہتمام خود خالق کی طرف سے اس طرح کیا گیا کہ اتمامِ حجت ہو جائے اور عدم معرفت کے عذر کی گنجائش باقی نہ رہے۔ چنانچہ ہر زمانے کی ضروریات کے مطابق ہادیانِ برحق مبعوث ہوتے رہے، یہاں تک کہ وہ وقت آ گیا کہ رب اپنے دین کے اکمال اور اپنی نعمتوں کے اتمام کا اعلان کر دے۔ جناب پیغمبر آخر الزمان حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کتابِ ہدایت کے ساتھ اپنے اسوۂ حسنہ کا نمونہ پیش کیا۔ اس معلّمِ آخری نے متعلمین کو نہ صرف پورے نصابِ ہدایت سے روشناس کرا دیا بلکہ یہ اہتمام بھی کر دیا کہ کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ ان کی عترت واہلبیت کو ترکۂ رسولؐ سمجھو اور دونوں سے وابستہ رہ کر رشد و ہدایت حاصل کرتے رہو۔ اس طرح گمراہی سے بچنے کی راہ دکھا دی۔ یوں تو ہر نگرانِ کار نے رسولؐ کے پیغام کو اصلی خد و خال میں پہنچانے اور اس طرح اپنے بعد گمراہی سے بچانے کا فریضۂ نگہبانی باحسن وجوہ انجام دیا لیکن فخرِ انسانیت کے نواسہ شہیدِ انسانیت امام حسینؑ نے اس سرمایۂ علم وعمل کی حفاظت کا فرض کچھ اس طرح ادا کیا کہ جس کی نظیر کائناتِ عالم میں نہیں مل سکتی ؎

از ہیچ پیمبرے نیامد این کار — واللہ کہ اے حسینؑ کارے کردی

مدعیانِ معرفتِ خدا پر ان کا یہ وہ احسانِ عظیم ہے کہ جس سے وہ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے وہ محسن شناسی کا اظہار اس طرح کر سکتے ہیں کہ حسینیت کا پیغام دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچا دیں۔ اسی مقصدِ عظیم کے پیشِ نظر امام حسینؑ کی تیرہ سو سالہ یادگار کے سلسلہ میں جناب سید العلماء علامہ علی نقی النقوی مدظلہ العالی نے ایک جامع پروگرام قوم کے سامنے پیش کیا جس کے تحت شہر شہر، قریہ قریہ اور بستی بستی یادگارِ حسینی کے اجلاس منعقد ہوئے۔ اس پروگرام میں ایک ایسی کتاب کی تدوین بھی شامل تھی جو بین الاقوامی نقطۂ نظر سے امام حسینؑ کے سوانح حیات اور واقعۂ ہائلۂ کربلا کی مستند تفصیلات پر مشتمل ہو چنانچہ اس کی تدوین میں ہر فرقہ ومسلک کے مشاہیر کو شامل کیا گیا کیونکہ حسینؑ کسی فرقۂ خاص کے نہیں بلکہ تمام دنیا کے انسانوں کو حق و باطل میں تمیز کرنے کی راہ دکھاتے ہیں۔ بقول جوشؔ ؎ "ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ"

حال ہی میں سید العلماء مدظلہٗ نے اپنی اس مبسوط کتاب "شہیدِ انسانیت" کے متن پر نظرِ ثانی فرماکر اسے از سرِ نو مرتب فرمایا ہے اور اس عظیم کتاب کی اشاعت کے حقوق امامیہ مشن پاکستان ٹرسٹ لاہور کو عطا فرمائے ہیں۔ امام حسینؑ کی سیرت و سوانح کے موضوع پر اردو زبان میں کوئی ایسی جامع اور مستند کتاب موجود نہیں تھی تمام علم دوست افراد سرکار ممدوح کے سپاس گزار ہیں کہ انھوں نے اس کمی کو پورا کیا۔ فخر المتکلمین جناب مولانا سید محمد جعفر زیدی خطیب جامع شیعہ لاہور نے اس کتاب کا تعارف لکھا ہے جو شاملِ اشاعت ہے۔ اپنی اہمیت کے اعتبار سے شہیدِ انسانیت اس صدی کی عہد آفریں کتاب ہے۔ جس طرح نابغۂ روزگار صدیوں میں پیدا ہوتا ہے اس طرح عظیم کتابیں بھی روز روز منصۂ شہود پر جلوہ گر نہیں ہوتیں۔ ہم اس کتاب کو بڑے عجز کے ساتھ اپنائے قوم کے سامنے پیش کرتے ہوئے امید کرتے ہیں کہ اسے ہر لائبریری ہر اسکول اور ہر کالج نیز ہر مسلک کے سربراہ حضرات تک پہنچانے کی کوشش کی جائے گی۔

علی محتشم جعفری
مینجنگ ٹرسٹی امامیہ مشن لاہور

مندرجات

۱۔ تعارف	۷
۲۔ تمہید	۲۱
۳۔ نسبی خصوصیات، خاندان اور اس کے شاندار روایات	۳۳
۴۔ بنی ہاشم اور بنی امیہ	۴۵
۵۔ اسلام اور اس کا پیغام	۴۸
۶۔ اسلام کا مزاحم طاقتوں سے تصادم	۵۸
۷۔ حسینؑ بن علیؑ کی ولادت اور ابتدائی زندگی	۶۹
۸۔ امام حسینؑ کی زندگی کا دوسرا دور، ناناؐ کی وفات کے بعد سے باپ کی شہادت تک۔	۷۳
۹۔ بنی امیہ کا اقتدار اور ان کی سیاسی روش	۹۵
۱۰۔ پیغمبرِ خداؐ کے بعد اسلامی مفاد کے محافظین، ان میں اور مخالف قوتوں میں تصادم اور اسکے نتائج	۱۰۳
۱۱۔ حسن مجتبیٰؑ کی صلح اور اس کے نتائج	۱۰۷
۱۲۔ یزید کی ولیعہدی	۱۴۱
۱۳۔ معاویہ کی وفات اور یزید کی تخت نشینی	۱۵۳
۱۴۔ یزید تاریخ کی روشنی میں	۱۵۶
۱۵۔ امام حسینؑ کے بلند اخلاق و کمالات اور گراں قدر منقولات	۱۶۲
۱۶۔ یزید کا بیعت پر اصرار اور حسینؑ کا انکار	۱۸۴
۱۷۔ حسنؑ کی خاموشی اور حسینؑ کا اقدام	۱۹۴
۱۸۔ حسینی موقف کی تشریح	۲۰۰
۱۹۔ حرمِ رسولؐ سے سفر اور حرمِ خدا میں پناہ	۲۱۱
۲۰۔ دعوتِ اہلِ کوفہ اور سفارتِ مسلم بن عقیل	۲۱۸
۲۱۔ مکّے سے کربلا تک	۲۵۵
۲۲۔ یزیدی حکومت کی سرگرمی اور کربلا میں فوجوں کی آمد	۲۹۰
۲۳۔ انصارِ امام حسینؑ [illegible] کی قلّتِ تعداد اور [illegible] کے اسباب	۲۹۶

۲۴۔ صُلح کی باتیں ۳۰۰
۲۵۔ بندشِ آب اور غلبۂ تشنگی ۳۰۴
۲۶۔ صُلح کی آخری کوشش اور اس کا انجام ۳۰۹
۲۷۔ شبِ عاشور یعنی محرم کی دسویں رات ۳۱۵
۲۸۔ دسویں محرم ۶۱ھ، اتمامِ حجت اور آغازِ حرب ۳۲۰
۲۹۔ انصارِ امامؑ کے حالات اور حیرت انگیز قربانیاں ۳۴۱
۳۰۔ اقربائے امام، یعنی بنی ہاشم کی قربانیاں ۴۱۸
۳۱۔ جہادِ آخر اور شہادت ۴۳۹
۳۲۔ شہادت کے بعد ۴۴۵
۳۳۔ اسیریٔ اہلِ حرم کے واقعات پر ایک جامع تبصرہ ۴۶۵
۳۴۔ اسیرائے اہلِ بیت کے مختصر حالات ۴۷۱
۳۵۔ گزشتہ واقعات کی روشنی میں حسینی شخصیت اور کارنامۂ حسینی پر تبصرہ ۴۸۶
۳۶۔ فتح کس کی ہوئی؟ ۴۹۳
۳۷۔ مجرموں کی پریشانی ۴۹۸
۳۸۔ عالمِ اسلامی کے تاثرات ۵۰۶
۳۹۔ آثارِ انقلاب، واقعۂ حرہ، خلافتِ ابن زبیر، اضطرابِ عراق و ایران اور دیگر جزئی واقعات ۵۱۰
۴۰۔ جماعتِ توابین ۵۲۴
۴۱۔ خونِ ناحق کا انتقام ۵۳۰
۴۲۔ اموی حکومت کا انجام ۵۴۱
۴۳۔ بنی عباس کی سلطنت ۵۴۳
۴۴۔ تبدیلِ ذہنیت ۵۴۶
۴۵۔ اخلاقی نتائج ۵۴۹
خاتمۂ کتاب: عالمِ انسانی کو اصلاحِ عمل اور اتباعِ اسوۂ حسینی کی دعوت ۵۹۹

تعارف

تعارف کرایا جاتا ہے اس شے کا جو خود تو ہو غیر معروف اور تعارف کرانے والا ہو اپنی جگہ معروف و مشہور، لیکن یہاں صورت حال ہے برعکس۔ دنیائے شیعیت میں کون ایسا شخص ہوگا جو جناب سید العلماء السید علی نقی النقوی دامت مکارمہٗ اور ان کے کمالِ علم و فضل سے یا ان کے مصنفات کی جلالتِ قدر سے ناآشنا ہو لیکن چونکہ عالمِ اسباب میں عظیم تر ہستیوں کی پشت پر بھی تصدیق و تائید کرنے والے مناسب حضرات رکھے گئے ہیں جیسے جناب موسیٰ علیہ السّلام کی تصدیق کے لیے ہارون علیہ السلام اور حضرت سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تصدیق و تائید کے لیے حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام، اسی طرح میں بھی کتاب "شہیدِ انسانیت" کے تعارف کے لیے قلم اٹھا رہا ہوں۔

میں ہمیشہ سے یہ سمجھتا رہا ہوں کہ جناب سید العلماء دام مجدہٗ علم و فضل کے بلند ترین مقام پر ہیں اور تقریباً ہر علمی شعبہ میں خداداد کمال اور ذوقِ بے مثال رکھتے ہیں اس اعتبار سے وہ مجتہد العصری نہیں بلکہ وحیدِ عصر اور نادرۂ روزگار، اور حقیقتاً سید العلماء ہیں۔ چونکہ ہر کلام اپنے متکلم کے صفات و کمالات کا آئینہ دار ہوتا ہے لہٰذا سید العلماء کا ہر کلام سید الکلام اور ان کی ہر کتاب کتابوں کی سید و سردار ہے۔ کتاب شہیدِ انسانیت بھی جناب موصوف کی نگارشِ قلم ہے۔ ابتداءً مسودۂ کتاب میں کچھ نامانوس اور غیر مشہور چیزیں آ گئی تھیں لیکن موجودہ طباعت میں جناب موصوف نے نظرِ ثانی فرما کر ہر امر کا لحاظ فرماتے ہوئے ہر مضمون کو مطبوع اور مانوس حیثیت میں پیش کیا ہے۔ میں نے کتاب پیشِ نظر کو اول سے آخر تک دیکھا ہے۔ صرف کتابت کے اغلاط کو درست کیا گیا ہے۔ یہ کتاب یقیناً ہر قوم و ملت کے لیے مفید ہے کیونکہ جناب موصوف نے یہ کتاب ایسی نرم اور ہموار سطح پر

تحریر فرمائی ہے جو ہر مذہب و ملت کے لیے لائق قبول ہو۔ ہوسکتا ہے کہ جناب مسلم بن عقیل علیہ السلام کی آخری جنگ والا حصہ کسی اور صاحبِ قلم کا ہو کیونکہ آپ کا وہ شاہکارِ شجاعت جو کُتبِ تاریخ میں پایا جاتا ہے پورے طور پر نمایاں نہیں ہوا۔

مسئلۂ بیعت جو واقعۂ کربلا کی اصل بنیاد ہے اگرچہ جناب موصوف نے اس کو انتہائی لطافت سے پیش کیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ کتاب کو ہموار اور معتدل رکھنے کے سبب سے پوری توضیح نہیں ہوسکتی تھی۔ اس لیے اس مسئلہ کی مختصراً توضیح کی جاتی ہے۔

یہ تو دنیا جانتی ہے کہ امام حسین علیہ السلام اور ان کے اقربا و انصار نہ کسی قتل کے قصاص میں قتل کیے گئے نہ کسی اور جرم کی پاداش میں۔ وہ قتل کیے گئے صرف اس بنا پر کہ انھوں نے بیعتِ یزید نہیں کی۔ لیکن یہ کہ امامؑ نے بیعتِ یزید کیوں نہ کی، انکارِ بیعت کا سبب کیا تھا اور وہ کیا چیز تھی کہ بیعتِ یزید کے مقابلہ میں امامؑ کو اپنا بھرا گھر لٹا دینا اور ہرا بھرا باغ کٹوا دینا آسان نظر آیا۔ کیا امامؑ کو یہ توقع تھی کہ اس عظیم قربانی کے بعد خلافت اپنے صحیح اصول پر آجائے گی، یزید اور یزیدیت کا خاتمہ ہو جائے گا، حق مانا جائے گا اور باطل مٹ جائے گا، ظلم و جور کی حکمرانی نیست و نابُود ہو جائے گی۔ امتِ مسلمین حق سے وابستہ اور باطل سے کنارہ کش ہو جائے گی اور ان کی سوئی ہوئی دنیا جاگ جائے گی۔ آلِ محمدؐ اور ان کے متبعین پر جو ظلم و ستم ہو رہا ہے اس کا سلسلہ ختم ہو جائے گا اور میرے بعد میرا خاندان اپنے متبعین کے ساتھ آرام اور عافیت کی زندگی بسر کرے گا۔ بدعتیں ختم ہو جائیں گی اور شریعتِ حقہ کا ہر طرف سے خیر مقدم ہوگا۔ اگر ان باتوں میں سے کوئی بات ہوگئی ہوتی تو ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہو سکتے تھے کہ امامؑ نے ان اغراض و مقاصد کو سامنے رکھ کر بیعت نہ کی اور اس عظیم قربانی کو قبول کیا۔ زورِ شاعری اور زورِ تقریر چاہے کسی سے یہ نتائج بیان کرائے اور نمائشی طور پر اس شہادت کے نتیجہ میں یہ سبز باغ دکھا دے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہی خلافت کا رنگ رہا، وہی ظلم و جور رہا، وہی باطل پسندی اور حق سے دوری رہی۔ وہی

خاندانِ رسالت اور ان کے متبعین پر ظلم و تشدد رہا مسلمانوں کی دنیا میں کونسی برائی تھی جو مٹ گئی ہو اور کونسی بھلائی تھی جو پلٹ آئی ہو۔ یزید کے بعد مروان اور مروان صفت خلیفہ ہوتے رہے۔ کیا وہ یزید سے کچھ کم تھے؟ ائمۂ اہل بیتؑ کی انتہائی خاموش اور صابرانہ زندگی کے باوجود ان پر کیا کیا ظلم و ستم نہ ہوئے۔ سادات اور ان کے متوسلین کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تہِ تیغ کیا جاتا رہا۔ زندہ، دیواروں میں چُنا جاتا رہا۔ ان کے خون سے گارے بنائے گئے۔ مرقدِ حسینؑ کو بے نشان کرنے کے لیے پانی چھوڑا گیا۔ ہل چلائے گئے۔ روضۂ حسینی میں کتنی بار آگ لگائی گئی اور اس کو تباہ کیا گیا۔ علی مرتضیٰؑ پر کب تک سب و شتم ہوتا رہا اور گانے والیوں سے ان کی ہجو گوائی گئی۔ کیا دنیا کے ظلم و جور، قہر و استبداد کا رنگ کچھ بدلا؟ نہیں۔ دنیا جُوں کی تُوں رہی بلکہ بد سے بدتر ہوگئی۔ پھر یہ کیسے کہا جائے کہ ان مقاصد کے لیے امام نے بیعت کرنا نامنظور اور شہادت کو منظور کیا۔ انکارِ بیعت کا سبب تو کچھ اور ہی تھا۔

یہ لفظ بھی زبان زدِ خاص و عام ہے کہ امامؑ نے بیعتِ یزید سے اس لیے انکار کیا کہ وہ شراب خوار تھا، زانی تھا، ظالم تھا، فاسق و فاجر تھا۔ یہ نظریہ بظاہر خوش آیند ہے۔ جو اٹھتا ہے اسی پر اپنے خیالات کی عمارت بناتا چلا جاتا ہے لیکن حقیقت سے کوسوں دُور ہے یہ نظریہ۔ ابتدا میں کچھ سوچ سمجھ کر پھیلایا گیا ہوگا جس کی اب ہر شخص بغیر سوچے سمجھے رٹ لگا رہا ہے۔ اس طریقہ سے اصل میں یہ تاثر بہم پہنچانا تھا کہ یزید وہ پہلا دعویدارِ خلافت تھا جو فاسق و فاجر تھا۔ اس سے پہلے فضا ٹھیک تھی اس لیے امام حسینؑ اور ان کے خاندان کی طرف سے یہ انکارِ بیعت کا پہلا واقعہ ہے۔

ایسا کہنے والوں سے اگر یہ پوچھا جائے کہ اچھا اگر یزید شراب خوار، زانی اور فاسق نہ ہوتا تو کیا امام اس کی بیعت کر لیتے؟ بے خبر دنیا تو شاید کہہ دے کہ کر لیتے لیکن باخبر فوراً چونک کر بولے گا کہ ہرگز نہیں۔ پھر ہرگز نہیں تو انکارِ بیعت کا سبب یہ فسق و فجور کہاں رہا؟ یہ بات تو بالکل ختم ہی ہوگئی اور امامؑ کا انکارِ بیعت تو کسی اور ہی سبب سے ہوا جس کو ہم آئندہ بیان

کریں گے۔ یہاں یہ بات بھی لائقِ توجہ ہے کہ یزید کی مبینہ بدکرداری اس کے باپ کی زندگی ہی میں تھی یا بعد میں رونما ہوئی؟ یاد رکھیے کہ امام نے حضرت معاویہ کی زندگی ہی میں خلافتِ یزید کی قرارداد سے انکار کیا تھا۔ اس کے بعد مدینہ میں حضرت معاویہ کی خبرِ وفات اور امامؑ سے بیعتِ یزید کی طلب یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ پہنچی تھیں لہٰذا امامؑ اور دوسروں کی نظر میں یزید کی وہی زندگی تھی جو اس کے باپ کے سامنے تھی۔ وہ جیسا بھی تھا اپنے باپ کی زندگی ہی میں تھا۔ پھر ایسے فاسق و فاجر کو خلافت کے لیے نامزد کرنا اس کا الزام نامزد کرنے والے پر آئے گا یا نامزد ہونے والے پر؟ یزید خود سے تو خلیفہ نہیں بنا، اس کو تو خلیفہ بنایا گیا۔ اب فسق و فجور کے توازن میں کس کا پلہ بھاری رہتا ہے۔ پھر یہ بھی سوچنا پڑے گا کہ وہ کون سے ایسے سنگین گناہ تھے جن کے لیے یزید کو منفرد اور پہلا شخص کہا جا سکے اور یہ سمجھا جا سکے کہ ایسے سنگین گناہ یزید سے پہلے نہ تھے۔ بیشک شرابخواری اور زناکاری سنگین اور گناہ کبیرہ ہیں لیکن ان گناہوں کا تعلق گنہگار کی ذات سے ہے۔ ان گناہوں کے مقابلہ میں مومنین کا دیدہ و دانستہ قتلِ ناحق وہ سنگین ترین گناہ ہے جس پر قرآن کریم کے کھلے الفاظ میں وعیدِ جہنم ہے۔ مومن کے قتلِ عمد کے سامنے شراب نوشی اور زناء کیا چیز ہے؟ اور یہ قتلِ مومن کی جزاء کا جہنم ہونا اس وقت ہی ہے جبکہ یہ مقتول مومن عام مومنین میں سے ہو اور یہ قتل صرف ایک مومن کا ہو تب اس جرم کی سزا جہنم سے کم نہیں اور اگر وہ مقتول صرف مومن ہی نہ ہو بلکہ متقی، متہجد، فقیہہ، عارف اور صحابئ رسولؐ بھی ہو تو اس جرم کی سنگینی کتنی بڑھ جائے گی اور ایسا مقتول اگر محض ایک ہی نہ ہو بلکہ بہت سے ہوں تو یہ جرم کہاں سے کہاں پہنچے گا؟ اور ایسے متواتر جرم کے مقابلہ میں شراب نوشی اور عیاشی کیا چیز رہ جائے گی۔ میں یہاں جنگِ صفین کا کوئی ذکر نہیں کر رہا ہوں بلکہ امام حسن علیہ السلام اور مالک اشتر ایسے حضرات کو زہر دلانے کا بھی ذکر مقصود نہیں ہے کیونکہ اس پہ کچھ نہ کچھ پردہ ضرور ہے۔ یہ خدا ہی جانتا ہے کہ معاویہ نے کتنے بے خطا اور ایماندار حضرات کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تمام واقعاتِ مذکورہ

تاریخ سے قطع نظر کر کے اگر صرف حجر بن عدی اور ان کے ساتھیوں کے قتلِ ناحق پر ہی نظر کی جائے جو مرج عذرا میں تہ تیغ کیے گئے، اور ان چھ حضرات کو ایک ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور ساتویں شخص عبدالرحمٰن بن حسان نامی کو حضرت معاویہ کی ہدایت کے مطابق زیاد نے زندہ زمین میں دفن کرا دیا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے قتل سے اُم المومنین حضرت عائشہ اور امام حسین علیہ السلام نہایت دردناک، ملول اور شاکی ہوئے۔ حضرت اُم المومنین عائشہ نے ان لوگوں کو علمی طاقت اور فقہی قابلیت کے اعتبار سے عرب کا سر اور دماغ فرمایا۔ جن کے قتل سے باز رکھنے کے لیے حضرت عائشہ نے عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام کو حضرت معاویہ کے پاس بھیجا اور کہلایا کہ معاویہ تم حجرؓ اور ان کے اصحاب کے بارہ میں خدا سے ڈرنا لیکن ام المومنین کے قاصد مذکور کے وہاں پہنچنے سے پہلے یہ کامل الایمان حضرات قتل کیے جا چکے تھے۔ ان بے خطا لوگوں کے قتل کی خبر سنکر حضرت عبداللہ بن عمر چیخیں مار مار کر رونے لگے اور ربیع بن زیاد حارثی حاکمِ خراسان نے دردمند ہو کر جمعہ کے دن اس امر کی دعا کی کہ خداوندا اب جلد ربیع کی یعنی میری روح کو بھی قبض کر لے اور مجمع سے خواہش کی کہ وہ آمین کہے۔ چنانچہ وہ مسجد سے نکلتے ہی گر کر مر گئے۔ اس پر مستزاد یہ کہ صحابئ رسولؐ عمر بن حمق الخزاعی جنکو پیغمبرؐ نے سلام کہلایا تھا اور جو بقول امام حسینؑ ایسے صالح اور عبادت گزار تھے کہ کثرتِ عبادت سے ان کا جسم گھُل گیا تھا، بدن ڈھل گیا تھا، چہرہ پہ زردی چھا گئی تھی، ان کی گرفتاری کا حکم ہوا اور حضرت معاویہ کی خصوصی ہدایت کے مطابق ان پہ نیزہ کے نو وار کیے گئے حالانکہ وہ پہلے یا دوسرے ہی زخم میں دنیا سے رخصت ہو چکے تھے یعنی ان کی شہادت کے بعد بھی کم از کم سات مرتبہ نیزہ مارا گیا۔

یہ اقدام بھی حضرت معاویہ کا کس قدر خلافِ شریعت اور مخالفِ ارشادِ نبویؐ تھا کہ انھوں نے محض اس بنا پر کہ ان کے باپ ابوسفیان نے مادرِ زیاد سے زنا کیا تھا زیاد کو اپنا بھائی اور ابنِ ابی سفیان قرار دے دیا۔

امیرِ شام کے یہاں گانے والوں کی قدر و منزلت ہوتی تھی اور وہ سرور و نشاط میں بھر کر تھرکنے لگتے تھے۔

مقدام بن معدی کرب نے خود حضرت معاویہ سے کہا کہ میں تمھارے یہاں سونے کا پہننا، درندہ جانوروں کی کھال پر بیٹھنا، پائخانوں کا رُخ قبلہ کی طرف ہونا یہ سب دیکھ رہا ہوں جو حرام اور خلافِ شریعت ہے۔ امیرِ شام مذکور نے عرفہ کے روز حج میں تلبیہ (لبیک کہنا) ممنوع قرار دے دیا۔ مدینہ میں نمازِ عشا پڑھائی تو نہ بسم اللہ پڑھی نہ بعض تکبیریں کہیں اور اہلِ مدینہ کے ٹوکنے پر بھی کوئی اعتنا نہ کی۔ یہ تمام چیزیں اسی کتاب "شہیدِ انسانیت" کے صفحہ ۱۲۴ تا ۱۳۵ میں پڑھ لیں۔ ان تمام چیزوں سے زیادہ یزید کا اس کی تخت نشینی کے وقت وہ کون سا فسق و فجور تھا جس کی وجہ سے فسق و فجور میں اس کو منفرد اور بے مثال کہا جا سکے۔ امامؑ سے طلبِ بیعت کے وقت نہ اس کے دامن پر قتلِ اہلِ بیتؑ کا دھبہ تھا نہ کعبہ کی بے حرمتی کا، نہ اہلِ مدینہ کی غارت گری کا۔ بیعتِ یزید سے امامؑ اور ان کے خاندان کا انکار کوئی پہلی اور نئی بات نہ تھی۔ کیا امام حسنؑ اور امام حسینؑ نے حضرت معاویہ کو حقدارِ خلافت تسلیم کر لیا تھا؟ کیا امام حسنؑ نے ان کو صحیح حقدارِ خلافت مان کر حکومت ان کے سپرد کی تھی؟ ہرگز نہیں۔ اس صلح میں یہ قرارداد بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ معاویہ کو اپنے بعد کسی کو خلافت کے لیے نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا بلکہ بعض جگہ تو یہ بھی مذکور ہے کہ خلافت بعدِ معاویہ پھر حسنؑ کی طرف منتقل ہوگی اور یہ امر اس بات سے بالکل ثابت ہو جاتا ہے کہ حضرت معاویہ نے امام حسینؑ کے وجود کو نہیں بلکہ امام حسنؑ کے وجود کو یزید کی ولیعہدی کے لیے سنگِ راہ سمجھا اور جب تک امام حسن علیہ السلام کو زہر دلا کر شہید نہ کر دیا اس وقت تک یزید کی ولیعہدی کو زبان سے نہ نکالا۔ عزت و وقار کے اعتبار سے امام حسنؑ اور امام حسینؑ دونوں بھائی ایک جیسے تھے۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ جب تک امام حسنؑ زندہ رہے یزید کی ولیعہدی کا اظہار نہ

کیا گیا اور شہادتِ حسنؑ کے بعد حسینؑ کی موجودگی میں یزید کی ولیعہدی کا چھپا ہوا منصوبہ کھل کر سامنے آ گیا۔ اگر محض امام حسنؑ کا وقار مانع تھا تو وہی وقار امام حسینؑ کا تھا۔ صرف امام حسنؑ کو زہر دلانا اور اس کے بعد دس برس تک امام حسینؑ کو چھوڑے رکھنا اور ان کے خلاف ایسا کوئی حربہ نہ استعمال کرنا جس سے ان کی شمعِ حیات گُل ہو جائے اسکی کوئی نہ کوئی وجہ ہے اور وجہ یہی ہے کہ صلحنامہ میں امام حسنؑ کے نام کی تخصیص سے یہ بات آ چکی تھی کہ معاویہ کے بعد خلافت پھر امام حسنؑ کی طرف منتقل ہوگی۔ اس شرط نے یہ مسئلہ صاف کر دیا کہ امام حسنؑ نے صرف عارضی طور پر نظامِ حکومت حضرت معاویہ کے سپرد کر دیا تھا۔ وہ مستقل خلیفہ قرار نہیں دیے گئے کیونکہ سنی، شیعہ دونوں نقطۂ نظر اس پر متفق ہیں کہ ہر خلیفہ کو حق ہے کہ وہ اپنے بعد کے لیے خلیفہ معیّن کرے اور خلیفۂ مابعد کی تصریح کرے۔ جیسا کہ حضرت ابوبکر نے حضرت عمر کو معیّن کیا اور حضرت عمر نے خلافت کو چھ نامزد افراد میں منحصر کیا۔ نامزدگی دونوں حضرات نے کی اور وہ عموماً تسلیم کی گئی۔ حضرت علی مرتضیٰؑ نے اپنے بعد کے لیے امام حسنؑ کو نامزد فرمایا اور ہر امام آخر تک اسی طرح اپنے بعد کے لیے نامزد کرتا رہا۔ جبکہ دونوں مذہب میں ہر خلیفہ کا حقِ استخلاف موجود ہے مگر غیر خلیفہ کو نہیں تو اس کے معنٰی یہ ہوئے کہ خلیفہ ہے تو اسکو حقِ استخلاف بھی ہے اور جس کو حقِ استخلاف نہیں تو وہ خلیفہ بھی نہیں، لہٰذا یہ شرط کہ معاویہ کو حقِ استخلاف نہ ہوگا رکھی ہی اس لیے گئی تھی کہ دنیا ان کو خلیفہ نہ سمجھ بیٹھے۔ اگر ان کو خلیفہ مان کر حکومت دی گئی ہوتی تو ان کو استخلاف کے لیے بے بس کیوں کیا جاتا؟ جبکہ سنی شیعہ کسی کے یہاں بھی کوئی خلیفہ حقِ استخلاف سے محروم نہیں۔ مجھے تعجب ہے کہ عموماً اہلِ نظر نے بھی اس شرط اور اس معاہدہ کی افادیت پر نظر نہیں کی۔

جب یہ بات ثابت ہے کہ امام حسنؑ و امام حسینؑ اور ان کے خاندان اور متبعین نے خلافت حضرت معاویہ ہی کو تسلیم نہیں کیا (جیسا کہ اروی بنتِ عبدالمطلب کی اس گفتگو سے

ثابت ہے جو حضرت معاویہ سے ہوئی اور کتاب حاضر میں کسی جگہ مذکور بھی ہے تو انکار بیعتِ یزید اس گھرانے کی طرف سے کوئی پہلی مثال ہرگز نہ تھی۔ حق تو یہ ہے کہ علی مرتضیٰ سے لے کر گیارھویں امام تک ہر امام کا مستقل یہ شعار رہا کہ اپنے اپنے عہد کے حکمران کی حکمرانی کو ضرور برداشت کرتے رہے اور کسی امام نے بھی اپنے حقِ حکومت کو حاصل کرنے کے لیے اگرچہ قتال و جدال نہیں کیا لیکن ان میں سے ایک امام نے بھی کسی کا استحقاقاً خلیفہ ہونا تسلیم نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ تیسری خلافت کے انعقاد کے وقت علی مرتضیٰؑ نے کسی بھی حکمران کے اتباع کی شرط کو مان کر اپنا خلیفہ ہونا پسند نہ کیا اور یہی وجہ ہے کہ علی مرتضیٰؑ سے لے کر گیارھویں امام تک ایک امام بھی کسی عہدِ حکومت میں کسی عہدۂ حکومت پر نہ آیا اور نہ لایا جا سکا۔ نہ کسی جہاد اور مہم میں شریک ہو سکا۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ یا تو امام حسنؑ اپنے باپ کے بعد تھے امیر المومنین اور خلیفۂ راشد یا صلح کے بعد اپنی دس سالہ زندگی میں صرف مدینہ کے بھی حاکم نہ رہے۔ امام حسینؑ عہدِ حکومتِ معاویہ میں بیس برس مدینہ میں رہے مگر ایک دن کے لیے بھی صرف مدینہ کے بھی حاکم نہ رہے بلکہ امامین کی موجودگی میں دوسرے ہی لوگ مدینہ کے حاکم ہوتے رہے جن کو حسنؑ و حسینؑ سے کسی طرح کوئی نسبت ہی نہیں۔ آخر ہر امام کا حکومت اور حکومت کی ہر مہم سے دور رہنا، ہر حکومت کی ان پر کڑی نگاہیں کسی کے لیے قتل اور کسی کے لیے قید و بند یہ کیوں ہوتا؟ اگر وہ اپنے اپنے عہد کی حکومتوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوتے اور حکومتیں یہ سمجھتیں کہ یہ لوگ ہم کو خلیفہ بحق تسلیم کرتے ہیں۔ انکارِ بیعتِ خلیفہ حسینؑ کے گھرانے میں شروع سے آخر تک رہا اسلیے حسینؑ وہ پہلے شخص نہیں جس نے انکارِ بیعت کیا ہو خود اسی کتاب میں کسی جگہ اسکا ذکر آیا ہے کہ ابنِ زیاد کی تحریر پر ابنِ سعد نے یہ کہا کہ حسینؑ ہرگز بیعت نہ کریں گے۔ ان کے سینہ میں ان کے باپ (علیؑ) کا دل ہے۔ ابن سعد کا یہ جملہ صاف ترجمانی کر رہا ہے کہ کسی تشدد سے متاثر ہو کر علیؑ نے بیعت نہ کی تو حسینؑ ان ہی کے بیٹے ہیں اور ان کے سینہ میں علیؑ ہی کا دل ہے۔ خلافت کے ابتدائی مرحلہ میں علیؑ سے بیعت لینے کے لیے ضرور ایک بار تشدد کو آزمایا گیا تھا

لیکن متعلق حضرات نے محسوس کر لیا کہ یہ تشدد کارگر نہیں ہو سکتا بلکہ خطرناک اور مضر ہوگا خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد یزید سے پہلے تک ہر خلیفہ اس ہی نظریہ پر رہا کہ افرادِ اہل بیتؑ جب ہماری خلافت کی بنا پر ہم سے جنگ آزما نہیں تو ہم ان کے ترکِ بیعت پر ان سے کیوں جنگ کریں۔ یزید پر جوانی اور حکومت کا نشہ سوار تھا۔ اس کو آلِ محمدؐ کی قوتِ آزادی کا صحیح اندازہ نہ تھا اس نے تشدد کی انتہا کر دی مگر امام تو امام اس گھر کا کوئی بچہ، بڑا، غلام، کنیز، فدائی، شیدائی کسی کو بھی اس کے مقامِ عزم سے نہ ہلایا جا سکا لہٰذا حسینؑ کا طرزِ عمل کوئی نیا طرزِ عمل نہ تھا البتہ جو طرزِ عمل حسینؑ کے ساتھ اختیار کیا گیا وہ ضرور نیا تھا۔

اب ہم انکارِ بیعت کے سبب پر روشنی ڈالتے ہیں:۔

بات یہ ہے کہ تمام کائناتِ عالم کا خالق صرف ایک ہے جس کا کوئی دوسرا نہیں ع
"جو تیرے سوا ہے وہ ترا بندہ ہے"۔ جب تمام مخلوق کا خالق صرف ایک ہے تو اس مخلوق پر اطاعت بھی صرف اس ایک ہی ذات کی ہے دوسرے کی نہیں۔ چاہے وہ دوسرا شان و شوکت، عزت و طاقت کے اعتبار سے کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو کیونکہ وہ بھی مخلوق ہونے میں اس ہی مخلوق کی مثل ہے۔ الا لہ الخلق والامر۔ خالق بھی صرف وہی ہے اور آمر و حاکم بھی صرف وہی البتہ اگر وہ خالق ہی کسی کی اطاعت کا حکم دے دے تو یہ اطاعت کسی کی وجاہت کی بنا پر نہ ہوگی بلکہ حکمِ خدا کی اطاعت اور صرف خدا کی اطاعت ہوگی اور اگر اُس کے حکم کے باوجود اطاعت نہ ہوگی تو یہ اسکی نافرمانی نہ ہوگی جسکی اطاعت کا حکم خدا نے دیا تھا بلکہ حکمِ خدا کی مخالفت اور خدا کی نافرمانی ہوگی۔ اللہ نے ایمان والوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اللہ اور رسول اور اولی الامر کی اطاعت کریں۔ یا ایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم۔ بعض حضرات کم علمی کی وجہ سے لفظ منکم کو لفظ اولی الامر سے متصل دیکھ کر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ منکم صرف اولی الامر کے لیے کہا گیا ہے حالانکہ یہ غلط ہے۔ لفظ منکم رسول اور اولی الامر دونوں کے لیے کہا گیا ہے۔ بلکہ اگر پہلا جملہ اطیعوا اللہ الگ نہ کر دیا گیا ہوتا اور ایک ہی جملہ قرار دے کر یہ کہا جاتا

اطیعوا اللہ والرسول واولی الامر منکم تو لفظ منکم اللہ، رسول، اولی الامر سب
کے لیے ہوجاتا اور ترجمہ یہ ہوتا کہ ایمان والو، تمھاری ہی جنس سے جو اللہ، رسول، اولی الامر ہیں
ان کی اطاعت کرو۔ ظاہر ہے کہ اللہ ہماری جنس سے نہیں اس لیے جملۂ اطیعوا اللہ کو الگ رکھا
تاکہ لفظ منکم اللہ کے بارہ میں نہ رہے۔ رسول اور اولی الامر چونکہ ہماری جنس سے ہیں اس
لیے ان کو منکم کہا اور کہا اس لیے کہ رُسُل اور اولی الامر ملائکہ میں سے بھی ہیں جیسے کہ فرمایا
گیا انّہٗ لقولُ رسولٍ کریم یا جیسے فرشتہ نے حضرت مریمؑ سے کہا انا رسول ربّکِ
یا جیسے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ کی طرف آنے والے فرشتوں کے لیے کہا گیا جاءت رُسُلنا
پھر ملائکہ ہی کے بارہ میں فرمایا تنزّل الملائکۃ والرّوح فیھا باذن ربّھم من
کلّ امر فالمدبّراتِ امرا (قرآن کریم) یہ رُسُل اور اولی الامر جو ملائکہ ہیں ہماری
جنس سے نہیں، نہ ہم پر ان کی اطاعت ہے۔ لہٰذا آیۂ اطیعوا الرسول واولی الامر منکم
میں منکم قید احترازی ہے کہ تم پر اطاعت اُن رُسُل اور اولی الامر کی نہیں جو تمھاری
جنس سے نہیں ہیں بلکہ اُس رسول اور اُن اولی الامر کی ہے جو تمھاری جنس سے ہیں۔
رسول اور اولی الامر دونوں کی اطاعت کا حکم ایک جملہ میں ایک ہی شان سے دیا گیا ہے۔
حکمِ اطاعت میں نہ کسی حکم کی قید نہ کسی حکم کا استثناء۔ ہر حکم کی اطاعت ہر مومن پر فرض کی
گئی جس سے ثابت ہے کہ رسول اور اولی الامر کا ہر حکم مطابق مشیتِ الٰہی ہے۔ کوئی حکم
منشائے الٰہی کے مخالف نہیں ہوسکتا۔ پس وہ سب معصوم عن الخطاء ہوئے جس طرح رسول
نہ کوئی خود سے ہوسکتا ہے نہ غیر خدا کے بنائے بن سکتا ہے اسی طرح اولی الامر کا تعین
بھی منجانب اللہ ہے۔ اسی لیے ان کی اطاعت بھی ہر امر میں بامر اللہ ہے۔ بلکہ لفظ منکم
کی قید احترازی نے یہ بات اچھی طرح واضح کردی کہ جو رُسل اور اولی الامر تمھاری جنس
سے نہیں ہیں اگرچہ وہ سب اللہ ہی کے منتخب کیے ہوئے ہیں لیکن اس کے باوجود تم پر
ان کی اطاعت نہیں، تو پھر جس رسول اور جن اولی الامر کو تم نے معیّن کیا ہو ان کی اطاعت

تم پر کیسے فرض ہوسکتی ہے۔ مختصر یہ کہ انسان پر صرف اللہ، رسول اور اولی الامر کی اطاعت فرض
ہے جو مطلق اور بغیر کسی قید کے ہے مگر اس اطاعت کے لیے جبر و اکراہ نہیں
ہے جس کا دل چاہے اطاعت کرے نہ چاہے نہ کرے مگر دنیا میں جہاں اطاعت کی بہترین مثالیں ہیں وہاں
ترکِ اطاعت کی آخری مثالیں ہیں۔ حد ہے کہ خدائے حقیقی کے مقابلہ میں خدا بن گئے یا بنا لیے
گئے۔ رسول کے مقابلہ میں رسول اور اولی الامر کے مقابلہ میں اولی الامر ہوئے۔ خدائے
حقیقی نے تو اپنی، اپنے رسول اور اولی الامر کی اطاعت کے لیے کوئی جبر و اکراہ
روا نہ رکھا تھا لیکن مقابلہ والوں نے جبر و تشدد سے مطیع بنانا چاہا۔ یہیں سے حق و
باطل کا فرق نمایاں ہوجاتا ہے۔ حق اپنے منوانے کے لیے کبھی تشدد نہیں کرتا کیونکہ
حق اپنے نہ مانے جانے پر بھی حق ہی رہے گا مگر باطل اگر تشدد سے کام نہ لے
تو وہ مانا کیسے جائے؟ اور نہ مانا جائے تو رہے کیا؟ یہی وجہ ہے کہ خدا، رسول
اور اولی الامر اپنے منوانے کے لیے کبھی نبرد آزما نہیں ہوئے۔ خدائی کا دعویٰ
ہو یا نبوّت و امامت کا، اگر محض دعویٰ کی حد میں رہے تو ان میں سے کسی کو بھی حرب و
قتال کی ضرورت نہیں۔ اپنی جگہ جس کا جو دل چاہے کہتا رہے یہ سب برداشت کیا
جاسکتا ہے اور برداشت کیا گیا ہے لیکن اگر خدائی کا مدعی چاہے کہ خود خدا بھی اسکو
خدا مان لے، رسالت کا مدعی اگر چاہے کہ رسولِ برحق بھی اپنی رسالت کو خیرباد کہہ کر
اس کو رسول مان لے، ولایت و امارت کے مدعی اگر یہ چاہیں کہ اولی الامر بھی ان
کو اولی الامر تسلیم کریں تو یہ ہر ایک کے لیے ناقابلِ برداشت، ناممکن اور محال ہے۔
اگر خدا نے غیر خدا کو خدا مان لیا تو یہ بات تو بعد کی ہے کہ وہ مانا ہوا خدا حقیقتاً خدا
ہوگیا یا نہ ہوا لیکن خدا تو خدا نہ رہا۔ رسول نے اگر غیر رسول کو رسول مان لیا تو رسول،
رسول نہ رہا۔ اگر حقیقی ولی امر نے کسی غیر کو ولی امر مان لیا تو ولی الامر تو ولی الامر
نہ رہا۔ اب رسول کے رسول نہ رہنے سے اور ولی الامر کے ولی الامر نہ رہنے سے

صرف ان ہی کے منصب کو زوال نہ ہوگا بلکہ جس خدا نے ان کو اپنے کمالِ علم اور انتہائے اعتماد سے منتخب کیا تھا وہ جاہل اور بے بس ثابت ہوا۔ پھر اس کا خدا ہونا کیسا؟ جس خدا کا نمائندہ اپنے خدا سے ٹوٹ کر باطل سے مل گیا اور جس خدا کو اپنے علم اور انتخاب پر ناز تھا وہ منہ دیکھتا رہ گیا تو اب کیسا خدا، کیسا رسول، کیسے اولی الامرؑ کہاں کی کتاب، کہاں کا دین؟ یہ سب ملیامیٹ ہوگیا۔ خدا کے مقابلہ میں کوئی خدا بن جائے تو خدا کی شان میں کوئی نقص نہیں آتا۔ رسول اور اولی الامر کے مقابلہ میں اگر دوسرے مدعی آجائیں تو رسالت اور امامت کے دامن پر اس سے کوئی دھبہ نہیں آتا۔ دھبہ اس وقت آئے گا جب کوئی بھی ان میں سے غیر خدا کو خدا یا غیر رسول کو رسول یا غیر اولی الامر کو اولی الامر مان لے اور یہ دھبہ جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا ہے صرف ماننے والے پر ہی نہ آئے گا بلکہ اس زنجیر کی ہر کڑی اور اس رشتہ کا ہر دانہ ایک دم ٹوٹ جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر امام نے اپنے مقابلہ کی ہر صورت حال کو برداشت کیا اور اپنی امامت کو منوانے کے لیے اظہارِ حق سے آگے قدم نہ اٹھایا۔ اور خود سے کوئی تشدد کی راہ اختیار نہ کی۔ کیونکہ بندوں کو ان کی اطاعت کا حکم تھا۔ خود ان حضرات کو یہ حکم نہ تھا کہ بندوں کو اپنا مطیع بناؤ۔ ان کا فرض یہی تھا کہ وہ اپنا اولی الامر ہونا اور مقابل کا نہ ہونا ظاہر اور ثابت کرتے رہیں۔ اس کے بعد اطاعت کرنا، نہ کرنا یہ دوسروں کا کام تھا۔ لیکن رسول اور اولی الامر یہ ان کے لیے ناممکن اور محال تھا کہ وہ کسی بھی تشدد سے متاثر ہوکر اپنے خدا اور رسول کو جھٹلا کر اپنے منصب کے منکر اور غیر کے منصب دار ہونے کے مُقِر ہوجائیں۔ جس کے نتیجہ میں نہ خدا خدا رہے نہ رسول رسول رہیں اور خاتمہ ہوجائے دین، ایمان، کتاب ہر شے کا۔

بیعت تو بڑی چیز ہے، صاحب الامر تو غیر کی اقتدار میں نماز بھی نہیں پڑھ سکتا۔ کیونکہ اس غیر پہ اس نماز کے وقت بھی منجانب اللہ صاحب الامر کی اطاعت

واجب ہے۔ تو اب صاحب الامر اس کے اتباع کی نیت ہی کیسے کر سکتا ہے جس پر خود اس کا اتباع لازم ہو۔ اس کے خلاف ایک ہی وقت میں یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ صاحب الامر کر رہا ہو امامِ جماعت کا اتباع اور امام جماعت کر رہا ہو صاحب الامر کا اتباع۔

فرض کیجیے کہ اگر عہدِ رسول میں کوئی شخص مدعیٔ رسالت ہوکر چاہتا کہ رسول اپنے دعوائے رسالت سے دست بردار ہوکر اس مدعی کی رسالت کو تسلیم کرلیں اور اپنی طاقت کے بل بوتہ پر انتہائی تشدد سے کام لیتا جب کہ رسول کے انصار کم سے کم اور مدعیِ باطل کے مددگار زیادہ سے زیادہ ہوتے تو کیا ایسی صورت میں یہ ممکن ہوتا کہ رسولِ برحق اپنی رسالت کو خیرباد کہہ کر اُس کی رسالت کو تسلیم کرلیں؟ ہرگز نہیں۔ یقیناً اگر رسول کو یہ صورت پیش آتی تو آپ مدعیٔ باطل کی کسی صورت میں بھی بیعت نہ کرتے چاہے وہ تشدد کتنا ہی سخت تر کیوں نہ ہوتا۔ نبیٔ برحق کبھی اس کی بیعت نہیں کرسکتا تھا چاہے وہ کوئی فاسق و فاجر ہوتا یا ظاہراً نیک اور پارسا ہوتا۔ اگر نبی پر انتہائی تشدد کیا جاتا تو پہلے آپ اظہارِ حق فرما کر اتمامِ حجت کرتے اور کم از کم یہ چاہتے کہ مخالف اپنی جگہ جو چاہے کہے اور کرے مگر اس پر بضد نہ ہو کہ میں اس کے دعوے کو تسلیم کرلوں۔ اگر وہ یہ بھی نہ مانتا تو آپ یہ کوشش کرتے کہ مقابل اس پہ ہی راضی ہوجائے کہ میں اپنے وطن، شہر اور ملک کو چھوڑ کر دور دراز کسی جگہ چلا جاؤں۔ اگر یہ صورت بھی قبول نہ کی جاتی اور دشمن صف آرا ہوکر قتال شروع کر دیتا تو آپ بھی اپنے انصار کو لے کر میدانِ قتال میں آتے اور دشمن کی بھرپور طاقت اور اپنے انصار کی کمی کی پروا نہ کرکے قتال کے جواب میں قتال کرتے اور اپنا سب کچھ خدا کا بول بالا رکھنے کے لیے قربان کر دیتے۔ حسینؑ رسولؐ کے وارث بھی تھے اور خدا کے قرار دیے ہوئے صاحب الامر بھی تھے۔ یعنی

اس جماعتِ اولی الامر میں سے ایک تھے جن کی اطاعت اللہ نے کافۂ مومنین پر فرض قرار دی تھی۔ جو ایسی حالت میں رسولؐ کرتے وہی حسینؑ نے کیا۔ اپنی عزیز زین جانوں کو دے کر اپنی اور ہر امام کی امامت پر، رسولؐ کی رسالت پر، خدا کی خدائی پر آنچ نہ آنے دی۔ حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسینؑ۔ صلّی اللہ علیٰ محمّد وآلِ محمّد۔

السیّد محمّد جعفر عفی عنہٗ

خطیب جامع شیعہ کرشن نگر (اسلام پورہ) لاہور

تمہید

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَاٰلِہِ الطَّاہِرِیْنَ

دنیا میں کوئی تعلیم یافتہ ایسا نہ ہوگا جس نے عرب کا نام نہ سنا ہو۔ عرب ایک ریگستانی ملک ہے جو ایشیا کی مغربی سرحد پر واقع ہے اور جس کے ساحل پر بحرِ احمر لہریں مار رہا ہے۔ اسی ملک سے ساتویں صدی عیسوی شروع ہونے کے بعد ایک انقلاب کی لہر اٹھی جس کا نام ہے "اسلام"۔ اس انقلاب کے بانی حضرت محمدؐ بن عبداللہ تھے جنھوں نے اپنی پیغمبری کا اعلان کرتے ہوئے دنیا کو کامل توحید کا پیغام پہنچایا اور بت پرستی، اقتدار پرستی، سرمایہ پرستی غرض کہ غیر اللہ کی ہر طرح کی پرستش کی مخالفت کی۔ اس سے ان لوگوں کو مخاصمت پیدا ہوگئی جن کے اقتدار کو اس تعلیم سے نقصان پہنچتا تھا۔ انھوں نے اس انقلاب کو روکنے کی کوشش کی اور ان کے ہاتھوں پیغمبرؐ کو بڑی تکلیفیں اٹھانا پڑیں۔

اس مخالفت میں بنی امیہ پیش پیش تھے۔ اس لیے کہ اگرچہ پیغمبرِ اسلامؐ کی تعلیم براہِ راست کسی خاندان کی بلندی اور کسی خاندان کی پستی کی حمایت نہیں کرتی تھی مگر آپ کی تعلیم میں بلندی اور عزت کا جو معیار قرار دیا گیا تھا وہ صرف کردار کی خوبی، فرائضِ انسانی کی بجا آوری تھی۔ اس معیار پر بنی امیہ کے اکثر افراد پورے نہ اُترتے تھے۔ چنانچہ امیہ کے پوتے ابوسفیان بن حرب نے اسلام کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کیا۔ عرب کے ہٹ دھرم اور جاہل بُت پرست اس عَلم کے نیچے جمع ہوگئے اور حضرت محمد مصطفےٰؐ کو ستانے اور تبلیغِ اسلام میں روڑے اٹکانے لگے اور آپ برابر مصیبتیں اور سختیاں جھیلتے رہے اور دائرہ آپ کے پیغام کی مقبولیت کا وسیع ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ حجاز کے دوسرے اہم شہر مدینہ کے رہنے والوں نے اس تعلیم کو قبول

کرلیا اور آپ سے نصرت کا وعدہ کرکے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو وہاں آنے کی دعوت دے دی۔ چنانچہ آپ کے ساتھ والے وہاں رفتہ رفتہ جانے بھی لگے اور زیادہ تر چلے گئے۔ جب مکّہ والے آپ کے مخالفین نے یہ دیکھا تو اب انھوں نے ایکا کرکے آپ کی جان لینے کا فیصلہ کر لیا اور رات کے وقت آپ کے مکان کو آکر گھیر لیا مگر آپ اپنے چچازاد بھائی حضرت علیؑ کو اپنے بستر پر لٹا کر خود ان کے حلقہ سے نکل گئے اور مدینہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ اس واقعہ کو "ہجرت" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اسی سے مسلمانوں کے ہجری سن کی ابتدا ہوتی ہے۔

دشمنوں نے ہجرت کے بعد بھی آپ کو چین سے بیٹھنے نہ دیا اور کئی مرتبہ چڑھائی کرکے آپ کو قتل کرنے آئے۔ مجبوراً آپ کو کئی لڑائیاں لڑنی پڑیں جن میں بدر، اُحد اور احزاب بہت مشہور ہیں۔ مگر ان تمام لڑائیوں میں ابوسفیان کو ہر مرتبہ شکست ہوئی اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حامیوں کی تعداد اور ان کی طاقت برابر بڑھتی رہی۔ آخر بنی امیہ کی قوت بالکل ٹوٹ گئی اور اپنی کمزوری کو چھپانے کے لیے انھوں نے بھی قبولِ اسلام کی نقاب ڈال لی۔ مگر موقع کے منتظر رہے کہ اسلام کی طاقت کچھ بھی کمزور ہو تو انھیں اپنے گئے ہوئے اقتدار کو واپس لانے کا موقع ملے۔

حضرت محمد مصطفےٰ ؐ کی زندگی میں ان کی اس آرزو کے پورا ہونے کا کوئی امکان نہ تھا مگر اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد حضرتؐ کی وفات ہوگئی اور مسلمانوں کے نظام میں ابتری پیدا ہو گئی۔ سلطنتِ وقت کے دنیوی مصالح نے بنی امیہ کو شام میں اپنی حکومت قائم کرلینے کا موقع دے دیا جو شروع میں صرف ایک صوبہ دار یا گورنر کی حیثیت سے تھی مگر رفتہ رفتہ اس کے اقتدار اور قوت میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ آخر میں اس نے خود مختار سلطنت کی حیثیت حاصل کرلی۔

ان لوگوں نے شام کے ملک میں اپنا قبضہ جماتے ہی حضرت محمد مصطفےٰ ؐ کے رائج کیے [illegible] اور اسلام [illegible] کرد یا اور آخر میں تو یہ حالت

ہوئی کہ قرآنی احکام کی علانیہ مخالفت ہونے لگی۔

حضرت رسولؐ کے حقیقی جانشین جو اسلامی تمدن و تہذیب کے محافظ تھے اس کو کسی طرح برداشت نہ کرسکتے تھے۔ جب علیؑ ابن ابیطالبؑ جو رسولؐ کے چچازاد بھائی، ان کی آواز پر سب سے پہلے لبیک کہنے والے اور شروع سے آخر تک اسلام کی اشاعت میں ان کے دست و بازو تھے مسلمانوں کے تختِ حکومت پر آئے تو انھیں حکومتِ شام سے مقابلہ کرنا پڑا اور صفّین کی خونریز لڑائی ہوئی مگر ابھی حضرت علیؑ کا ارادہ اور کام مکمل نہیں ہوا تھا کہ مسجدِ کوفہ میں عین حالتِ سجدہ میں حضرتؑ کے سر پر تلوار لگائی گئی جس سے آپ نے شہادت پائی۔ حضرت علیؑ کے بعد آپ کے بڑے فرزند امام حسنؑ نے کچھ شرائط کا پابند کرنے کے بعد حکومتِ شام سے صلح کرلی مگر حکومتِ شام نے ان شرائط کی پابندی نہیں کی اور خفیہ طور پر زہر دلوا کر ان کی زندگی کا خاتمہ کردیا۔ اب پیغمبرؐ کے خاندان میں اصولِ اسلام کے تحفظ کی پوری ذمہ داری حسینؑ پر تھی جو حضرت محمد مصطفےٰ ؐ کے دوسرے نواسے اور حضرت علیؑ کے چھوٹے بیٹے تھے۔

حکومتِ شام کے تخت پر ابوسفیان کا پوتا یزید بن معاویہ بیٹھا جو بڑا ہی شراب خوار اور بدکردار تھا اور ایسے اخلاقی جرائم کا مرتکب ہوتا تھا جن کا تذکرہ بھی تہذیب اور شائستگی کے خلاف ہے۔ اس کے باوجود اتنے دن کے مضبوط اموی اقتدار کی ہیبت سے عوام کو دم مارنے کی ہمت نہ تھی۔ وہ حکومت کے ظلم و ستم سے اتنا ڈر گئے تھے کہ خوفِ خدا کا احساس باقی نہ رہا تھا۔ مگر یزید جانتا تھا کہ حجاز کے ملک میں شہر مدینہ کے محلہ بنی ہاشم کے اندر ایک انسان ہے جو مجھ سے نہیں ڈرتا، صرف خدا سے ڈرتا ہے اور وہ اصولِ اسلام کا حقیقی محافظ، رسولؐ کا نواسہ ہے۔ وہ خاموش سہی مگر کیا معلوم کس دن دنیا کی آنکھوں سے غفلت کے پردے ہٹ جائیں اور وہ سچائی کی طرف کھنچ جائے۔ اس بنا پر یزید کو فکر لاحق ہوئی کہ کسی نہ کسی طرح وہ حسینؑ سے بیعت حاصل کرلے۔ چنانچہ اس نے مدینہ کے حاکم ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کو حکم بھیجا کہ حسینؑ سے بیعت حاصل کرو اور اس معاملہ میں کسی مراعات سے کام نہ لو۔ حضرت امام حسینؑ نے اس پیغام کے معنی سمجھ لیے اور آپ اسے

پہلے ہی سے سمجھے ہوئے تھے۔

اصولاً آپ کے لیے یزید کی بیعت کرنا غیر ممکن تھا۔ سر کا قلم ہونا بیشک آسان تھا مگر حفاظت خود اختیاری کے فرض کو انجام دینے کے بعد جو اسلامی شریعت کا ایک بنیادی حکم ہے۔

اس کے لیے حسینؑ نے ترکِ وطن کا فیصلہ کر لیا۔ آپ نے اپنے تمام متعلقین کو جن میں عورتیں اور بچّے بھی تھے اپنے ساتھ لیا اور مکّہ میں جا کر پناہ لی۔ اس طرح آپ نے یہ ثابت کر دیا کہ آپ کسی سے جنگ کرنا اور اپنی اور اپنے ساتھیوں کی زندگی کو معرضِ خطر میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے بشرطیکہ آپ کو بیعت یزید پر مجبور نہ کیا جاتا۔

مکّہ عرب کے بین الاقوامی قانون اور پھر اسلام کے رو سے ایک ایسا امن کا مقام تھا جہاں کسی متنفّس کے لیے خطرہ نہ ہونا چاہیے۔ مگر فرزندِ رسولؐ کو یہاں بھی اپنے قتل کا سامان دکھائی دیا۔ آخر ایامِ حج میں کہ جب تمام عالمِ اسلامی مکّہ کی طرف کھنچا چلا آ رہا تھا حسینؑ کو مکّہ سے رخصت ہونا پڑا اور آپ کوفہ کی طرف روانہ ہوئے جہاں کے لوگ آپ کو اصرار کے ساتھ بلا رہے تھے اور آپ سے مذہبی رہنمائی کے طالب تھے اور آپ اپنے چچا زاد بھائی مسلم بن عقیل کو وہاں کے حالات کا مشاہدہ کرنے کے لیے بھیج بھی چکے تھے مگر اس دوران میں کوفہ کی حالت دگرگوں ہو گئی وہاں سنگدل حاکم عبیداللہ بن زیاد کا اقتدار قائم ہو گیا اور مسلم بن عقیل شہید کر ڈالے گئے۔ اس کے بعد کوفہ جانے کا بظاہر کوئی موقع نہ تھا مگر مکّہ اور مدینہ واپس جانے کا بھی امکان نہ تھا۔ اُدھر کوفہ سے آپ کو گرفتار کرنے کے لیے فوج بھیجدی گئی جس نے آپ کو آگے بڑھنے یا واپس جانے سے روکا۔ مجبوراً آپ کربلا کی سرزمین پر اُتر پڑے۔ دوسرے ہی دن سے یزید کا ٹڈی دل لشکر کربلا کے میدان میں آنا شروع ہو گیا۔ تمام راستے بند کر دیے گئے اور امام حسینؑ کو گھیر کر یزید کی بیعت پر اصرار کیا جانے لگا۔

حضرت امام حسینؑ کے ساتھ صرف آپکے ستّرہ ۱۷ عزیز، چند غلام اور سو ڈیڑھ سو کے قریب وہ خاص دوست تھے جو کوفہ یا بعض دوسرے مقامات سے باوجود راستوں کے بند ہونے کے کسی نہ کسی طرح آپ تک پہنچ سکے تھے۔

ساتویں محرم سے آپ پر اور آپ کے تمام ساتھیوں یہاں تک کہ چھوٹے بچوں پر پانی بند کر دیا گیا مگر چونکہ امن پسندی حقیقی معنی میں آپ کا شعارِ زندگی تھا لہٰذا اتمام حجت کے طور پر آپ نے یزیدی فوج کے افسر عمر بن سعد کے سامنے ایسے شرائط پیش کیے جن سے معاملات رو بہ اصلاح ہو جائیں اور جنگ کی نوبت نہ آئے۔ آپ کا طریقۂ کار اتنا سلجھا ہوا تھا کہ عمر بن سعد کو بھی اس بات کا قائل ہونا پڑا کہ حسینؑ صلح کے راستے پر گامزن ہیں چنانچہ اس نے کوفہ کے حاکم عبیداللہ بن زیاد کے پاس اسی مضمون پر مشتمل ایک خط بھیجا مگر ابن زیاد کو حکومت کا غرور اور سلطنت کا نشہ تھا۔ اُس نے حسینؑ کو پہچانا بھی نہ تھا کہ وہ مشکلات کا کہاں تک مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس نے آپ کی صلح پسندی کو کمزوری اور عاجزی کا نتیجہ خیال کرتے ہوئے عمر بن سعد کو لکھ بھیجا کہ حسینؑ غیر مشروط طریقہ پر اطاعت کر لیں جب ہی انکی جان بچ سکتی ہے۔ غیرت دار اور فرض شناس امام حسینؑ کے لیے ایسا ممکن نہ تھا۔

نویں ۹ محرم کی شام کو اس بڑے لشکر نے آپ پر حملہ کر دیا مگر آپ نے ایک شب کے لیے التوائے جنگ کی خواہش فرمائی جو بمشکل منظور کی گئی۔ آپ کا مقصد یہ تھا کہ آخری مرتبہ یہ پوری رات عبادتِ خدا میں بسر کر لیں۔ اس کے علاوہ دوست اور دشمن دونوں کو جنگ کے قطعی طور پر طے ہو جانے کے بعد سوچنے کا موقع دے دیں۔ دشمنوں پر اتمام حجت ہو جائے اور ساتھیوں میں سے کوئی ساتھ چھوڑ کر جانا چاہتا ہو تو چلا جائے۔ آپ نے اپنے ساتھیوں کو جمع کر کے صاف طور پر بتا دیا کہ کل ہماری زندگی کا فیصلہ ہے۔ میں تم سے اپنی بیعت کی ذمہ داری ہٹائے لیتا ہوں۔ تم اس رات کے پردے میں جدھر چاہو چلے جاؤ مگر ان جانبازوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانا نہیں چاہا اور یکزبان ہو کر کہا کہ ہم آپ کا ساتھ کبھی نہ چھوڑیں گے۔ ان لوگوں نے جو کہا تھا وہی کر دکھایا۔

سامنے فوجوں کا سمندر لہریں مار رہا تھا۔ گرد و پیش ویرانی اور بربادی کے سوا کچھ اور نظر نہ آتا تھا۔ عزیزوں، بھائیوں، بھتیجوں اور اولاد کے خوبصورت چہرے امام کے سامنے تھے اور آپ کے ساتھ پردہ دار عورتیں اور چھوٹے بچّے بھی موجود تھے۔ دریا پر فوج کا پہرہ بیٹھا ہوا تھا اور حسینؑ اور ان کے ساتھیوں تک ایک قطرۂ آب کے پہنچنے کی اجازت نہ تھی۔ بے زبان بچے پیاس کی شدّت سے

بیتاب نظر آرہے تھے مگر طاقت کی تمام نمائشیں اور ایذا رسانی کی تمام صورتیں امام حسینؑ اور آپ کے ساتھیوں کو مجبور نہ کر سکیں کہ ایک فاسق و فاجر کو جائز حکمران تسلیم کریں۔

دسویں محرم کو صبح سے دوپہر کے بعد تک امام حسینؑ کے جانباز ساتھی جو آپ سے خاندانی تعلق نہ رکھتے تھے برابر اپنی جانیں حسینؑ اور آپ کے اصول کی خاطر قربان کرتے رہے۔ جب ان میں سے کوئی باقی نہ رہا تو عزیزوں کی نوبت آئی۔ اس موقع پر آپ کے لیے آسان ہوتا کہ آپ خود آگے بڑھ کر راہِ حق میں اپنے سر کا ہدیہ پیش کر دیتے مگر آپ کو اپنی قوتِ برداشت کا پورا امتحان دینا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد آپ کے عزیز آپ سے جدا ہونے لگے۔ سب سے پہلے آپ نے اپنے جوان بیٹے علی اکبر کو جو شبیہہ پیغمبرؐ بھی تھے مرنے کے لیے بھیجا۔ ماں خیمہ میں تھیں اور باپ خیمہ کے دروازے پر اور ان کا چاند فوج مخالف کی گھٹا میں چھپا تھا۔ باپ نے دیکھا اور ماں نے سن لیا کہ علی اکبر تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے مگر صبر و سکون میں فرق نہ آیا۔ اس کے بعد دوسرے عزیز بھی ایک ایک کرکے رخصت ہوئے اور راہِ حق میں نثار ہو گئے۔ سب سے آخر میں آپ کے جانباز بھائی عباس ابن علیؑ آپ سے رخصت ہوئے۔ یہ حسینی جماعت کے علمدار تھے جن کے قتل ہونے سے حسینؑ کی کمر ٹوٹ گئی مگر ہمت شکستہ نہیں ہوئی۔ اس کے بعد آپ کے پاس کوئی سرمایہ حق کی بارگاہ میں نذر دینے کے لیے نہ تھا۔ مگر سب سے آخر میں آپ نے ایک ایسا معصوم ہدیہ پیش کر دیا جس پر کسی شریعت اور قانون کی رو سے مجرم ہونے کا الزام نہ آسکتا تھا۔ وہ شیرخوار بچہ جو اپنی ماں کی گود میں پیاس سے سسکیاں لے رہا تھا حسینؑ نے اس کی حالت دیکھی اور دشمن کی فوج کے سامنے اپنے ہاتھوں پر لیا، یہ تھا حسینؑ کا سب سے آخری فدیہ۔ انسانیت کے ہاتھ پیروں میں لرزہ پڑ گیا اور رحم و کرم کی دنیا میں اندھیرا چھا گیا۔ جب اس دشمن فوج کے ایک سپاہی نے تیرِ سہ پہلو کمان میں جوڑا اور بچّہ کی گردن کو نشانہ بنا لیا۔ حسینؑ کا یہ آخری تحفہ بھی قبول ہو گیا۔ اب کیا تھا؟ بذاتِ خود حضرت کو حق کی حمایت میں جہاد کا فرض انجام دینا تھا اور اپنی جان کی قربانی پیش کرنا تھی۔ چنانچہ آپ نے اس شکستگی اور بیکسی کے عالم میں تلوار نیام سے نکالی اور جتنا قانونِ اسلام کی رو سے آپ کو اپنا فریضہ

محسوس ہوتا تھا اس حد تک انتہائی شدید مقابلہ کیا۔ وہ مقابلہ جو ایسے حالات میں عام انسانوں کی طاقت سے یقیناً بالاتر ہے۔ مگر کہاں ایک انسانی جسم اور کہاں فولادی تلواروں کا سیلاب! جسم زخموں سے چُور ہو گیا۔ آپ گھوڑے سے زمین پر گرے اور وہ مرحلہ جو آپ کے لیے پہلے ہی آسان تھا اب زیادہ آسان ہو گیا۔ آپ کا سر قلم کرکے نیزے پر بلند کیا گیا۔ شہیدوں کی لاشیں گھوڑوں سے پامال کی گئیں۔ مال و اسباب لوٹا گیا۔ خاندانِ رسالت کی مقدّس خواتین کے سروں سے چادریں اُتاری گئیں۔ خیموں میں آگ لگائی گئی۔ مردوں میں ایک بیمار و ناتواں علی بن الحسینؑ باقی رہ گئے تھے جنھیں طوق و زنجیر پہنائے گئے اور عرب کے شریف ترین خاندان کی غیرت مند بیبیاں اسیر کرکے شہر بشہر پھرائی گئیں۔

یہ ہے دنیائے تاریخ کا وہ بڑا حادثہ جو "واقعۂ کربلا" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

یوں تو عالم کا ہر واقعہ اپنے محلِ وقوع کے اعتبار سے کسی خاص جگہ، کسی خاص قوم اور کسی خاص طبقہ سے متعلق ہوتا ہے اور اس لحاظ سے واقعۂ کربلا بھی عراق کی سرزمین، عرب کے ملک، ہاشم کی نسل اور مسلمانوں کی جماعت سے تعلق رکھتا تھا مگر واقعات میں ہمہ گیری اور وسعت پیدا ہو جاتی ہے ان خصوصیات اور نتائج کے لحاظ سے جو کُل نوعِ انسانی سے وابستہ ہوں اور جن میں مذہب و ملّت کی کوئی تفریق نہ ہو۔ اس حیثیت سے دیکھا جاتا ہے تو واقعۂ کربلا متعدد وجوہ سے تمام نوعِ انسانی کے تعلق کا مرکز ہے۔

اوّل یہ کہ ظالم سے نفرت اور مظلوم کے ساتھ ہمدردی فطرتِ بشری میں داخل ہے۔ اگر کوئی قصّہ ہمارے سامنے پیش ہو جس میں ایک طرف ظلم کا مظاہرہ ہو اور دوسری طرف مظلومیت تو چاہے اس واقعہ سے متعلق شخصیتوں سے ہم بالکل واقف نہ ہوں تب بھی ظالم سے نفرت اور مظلوم کے ساتھ ہمدردی پیدا ہو جائے گی اور اس میں کسی مذہب و خیال کا امتیاز نہ ہوگا۔ حضرت امام حسینؑ پر جو مظالم کربلا میں واقع ہوئے ان کی مثال تاریخ عالم میں ناپید ہے۔ یوں تو اکثر انبیاء و مقربین ابنائے زمانہ کے ہاتھوں مظالم کا شکار ہوئے، بہت سے بے گناہ افراد قتل

کیے گئے۔ بہتوں کا مال اسباب لوٹا گیا اور بہت سے لوگ قید ہوئے مگر بحیثیت مجموعی وہ تمام مصائب جن کا سامنا فرداً فرداً بہت سے اشخاص کو کرنا پڑا۔ حضرت امام حسینؑ کی ذات میں اکٹھا ہوگئے اور ان کے بوقتِ واحد جمع ہو جانے سے آپکی ذات مظلومیت میں اپنی آپ مثال قرار پاگئی۔

لہٰذا جس قدر حضرت امام حسینؑ کی مظلومیت کا درجہ بلند اور ظالم کے ظلم کا درجہ شدید ہے اسی قدر وہ ہمدردی بھی کہ جو امام حسینؑ کے ساتھ بحیثیت مظلوم ہونا چاہیے۔ ہر دوسرے مظلوم سے زیادہ ہے اور وہ نفرت بھی کہ جو آپ کے دشمنوں سے بحیثیت ظالم ہونا چاہیے تمام دنیا کے ستمگاروں کی بہ نسبت زیادہ ہے۔

دوسرے یہ کہ حضرت امام حسینؑ کی مظلومیت بے بسی کی مظلومیت نہ تھی۔ جس طرح کسی شخص پر اکیلے جنگل میں ڈاکو حملہ کردیں اور اس کے مال و اسباب کو لوٹ لیں یا اسے قتل کر ڈالیں۔ مظلوم یہ بھی ہے اور ہمدردی اس کے ساتھ بھی ہوگی مگر یہ مظلومیت غیر اختیاری طور پر ہے۔ اس کے ساتھ کوئی عمل ایسا شریک نہیں ہے جو اخلاقی نقطۂ نظر سے قابلِ مدح ہو۔ حضرت امام حسینؑ کی مظلومیت اس نوع کی نہیں ہے۔ آپ نے ایک مسلک حق کی حمایت اور ایک صحیح اصول کی حفاظت کے لیے ان تمام مصائب کو برداشت کیا۔ اس کا نام قربانی ہے۔ یوں تو قربانی کے بہت سے اقسام ہوسکتے ہیں مگر سب میں بلند جان کی قربانی ہے اور اگر اس فرض کے عائد ہونے پر کوئی اس منزل میں ثابت قدم نظر آئے تو تمام افرادِ انسانی کے نزدیک زیادہ عزت و احترام کا مستحق ہوگا اور جس قدر مقصد عزت دار اور شریف ہوگا اتنی ہی قربانی اہم اور قابلِ عزت سمجھی جائے گی۔ کربلا کی سرزمین پر حضرت حسینؑ بن علیؑ نے جو قربانی پیش کی وہ انسانی تاریخ کا ایک بےمثال کارنامہ ہے۔ حق پرستی اور حق پروری کی بنیادیں متزلزل ہو رہی تھیں اور غلبہ و اقتدار انسانی آزادی کا سر کچل کر اپنی غلامی کا اقرار لے رہا تھا۔ اس نازک موقع پر حسینؑ نے اپنے کو اور اپنے عزیزوں بلکہ بچوں تک کو میدان جہاد میں لاکر جبر و استبداد کا پردہ چاک کر دیا اور ثبات و استقلال ضبط و صبر، ایثار و قربانی، حق پروری اور راست کرداری کا بہت بلند نمونہ پیش کیا۔ اس

لحاظ سے حضرت امام حسینؑ کسی قوم اور مذہب سے مخصوص نہیں سمجھے جاسکتے۔ حسینؑ کا تعلق تمام دنیائے انسانیت سے ہے۔ آپ نے وہ کام کیا جس نے انسانیت کے مٹتے ہوئے نقوش کو پھر سے اُبھار دیا اور دم توڑتی ہوئی انسانیت کو نئے سرے سے زندہ کر دیا۔ آپ نے دنیائے انسانیت کو وہ پیغام دیا۔ جو زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ آپ نے دنیا کو سچائی اور راست بازی کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کرایا اور اُس موت کے معنی سمجھائے جس میں دوامی زندگی کی حقیقت مضمر ہے۔ اس لیے تمام اقوامِ عالم جو قربانی کی عزت کرتی ہیں مجبور ہیں کہ حضرت امام حسینؑ کو انتہائی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھیں۔

تیسرے یہ کہ حضرت امام حسینؑ کا مقصد اپنی قربانی سے کوئی ایسا امر نہ تھا جو مختلف مذاہب کے نقطۂ نظر سے محلِ اختلاف ہو۔ انسانی اوصاف و اخلاق کی ایک منزل وہ ہے جہاں تمام مذاہب متفق ہو جاتے ہیں۔ تمام مذاہب کی اصل اساس جس پر ان کی عمارت بلند کی گئی ہے اخلاقِ انسانی کو نقطۂ ارتقاء تک پہنچانا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ زمانہ کے اختلاف سے کچھ احکام میں عمداً تبدیلیاں کی گئی ہوں اور بعض مذاہب کے اصول میں بعد کی آنے والی نسلوں کی ناسمجھی سے کچھ زیادتی یا کمی ہوئی ہو مگر اصلی محور سب کا تہذیبِ اخلاق اور تکمیلِ بشریت ہے۔ حضرت امام حسینؑ کا مقصد یہی نقطۂ مشترک تھا۔ یقیناً اگر حضرت امام حسینؑ کا مقابلہ کسی دوسرے دین و ملت کے افراد سے ہوا ہوتا یعنی کوئی غیر مسلم جماعت آپ کے سامنے ہوتی تو چاہے آپ کی قربانی کتنی ہی حقانیت پر مبنی ہوتی اور آپ کو کتنے ہی ظلم کے ساتھ شہید کیا گیا ہوتا مگر وہ مذہبی جماعت جس کے مقابلہ میں آپ تھے اور جس کے ہاتھوں آپ کو یہ مظالم برداشت کرنا پڑے تھے کسی حد تک آپ کے نام اور آپ کے کام سے بنائے مخاصمت ضرور محسوس کرتی اور واقعۂ کربلا کے ساتھ ہمدردی میں عمومیت پیدا نہ ہوتی۔ لیکن حضرت امام حسینؑ کی قربانی رسمی طور پر کسی ایک مذہب کو مٹانے اور دوسرے مذہب کو قائم کرنے کے لیے نہیں تھی بلکہ ایک ہی دین کے ظاہری ماننے والوں میں برائیوں کو مٹانے اور اچھائیوں کے قائم کرنے کے لیے عمل میں لائی گئی تھی اور چونکہ برائی اور اچھائی کے متعلق اصولی حیثیت

سے مذاہب میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا یعنی ہر مذہب کے نزدیک برائیاں مٹانے کے قابل اور اچھائیاں قائم کرنے کی مستحق ہیں اس لیے ہر مذہب کے لوگوں کو حسینؑ کے مقصد سے اتفاق ہوگا اور وہ آپ کی قربانی کو عزت و احترام کا مستحق سمجھیں گے۔

چوتھے حضرت امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں نے واقعۂ کربلا کے دوران میں مختلف اخلاق و اوصافِ کاملہ کی جو مثالیں پیش کی ہیں وہ عامۂ خلائق کے لیے ایک دائمی درسِ عمل کی حیثیت رکھتی ہیں جس سے تمام افرادِ بشر یکساں طور پر فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ان ہی تمام وجوہ کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا نے واقعۂ کربلا کے ساتھ اپنے باہمی تفرقہ اور جذبات کی کشمکش کے باوجود یگانگی کا برتاؤ کیا اور اقوامِ عالم نے یکساں طور پر اس کی اہمیت کا اعتراف و اقرار کیا اور صدیاں گزرنے کے ساتھ انکی دلچسپی اس اہم حادثہ سے نہ صرف قائم رہی بلکہ مختلف اوقات میں اس میں اضافہ ہوتا رہا۔

اگر کوئی سیاح محرّم کے زمانہ میں شرق و غربِ عالم کی سیاحت کرے اور ہر مرتبہ محرّم کے پہلے دس دن ایک نئے خطۂ زمین پر گزارے تو وہ دیکھ لے گا کہ ہر جگہ اپنے اپنے معیارِ زندگی اور طرزِ معاشرت کے اعتبار سے کسی نہ کسی طرح کربلا کے شہید کو یاد کیا جاتا ہے۔

یہ سالانہ یادگار جو عزاداری کے مختلف مراسم کی شکل میں منائی جاتی ہے کربلا کے واقعہ کے بعد پہلی ہی صدی میں مسلمانوں نے قائم کر لی تھی اور اس کے حلقۂ اشاعت میں برابر اضافہ ہی ہوتا رہا۔

حالانکہ انسان فطرۃً خوشی کو پسند کرتا ہے اور رنج و غم سے بھاگتا ہے۔ اس لیے اگر حوادثِ زمانہ کے ماتحت غم کے اسباب پیدا بھی ہوتے ہیں تو ان کو بھلانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقوامِ عالم میں جتنے تہوار ہیں وہ سب خوشی کی یادگار ہیں۔ غم کی یادگاریں کبھی قائم نہیں کی گئیں یہ صرف حسینؑ مظلوم کی شہادت ہے جس کی یادگار غم کی صورت میں صدہا سال سے برابر قائم ہے ظاہر ہے کہ فطرتِ انسانی کسی بار کو عرصہ تک برداشت نہیں کر سکتی۔ اس غم کی یادگار کا اس طرح برقرار رہنا اس امر کی دلیل ہے کہ واقعۂ کربلا کی یاد میں انسانی زندگی کے لیے نفع بخش عناصر مضمر ہیں۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہمیشہ حال کا نقش ماضی کو فراموش بنا کر اس کے اثر کو ختم کر دیتا ہے۔

لیکن اس کے برخلاف واقعۂ کربلا کی یادگار کا اس شدت کے ساتھ قائم رہنا کہ حال کا کوئی واقعہ اس پر اثر انداز نہ ہو سکے۔ یہ ماننے پر مجبور کرتا ہے کہ تاریخ عالم اس کے بعد سے اس وقت تک کوئی نظیر اس کی پیش نہیں کر سکی۔

باوجودیکہ واقعۂ کربلا کے بعد کتنے ہی انقلاب ہوئے۔ تمدن نے کتنی ہی کروٹیں بدلیں۔ معیار اخلاق میں کتنے ہی تغیرات ہوئے مگر حسینی قربانی کی یاد مسلسل تیرہ سو برس سے یکساں عزت و احترام کے ساتھ قائم ہے۔ ماننا پڑے گا کہ وہ قربانی ایسے مشترک انسانی اصول کی حفاظت کے لیے کی گئی ہے کہ جب تک دنیا میں انسانیت قائم ہے اس اصول کی بھی قدر و منزلت ہے اور اس یادگار قربانی کی یاد بھی برقرار ہے۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ جتنا کوئی موضوع اہم ہوگا اور تاریخی حیثیت سے جس قدر کسی واقعہ میں ندرت اور اہمیت زیادہ ہوگی اسی قدر اہلِ فکر و قلم طبع آزمائی زیادہ کریں گے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں کربلا کے واقعہ سے بڑھ کر کسی واقعہ سے متعلق نظم و نثر کا ذخیرہ فراہم نہیں ہوا۔ کربلا کی زمین پر ابھی خونِ شہیداں کی تری خشک نہ ہونے پائی تھی کہ شاعروں کی زبان سے اس واقعہ کے متعلق اشعار تراوش کرنے لگے اور نثر میں ان خطبوں سے قطع نظر کرتے ہوئے جو اہل بیت حسینؑ کی زبان یا دوسرے مقررین کے دہن سے ہنگامی حالات کے ماتحت نکلے ہیں خصوصاً اُن اقدامات کے ذیل میں جو امام حسینؑ کے خون کا بدلہ لینے کے لیے سلیمان بن صُرَدِ خزاعی اور پھر مختار کی جانب سے ہوئے تھے جن کا مقصد ہی یہ تھا کہ لوگوں کو واقعۂ کربلا کی اہمیت سے متاثر کیا جائے مستقل طور سے اس واقعہ پر تصانیف کی ابتداء پہلی صدی ہجری کے اواخر سے ہوئی اور اس کے بعد برابر مورخین واقعۂ کربلا پر مقاتل لکھتے رہے اور تصانیف کا سلسلہ جاری ہو گیا اور یہ واقعہ ہے کہ دنیا کے کسی دوسرے موضوع پر اتنا نہیں لکھا اور کہا گیا ہے جتنا واقعۂ کربلا کے متعلق لکھا اور کہا جا چکا ہے۔ پھر بھی موضوع تشنہ ہے اور بہت کچھ سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت باقی ہے۔ اس کے علاوہ اب تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان کا

اندازِ بیان زیادہ تر مذہبی معتقدات[1] سے وابستگی رکھنے والے افراد کے مذاق کے مطابق ہے جس سے اکثر غیر مذاہب کے افراد اجنبیت محسوس کرتے ہیں۔ کوئی ناواقف اور اجنبی شخص اگر واقعۂ کربلا اور امام حسینؑ کی شخصیت کو عالمِ اسباب کی تاریخی رفتار اور اس کے نتائج اور ان کے ضروری تفصیلات کے ساتھ جاننا چاہے تو اسکی تشنگی دور کرنے کے لیے کوئی ایک کتاب ایسی جامع نہیں ہے جس کا پتہ دیا جا سکے۔ زیرِ نظر کتاب اس ضرورت کو سامنے رکھ کر لکھی جا رہی ہے اور اس موقع پر جب کہ دنیائے انسانیت کے اس عظیم واقعہ کو پورے تیرہ سو برس ہو گئے ہیں اور ہر مذہب و ملت کے افراد نے متفق ہو کر حسینؑ بن علیؑ کی سیزدہ صد سالہ یادگار قائم کی ہے۔ یہ کتاب اس صدی کی یادگار کے طور پر حق، انصاف اور سچائی کی بارگاہ میں حریت، مساوات اور ایثار کی بارگاہ میں، انسانی دل، دماغ اور ضمیر کی بارگاہ میں انسانی جذبات، احساسات اور شریفانہ خیالات کی بارگاہ میں، انسانی وقار، عزت اور افتخار کی بارگاہ میں، انسانی فکر، نظر اور کردار کی بارگاہ میں اور ان سب کے ذریعہ سے ان کے پروردگار کی بارگاہ میں پیش کی جاتی ہے۔

حسینؑ بن علیؑ کے کارنامۂ جاویدکی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ تو الفاظ کی محدود دنیا کے بس سے باہر ہے لیکن اگر اس پوری کتاب میں ایک جملہ بھی اس ایثار و قربانی کی تصویر کا کوئی رُخ آنکھوں کے سامنے لا سکے تو یہی اس خدمت کا پورا ماحصل ہوگا۔

علی نقی النقوی

[1] امام کی شان کیا ہوتی ہے؟ اس بارے میں جو شخص مذہب شیعہ کے معتقدات معلوم کرنا چاہے اسے عربی میں اصولِ کافی اور اس کے شروح، فارسی میں حق الیقین علامہ مجلسی (متوفی ۱۱۱۱ھ) اور حدیقۂ سلطانیہ مصنفہ جناب سید العلماء سید حسین (متوفی ۱۲۷۳ھ) اور اردو میں مذکورہ کتابوں کے تراجم کی طرف رجوع کرنا چاہیے مختصر طور پر اصول مذہب شیعہ کے سمجھنے کے لیے خود میرے وہ تصانیف دیکھنا مناسب ہوں گے جو امامیہ مشن سے شائع ہوئے ہیں۔

پہلا باب

نسبی خصوصیات، خاندان اور اس کے شاندار روایات

نظامِ اخلاق کی تشکیل میں آباؤ اجداد کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ "توارثِ صفات" اور خاندانی احساسات کے لحاظ سے بھی اور اس لیے بھی کہ بچپن سے کان میں پڑے ہوئے ماضی کے تذکروں سے قوائے ادراک و شعور کی اسی طرح پرورش ہوتی ہے جس طرح دودھ سے بچہ کی جسمانی پرورش اور جس طرح دودھ خون کی شکل میں تبدیل ہو کر رگوں میں دوڑتا ہے یوں ہی بچپن کے سنے ہوئے تذکرے بجلی کی رو کے ساتھ انسان کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں اترتے اور نفس کے تحت الشعوری طبقوں میں راسخ ہو جاتے ہیں۔ اس لیے مذہبی معتقدات سے قطع نظر کرتے ہوئے انسانی حیثیت سے حسینؑ کو سمجھنے کے لیے ان کے آباؤ اجداد کے کارناموں پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کی ذات بڑی حد تک بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہے۔ یعنی یہود و نصاریٰ اور مسلمان سب ان کو مانتے ہیں اور وہ مذہبی طور پر مسلمانوں کے مورثِ اعلیٰ کہے جا سکتے ہیں کیونکہ قرآنِ کریم کی تصریح کے مطابق حضرت محمد مصطفٰےؐ نے اپنے کو ملتِ ابراہیم کا رہبر بتایا اور حضرت ابراہیمؑ نے ہی اس جماعت کا جو راہِ حق میں ان کے پیچھے آئی سب سے پہلے نام "مسلم" رکھا اور ابراہیمؑ کی زبانی اپنے پروردگار کی بارگاہ میں یہ دعا بھی مذکور ہے کہ خداوندا ہم کو "مسلم" قرار دے اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک "امتِ مسلمہ" قرار دے۔ اس طرح مسلمانوں کی قومی زندگی اور پیغمبرِ اسلامؐ کی بعثت گویا دعائے ابراہیمؑ کا نتیجہ تھی۔ اس لیے حضرت ابراہیمؑ کے روایاتِ زندگی ابنائے اسلام کے لیے ایک موروثی ترکہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور فرزندانِ اسلام کے عناصرِ اخلاق کی تشکیل میں ان کا بڑا حصہ ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے دو بیٹے تھے۔ اسحاقؑ اور اسمٰعیلؑ۔ حضرت اسحٰقؑ سلسلۂ بنی اسرائیل کے

اور حضرت اسمٰعیلؑ پیغمبرِ اسلامؐ حضرت محمد مصطفےٰ ص کے مورثِ اعلیٰ ہیں۔ بعض مصالح کی بنا پر حضرت ابراہیمؑ نے اپنے فرزند اسمٰعیلؑ کو شیرخوارگی کے عالم میں آپ کی والدۂ گرامی ہاجرہ کے ساتھ مکہ کی سرزمین پر پہنچا دیا جس پر خانہ کعبہ واقع ہے۔ خانہ کعبہ کی تعمیر کا کام انھیں باپ بیٹے ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ نے انجام دیا جو مذہبی طور پر تمام خلقِ خدا کا محلِ اجتماع قرار پایا اور یہ آلِ ابراہیمؑ کی مرکزیت کا احساس عامۂ خلائق کے دل میں پیدا ہونے کا ایک بڑا ذریعہ بن گیا۔

ان دونوں بزرگواروں کی نسبت اسلامی تاریخ کا یہ واقعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ من جانب اللہ مامور ہوئے کہ اپنے فرزند حضرت اسمٰعیلؑ کو اپنے ہاتھ سے ذبح کریں اور آپ نے بڑی ثابت قدمی اور پُرجگری کے ساتھ حکمِ ربّانی کی تکمیل کو عمل کے آخری درجہ تک پہنچا دیا۔ اگرچہ وقت پر پروردگارِ عالم کی طرف سے بجائے انسان کے جانور کی قربانی کے عمل میں آنے کا انتظام ہو گیا مگر اس اعلان کے ساتھ کہ آئندہ اس کا معاوضہ راہِ خدا میں ایک بڑی قربانی کے ساتھ ہونا ضروری ہے (وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ[۱]) اس واقعہ کو اسلام نے بڑی اہمیت دی اور عید قربان کی شکل میں اس کی مستقل یادگار قائم کر دی۔

اسمٰعیلؑ کے بارہ فرزند تھے۔ ان میں سے نابت اور قیدار کی اولاد حجاز میں آباد ہوئی اور بہت پھیلی۔ قیدار کی اولاد میں عدنان بہت مشہور ہیں اور پیغمبرِ اسلامؐ انھیں کی اولاد میں سے تھے۔[۲] حضرت کا نسب نامہ آپکی ذات سے لیکر عدنان تک متفقہ طور سے تواریخ و سیر میں موجود ہے اسطرح:-

عدنان۔ معد۔ نزار۔ مضر۔ الیاس۔ مدرکہ۔ خزیمہ۔ کنانہ۔ نضر۔ مالک۔ فہر۔ غالب۔ لوی۔ کعب۔ مرہ۔ کلاب۔ قصی۔ عبد مناف۔ ہاشم۔ عبد المطلب۔ عبد اللہ جو حضرت محمد مصطفےٰ ص کے والد بزرگوار تھے[۳] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرتؐ سے عدنان تک اکیس پشتیں ہیں اور اگر ہر نسل کا اوسط تیس سال قرار دیا جائے تو کُل پشتوں کی مدت ۶۳۰ برس ہوئی۔ قریش کا لقب ان

---

[۱] قرآنِ مجید سورۂ صافات آیت ۱۰۷ [۲] الامم والملوک للطبری ج ۲ ص ۱۹۱-۱۹۲۔
[۳] سیرت ابن ہشام ج ۱ ط مصر ص ۲۔ طبقات ابن سعد طبع لیدن ج ۱ ص ۲۷-۲۸۔

اکیس آدمیوں میں سے کس کو ملا۔ اس میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ قریش کا لقب سب سے پہلے نضر بن کنانہ کو ملا۔ بعض کے نزدیک فہر کو اور بعض کے نزدیک قصی بن کلاب کو۔ وجہ تسمیہ میں بھی کئی قول ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ تقرّش سے ماخوذ ہے، تجارت اور کسبِ معاش کے معنی میں چونکہ یہ لوگ اپنی محنت و مشقت اور قوتِ بازو کی کمائی معیارِ عزت سمجھتے تھے اور عملی طور پر اس کے پابند تھے اس لیے قریش کہلائے اور ایک قول یہ ہے کہ وہ تقرّش بمعنی اجتماع سے ماخوذ ہے۔ چونکہ ان لوگوں نے متفرق ہونے کے بعد اجتماعی شکل اختیار کی اس لیے قریش کہے جانے لگے۔[۱]

چونکہ قصی کے وقت تک نسلِ عدنان کے لوگ مکّہ کے پہاڑوں اور وادیوں میں منتشر تھے، قصی نے ان سب کو جمع کر کے کعبہ کے آس پاس مکانوں میں آباد کیا۔ اسی لیے خود قصی کو مُجَمِّع کے لقب سے یاد کیا جانے لگا جیسا کہ عرب کے شاعر نے کہا ہے:-

ابوكم قصي كان يدعى مُجَمِّعًا ۔۔۔ به جمع الله القبائل من فهر

(یعنی) تمہارے مورثِ اعلیٰ قصی وہ ہیں کہ جو "مجمّع" کہلاتے تھے۔ اُنہی کے ذریعہ سے اللہ نے قبیلۂ فہر کی مختلف شاخوں کو ایک جگہ جمع کیا۔[۲]

نابت بن اسمٰعیلؑ کے بعد خانہ کعبہ کی تولیت جرہمی خاندان کی طرف جو اُن کے ننھیال والے تھے منتقل ہو گئی تھی اور اس طرح یہ لوگ دُنیوی اور مذہبی اقتدار دونوں کے مالک بنے ہوئے تھے۔ عرصہ تک قابض رہنے کے بعد انھوں نے کعبہ کے اموال میں تغلّب و تصرّف اور حج کو آنے والے پردیسیوں پر ظلم و ستم اور حرمِ مکّہ کی حرمتوں کو برباد کرنا شروع کر دیا جس کے نتیجہ میں بنی خزاعہ نے یمن سے نکل کر اُن پر حملہ کر دیا اور انھیں مکّہ سے نکال کر خود قابض ہو گئے۔ یہ خاندان تقریباً دو سو برس تک کعبہ کا مالک بنا رہا۔ قصی نے اُنھیں میں شادی کی اور جب ان کا اثر و رسوخ حجاز میں بڑھ گیا تو انھوں نے نضر بن کنانہ کی تمام اولاد کو جمع کر کے انھیں خانہ کعبہ کی حمایت و تولیت کی ذمہ داری یاد دلائی اور آخر متفقہ طاقت کے ساتھ خزاعیوں کو شکست دے کر مکہ پر خود قابض ہوئے۔ انھوں نے مکہ معظمہ کے

---

[۱] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۶۰-۶۱ [۲] طبری ج ۲ ص ۱۸۲

مکانات کی از سرِ نو تعمیر کی اور دارالندوہ (محلِ مشاورت) کے نام سے ایک عمارت تیار کرائی جس میں جمہور کے کام انجام دیے جاتے تھے۔ ان کے لیے معاشرت کے قوانین منضبط کیے اور خراج کی وصولیابی اور حاجیوں کے خورد و نوش کا بھی انتظام کرایا۔[1] انھوں نے شراب خواری کی مذمت اور اس کی مضرتوں کا اعلان بھی کیا۔[2]

قصیٰ کے فرزندوں میں عبدِ مناف اوصاف و کمالات میں اپنے بزرگوں کے حقیقی جانشین تھے اس لیے اپنے باپ کی زندگی ہی میں انھوں نے ملکِ عرب میں شہرت و امتیاز کا درجہ حاصل کر لیا۔[3]

عبدِ مناف کے فرزندوں میں ہاشم جن کا اصلی نام عمرو تھا نہایت بااثر اور ممتاز تھے۔ کعبہ کی معزز خدمتیں حاجیوں کی سیرابی اور ضیافت ان کو سپرد کی گئیں جو انھوں نے بہت قابلیت سے انجام دیں۔ انھوں نے سلطنتِ روم سے خط و کتابت کر کے کچھ خاص حقوق عرب تجّار کے واسطے حاصل کیے تھے۔[4] "ہاشم" ان کا لقب اس وجہ سے ہوا کہ انھوں نے سب سے پہلے اہلِ مکہ کو روٹیوں کے ٹکڑے شوربے میں بھگو کر کھلائے۔[5] (عربی میں ہشم، چورا کرنے کو کہتے ہیں)

ہاشم کی وفات کے بعد ان کے بھائی مُطّلب جانشین ہوئے۔ اس لیے کہ ہاشم کے فرزند شیبہ اس وقت نہایت کمسن تھے۔ جب مطّلب کی وفات ہوئی تو ان کی جگہ ان کے بھتیجے شیبہ نے حاصل کی جو عبد المطّلب کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ شرف، عظمت اور شہرت میں اپنے بزرگوں پر بھی فوقیت لے گئے[6] اور "سیّد البطحا" کے خطاب سے مشہور ہوئے جو اُن کی اولاد میں باقی رہ گیا۔ چنانچہ وہ آج تک "سادات" کہے جاتے ہیں۔ عبد المطّلب کا توکّل اور اعتماد خدا پر اس وقت پورے طور پر ظاہر ہوا جب ابرہہ نے یمن سے بڑھ کر کعبہ کو ڈھانے کے ارادے سے مکّہ پر چڑھائی کی۔ مکّہ والوں کے پاس کوئی ایسی فوجی طاقت نہ تھی جس سے وہ غنیم کا مقابلہ کرتے مگر عبد المطّلب خداوندی امداد پر بھروسا رکھتے تھے۔ آخر غیبی طاقت ہی نے اصحابِ فیل کو تباہ و برباد کر دیا۔[7] عبد المطّلب کے دس

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۷۹-۸۰ [2] الامالی للصدوق ص ۲ [3] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۸۱ [4] طبری ج ۲ ص ۱۷۰
[5] ابن ہشام ج ۱ ص ۸۵، طبری ج ۲ ص ۱۷۹ [6] ابن ہشام ج ۱ ص ۸۶۔
[7] اسباب کافی طبع لکھنؤ ص ۲۸۳، سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۳۲-۳۴، طبری ج ۲ ص ۱۷۲-۱۷۴

بیٹوں میں سے دو بیٹے عبد اللہ اور ابوطالب تھے۔

عبد اللہ بن عبد المطلب کی قربانی کا واقعہ بھی کتبِ تواریخ میں مذکور ہے اور مشہور ہے کہ عبد المطلب اپنے فرزند عبد اللہ کی قربانی پر تیار تھے مگر ان کے ننھیال والوں کے اصرار پر قرعہ ڈالا گیا اور سو اونٹوں کی قربانی کے بدلے میں عبد اللہ کی جان بچی۔[1]

چونکہ عبد اللہ کا انتقال باپ کے سامنے ہو گیا۔ اس لیے عبد المطلب کے تمام امتیازات و اختیارات ابوطالب کو حاصل ہوئے۔ "شیخ البطحاء" اور "سیّد القریش" کے خطابوں سے مشہور ہوئے۔ ان امانتوں کے ساتھ ساتھ جو ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کی متروکہ تھیں ایک سب سے بڑی امانت جو اُن کی حفاظت میں آئی وہ عبد اللہ کے یتیم فرزند محمدؐ کی ذات تھی۔

حضرت محمد مصطفےٰؐ کی عمرِ نوجوانی کی منزل میں تھی کہ آپ کی راستبازی اور امانت داری کو تمام عرب نے تسلیم کرتے ہوئے آپ کو "امین" کا لقب دے دیا۔[2] اپنی امانتیں آپ کے پاس رکھوانا شروع کر دیں۔ اہم معاملات میں آپ کے تصفیہ کو قابلِ قبول سمجھنے لگے۔ جب آپ کی عمر بیس سال کی تھی تو قریش میں "حلف الفضول" کا عہد نامہ ہوا[3] جو بے نظیر شریفانہ اصول پر مبنی تھا اور اس کی تحریک کا سہرا بنی ہاشم ہی کے سر رہا، اس لیے کہ زبیر بن عبد المطلب اس کے داعی تھے۔

واقعہ یہ تھا کہ عبد المطلب کے انتقال کے بعد عرب میں مطلق العنانی اور بے آئینی کا دور دورہ ہو گیا۔ رشتہ داریوں کے لحاظ سے آپس میں کشت و خون تو نہیں ہونے پایا مگر اجنبی لوگوں کے ساتھ انصاف نہیں ہوتا تھا چنانچہ قبیلۂ زُبَید کے ایک یمنی شخص نے جس سے کہ عاص بن وائل سہمی نے کوئی بیش قیمت چیز خرید کر قیمت ادا نہیں کی تھی تمام آلِ فہر کو مخاطب کر کے مؤثر انداز میں اس ظلم و ستم کا شکوہ بھی کیا۔

انہی واقعات سے متاثر ہو کر بنی ہاشم، زہرہ اور اسد بن عبد العزیٰ کے قبیلے عبد اللہ بن جدعان کے مکان میں جمع ہوئے اور متفقہ طور پر عہد کیا کہ ہم ہمیشہ مظلوم کا ساتھ دینگے۔

[1] ابن ہشام ج ۱ ص ۹۴-۹۷ [2] طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۷۶ [3] ابن سعد ج ۱ ص ۸۲

اوراس وقت تک چین نہ لیں گے جب تک اس کا حق ادا نہ ہوجائے۔ اس معاہدہ کا نام حلف الفضول رکھا گیا جس میں فضل، فضال، مفضل اور فضیل شامل تھے اور اس لیے اس کا نام فضول قرار پا گیا تھا۔ حضرت محمد مصطفےٰ اس معاہدہ میں شریک تھے اور ہمیشہ اس پر آپ نازاں رہے بلکہ بعثت کے بعد جبکہ عرب کے تمام قدیم معاہدات اور مخاصمات کالعدم قرار دے دیئے گئے تھے آپ اپنے کو اس معاہدہ کا پابند سمجھتے تھے اور فرماتے تھے کہ آج بھی اگر کوئی مجھے اس معاہدہ کی بنا پر آواز دے تو میں اس کی صدا پہ لبیک کہوں گا۔[1]

اگر آپ نے عرب کی تاریخ پڑھی ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ معاہدہ اس قوم کی عام ذہنیت کے بالکل خلاف تھا۔ وہاں تو یہ تھا کہ ہم کو اپنے قبیلہ والے کی مدد کرنا چاہیے خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ اس قبائلی تعصب کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک شخص کی ذاتی جنگ قبائلی جنگ بن جاتی تھی جو چالیس چالیس برس جاری رہتی تھی۔ اس غلط ذہنیت کی سب سے پہلے مخالفت کرنے والے بنی ہاشم تھے جو دنیا کو حق و انصاف کی قدر و قیمت کا اندازہ کرا رہے تھے اور بتا رہے تھے کہ اس کے مقابلہ میں قومیت یا برادری کوئی چیز نہیں ہے۔

جب حضرت محمد مصطفےٰ کی عمر تیس برس کی تھی ابوطالب کے یہاں علیؑ کی ولادت ہوئی۔[2] اور ابھی علیؑ ابن ابی طالب چند ہی سال کے تھے کہ مکہ میں قحط پڑا اور ابوطالب اقتصادی تکالیف میں مبتلا ہو گئے۔ آپ کے بار کو کم کرنے کے لیے محمد مصطفےٰ نے علیؑ کی پرورش خود سے متعلق کر لی اس طرح علیؑ محمدؐ کے آغوش تربیت میں آگئے۔[3]

یہاں ایک مرتبہ اس پر نظر ڈال لیجیے کہ اس خاندان کی زمین شرف کس آسمان تک پہنچ چکی تھی اور اس کے قدیم روایات کس درجہ شاندار رہیں۔

۱۔ کعبہ جو تمام عرب کے مذہبی اجتماع کا مرکز ہے وہ تعمیر کیا ہوا ہے ان کے مورث اعلیٰ حضرت ابراہیمؑ کا۔

---

[1] ابن ہشام ج ۱ ص ۱۴۲۔ ابن سعد ج ۱ ص ۸۲ [2] آپ مکہ معظمہ کے اندر ۱۳ رجب ۳۰ عام الفیل کو (کعبہ پر ہاتھیوں کے حملہ سے تیس برس بعد) پیدا ہوئے (مروج الذہب مسعودی، مستدرک حاکم، ارشاد شیخ مفید) [3] ابن ہشام ج ۱ ص ۱۵۶۔

۲۔ ان کے دادا حضرت اسمٰعیلؑ اللہ کی بارگاہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے "ذبیح خدا" کہلائے۔ پھر عبدالمطلب اور ان کے فرزند عبداللہ نے اسی سبق کو دہرا کر ثابت کر دیا کہ یہ قربانی کا جذبہ اس خاندان کا ورثہ ہے جو دنیا کو برابر یاد رہا چنانچہ ان دونوں طے شدہ قربانیوں کی بنا پر حضرت محمد مصطفےٰ کو "ابن الذبیحین" کے لقب سے یاد کیا گیا۔[1] ؏

۳۔ تمام قبائلِ مُضر کی شیرازہ بندی کا فخر ان ہی کو حاصل ہے۔

۴۔ خانہ کعبہ کے محافظ اور موسم حج کے منتظم ہونے کی حیثیت سے انھیں تمام عرب کی مرکزیت حاصل ہے۔

۵۔ تمام اندرونی اور بیرونی معاملات میں عرب قوم کی قیادت اور نمائندگی ان کا حصہ ہے۔

۶۔ وہ غریبوں کے دستگیر اور قحط سالی وغیرہ کے سخت اوقات میں مسکینوں کی خبرگیری کرنے والے ہیں۔

۷۔ وہ اسم اور مسمٰی دونوں حیثیتوں سے سید (سردار) مانے جاتے ہیں۔

۸۔ وہ ایک ہی وقت میں میدانِ جنگ کے شہسوار اور عالمِ روحانی کے رازدار ہیں جس کا گواہ اصحابِ فیل کے مقابلہ میں عبدالمطلب کا طریقۂ پیکار ہے۔

۹۔ انھوں نے مظلوموں کی حمایت اور حق کی طرفداری کا بیڑا اٹھایا اور اس بارے میں تمام قریش کی رہنمائی کی تھی۔

یہ ہیں وہ نمایاں خصوصیات جو تاریخی اسناد کے ساتھ اس خاندان کے لیے ابھی تک ثابت تھے مگر اب اسی مشرق سے وہ آفتاب چمکتا ہے جس کی شعاعیں دنیائے انسانیت کو صبح قیامت تک روشن رکھیں گی۔

ساتویں صدی عیسوی کے شروع ہونے پر جبکہ دنیا تاریکی کے عظیم دور سے گزر رہی تھی جزیرہ نمائے عرب سے یہ آفتاب طالع ہوا جس کی ابتدائی کرنیں اگرچہ حجاز کی سرزمین مکہ سے

---

[1] طبری ج ۱ ص ۱۳۵۔ ؏ شریعتِ اسلامیہ میں یہ طریقہ قربانی کہ اپنے ہاتھ سے اللہ کی رضا کے لیے اپنا یا کسی اپنے سے متعلق انسان کا خون بہایا جائے منسوخ کر دیا گیا مگر راہ خدا میں جب ضرورت ہو تو دشمنوں سے جہاد کر کے اپنی جان قربان کرنے کا اصول قائم رہا اور آلِ رسولؐ نے عملی طور پر اسی کی مثالیں پیش کیں۔

ظاہر ہوئی تھیں مگر رفتہ رفتہ اس کی روشنی شرق و غرب میں پھیل گئی اور دنیا کو روشن کر دیا۔ یہ عالمگیر مذہب اسلام تھا اور اس خداوندی پیغام کے پہنچانے کے لیے محمد مصطفےٰ منتخب ہوئے جن کے ذریعہ سے کائنات کو ایک خدائے توانا کے سامنے سر جھکانے کی تعلیم دی گئی اور غیر اللہ کی پرستش کو مٹانے کا اعلان کیا گیا۔ خواہ وہ سونے چاندی پتھر کے بت ہوں یا گوشت پوست سے بنا ہوا انسان جو الوہی اقتدار کے سامنے اپنی سطوت و ہیبت کا سکہ جمانا چاہتا ہو اور خلقِ خدا کو اپنے سامنے سرنگوں ہونے پر مجبور کرے۔

اس وقت حضرت علیؑ ابن ابی طالب کی عمر دس برس کی تھی اور چونکہ علیؑ پہلے رسولؐ کی آغوش تربیت میں تھے[۱] اس لیے یہ کہنا بالکل درست ہے کہ علیؑ اور اسلام میں وہی وابستگی پیدا ہوئی جو ایک آغوش میں رہنے والے دو بچوں میں آپس میں ہونا چاہیے۔

چند سال تک رازداری کے ساتھ فرضِ تبلیغ کو ادا کیا گیا[۲] اس کے بعد حکم آگیا وانذر عشیرتک الاقربین (یعنی) اپنے قریبی رشتہ داروں کو تبلیغ کیجیے[۳]۔ حضرت نے اس حکم کی تعمیل میں دعوت کا انتظام کر دیا اور تمام اولاد عبدالمطلب کو جمع کرکے اپنی رسالت کا اعلان کیا اور توحیدِ الٰہی کا پیغام پہنچایا۔ پھر فرمایا کہ تم میں سے کون شخص اس دین کی اشاعت میں میرا دست و بازو بننے کے لیے تیار ہے؟ اس وعدہ پر کہ وہی میرا بھائی، میرا وصی اور میرا جانشین قرار پائے گا۔ مجمع تمام خاموش تھا۔ حضرت علیؑ اگرچہ سب سے زیادہ کمسن تھے مگر آپ کھڑے ہو گئے اور کہا کہ میں آپ کا اس مہم میں ہر طرح سے مددگار رہوں گا۔ آپ نے حضرت علیؑ کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا بس یہ میرا بھائی، میرا وصی اور میرا جانشین ہے۔ تم سب کو اس کی اطاعت لازم ہے[۴]۔

اب علانیہ بت پرستی کی مذمت ہونے لگی جس سے قریش آپ کی مخالفت پر کمربستہ اور ایذا رسانی پر آمادہ ہو گئے۔ مگر آپ کے چچا جناب ابوطالب کی شخصیت آپ کے سامنے سینہ سپر تھی جس کی

---

[۱] طبری ج ۲ ص ۳۱۲ [۲] طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۱۳۲ ۔ طبری، ج ۲ ص ۲۱۶ - ۲۱۸ - ارشاد ص ۱۶

[۳] قرآن سورۂ شعراء آیت ۲۱۴ ۔ [۴] طبری، ج ۲ ص ۲۱۷

وجہ سے ان لوگوں کو کچھ بن نہ پڑتا تھا۔ آخرکار قریش کا ایک وفد ابوطالب کے پاس آیا۔ اس میں عتبہ، شیبہ، ابوسفیان، عاص بن ہشام، ابوجہل، ولید بن مغیرہ اور عاص بن وائل وغیرہ شریک تھے۔ ان لوگوں نے ابوطالب سے کہا تھا کہ تمھارا بھتیجا ہمارے معبودوں کو برا کہتا ہے، ہمارے مذہب کی مذمت کرتا ہے۔ ہم کو احمق ٹھہراتا ہے اور ہمارے آبا و اجداد کو گمراہ بتاتا ہے اس لیے یا تو تم اسے ان باتوں سے روک دو یا اسے ہمارے سپرد کر دو۔ پہلی بار ابوطالب نے نرمی سے ان کو ٹال دیا مگر کچھ عرصہ کے بعد جب یہ وفد پھر آیا تو اس نے نہایت سختی سے کہا کہ اب ہم اس صورتِ حال کو برداشت نہیں کر سکتے۔ یا تو تم انھیں روکو یا ہمارے تمھارے درمیان جنگ ہو کہ ہم دونوں میں سے ایک کا فیصلہ ہو جائے۔ ابوطالب نے مناسب سمجھا کہ اب رسول اللہؐ سے اس کا تذکرہ کریں۔ حضرتؐ نے پورا واقعہ سنا تو فرمایا "خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند لاکر دے دیں تب بھی میں اپنے فرض سے باز نہ آؤں گا۔ خدا اس کام کو پورا کرے گا یا میں خود اس پر نثار ہو جاؤں گا۔" اور یہ کہتے کہتے آنکھوں میں آنسو آگئے۔ یہ دیکھنا تھا کہ ابوطالب کا دل ہل گیا۔ انھوں نے کہا کہ "اچھا تم اپنے فرض کو انجام دیتے رہو میں آخر دم تک تمھارا ساتھ دوں گا۔"[۱]

چنانچہ ابوطالب نے حضرت محمد مصطفےٰؐ کی حفاظت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اور جب تک زندہ رہے رسولؐ کے لئے سینہ سپر رہے۔

مگر حضرت ابوطالب اور خدیجۂ کبریٰ کی وفات کے بعد اہلِ مکہ کی ایذا رسانی حضرت رسولؐ کے خلاف بہت بڑھ گئی اور آپ نے ان کے راہِ راست پر آنے سے بظاہر اسباب ناامید ہو جانے کی وجہ سے یہ طے کر لیا کہ اب مکہ معظمہ کو جو آپ کا آبائی وطن تھا ترک فرما دیں۔ چنانچہ رفتہ رفتہ اپنے متبعین کو مدینہ کی طرف جہاں کے کچھ لوگوں نے آپ کی پیروی قبول کر لی تھی روانہ فرمانے لگے۔ یہ دیکھ کر مکہ والے سب آپ کی جان لینے کے درپے ہو گئے اور ایکا ہوا کہ رات کے وقت

---

[۱] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۶۳ - ۱۶۴ - طبری ج ۲ ص ۲۱۹ - ۲۲۰

آپ کے گھر کو گھیر کر آپ کو قتل کر ڈالیں۔ آپ اپنے چچا زاد بھائی علیؑ بن ابی طالبؑ کو یہ ہدایت فرما کر کہ وہ آپ کے بستر پر آپ کی چادر اوڑھ کر سو رہیں خود مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ حضرت علیؑ نے دشمنوں کی کھنچی ہوئی تلواروں کے اندر رسولؐ کے بستر پر آپ کی چادر اوڑھ کر آرام کیا۔[1]

پھر مدینہ پہنچنے کے بعد جب مخالفین اسلام نے فوجی طاقتوں کے ساتھ مسلمانوں پر چڑھائی کی اور بدر و اُحد اور خندق وغیرہ کی لڑائیاں ہوئیں تو ان لڑائیوں میں حق و صداقت کی روحانی طاقت کے ساتھ حضرت علی مرتضیٰؑ کی تلوار ہر موقع پر اسلام کی فتح مندی کا سبب بنتی رہی۔

حضرت محمد مصطفےٰؐ کی ایک بیٹی تھیں فاطمہ زہراؑ جن کی اُن کے بلند اوصاف کی بناء پر آپ انتہائی عزت کرتے تھے کہ جب وہ آپ کے پاس آتی تھیں تو آپ تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے[2] اور بکثرت حدیثیں آپ نے ان کی فضیلت کے بارے میں ارشاد کیں جن میں ایک یہ تھی کہ وہ سردارِ زنانِ جنت اور سردارِ زنانِ اہلِ ایمان ہیں[3] اور فرمایا کہ فَاطِمَةُ بَضْعَةٌ مِنِّی (یعنی) فاطمہؑ میرا ایک ٹکڑا ہے[4]

ظاہر ہے کہ ایسی بیٹی کے لیے رسولؐ ایسے ہی صاحب اوصاف موزوں ترین کفو کو منتخب فرما سکتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ بہت سے پیغام اور نسبتیں آئیں مگر سب مسترد کر دی گئیں اور صرف علیؑ ہی کی ایک ذات جس کے لیے رسولؐ کا قول تھا کہ میں اور علیؑ ایک ہی نور سے ہیں[5]۔ اس رشتہ کے لیے موزوں سمجھی گئی اور رسولِ خداؐ نے فرمایا کہ یہ میرا ہی نہیں بلکہ اللہ کا انتخاب ہے[6]

انہی دونوں مقدس اور بزرگ مرتبہ ماں باپ سے دو فرزند پیدا ہوئے ایک حسنؑ اور دوسرے حسینؑ۔

اب کیا حسینؑ بھلا سکتے تھے اپنے خاندانی خصوصیات اور قدیم روایات کو؟ بقول مولانا ڈاکٹر سید مجتبیٰ حسن صاحب کاموں پوری "حسینؑ جس نسل کی یادگار تھے وہ صدیوں سے قربانی و

[1] طبقات ابن سعد ج ا ص۱۵۳۔ ابن ہشام ج ا ص۲۸۹-۲۹۰ طبری ج ا ص۲۴۴ [2] استیعاب ج ۲ ص۲۵۲

[3] صحیح بخاری ج ۲ ص۱۷۱-۱۸۵-۱۸۹۔ صحیح مسلم ج ۲ ص۲۹۰۔ [4] بخاری ج ۲ ص۱۸۵ و ۱۸۹۔

[5] فردوس الاخبار دیلمی و تذکرہ سبط ابن جوزی وغیرہ۔ [6] صواعق محرقہ ص۸۴ و ۹۷۔

فداکاری کی ایک مسلسل تاریخ تیار کر رہی تھی۔" حسینؑ نے دیکھا نہیں مگر کانوں سے سنتے تو رہے کہ ہمارے مورثِ اعلیٰ ابراہیمؑ خدا کی رضا کے لیے بیٹے کے ذبح پر تیار ہو گئے۔ ہمارے پردادا عبدالمطلب نے اپنے بیٹے عبداللہ کو قربانگاہِ عبودیت میں پیش کیا۔ ہمارے جدِ بزرگوار ہاشم نے اپنے مال و دولت اور اثر کو ہمیشہ خلقِ خدا کی خدمت میں صرف کیا۔ ہمارے خاندان نے مظلوموں کی امداد اور ظالموں سے مقابلہ کا حلف اٹھایا ہے اس لیے اگر خلقِ خدا کسی ظالم کے ہاتھ سے پریشان ہو تو ہمارا فرض ہے کہ ہم مظلوموں کی دستگیری کے لیے آگے بڑھ جائیں[1]

حسینؑ کو معلوم ہوا کہ سچائی کی خاطر پتھر کھائے اور مصیبتیں اٹھائیں میرے نانا رسول اللہؐ نے۔ اور پیغمبرِ اسلامؐ کی حفاظت کے لیے سینہ سپر رہے میرے دادا ابوطالبؑ۔ اور جب اسلام کی حفاظت کا مسئلہ درپیش تھا تو سب سے پہلے عہدِ وفاداری کرنے والے اور پھر تلواروں کے حصار میں بسترِ رسولؐ پر لیٹنے والے اور پھر ہر سخت موقع پر سچائی کے لیے جہاد کرنے والے میرے باپ علیؑ بن ابی طالبؑ تھے۔

یہ عام قاعدہ ہے کہ بچے جب اپنے بزرگوں کے حالات سنتے ہیں تو ان میں بچپن ہی سے ولولہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں بھی کوئی موقع ایسے کارنامے پیش کرنے کا مل جائے۔ اس لیے عام فطرت کے تقاضوں اور ظاہری اسباب کے لحاظ سے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ امام حسینؑ کے لیے علاوہ منصبی ذمہ داری کے خاندانی روایات اور بلند فطرت کا تقاضا یہی تھا کہ بچپن سے منتظر اور مشتاق رہیں کہ سچائی کی خدمت، غریبوں کی دستگیری اور مظلوموں سے ہمدردی کا کوئی موقع پیش آئے اور آپ بھی حق کی حمایت میں اپنے فریضہ کو انجام دے کر اپنی خاندانی روایات کو زندہ اور برقرار رکھیں۔

[1] حلف الفضول کو امام حسینؑ اپنے پیش نظر رکھتے تھے۔ اسکا ثبوت یہ ہے کہ ایک موقع پر جب ولید بن عتبہ حاکم مدینہ نے آپکے ساتھ ظلم و تعدی سے کام لیا تو آپنے حلف الفضول کا حوالہ دیا تھا اور اسکی پابندی کی طرف سب کو توجہ دلائی تھی۔ جس کے نتیجہ میں عبداللہ بن زبیر، مسور بن مخرمہ بن نوفل زہری اور عبدالرحمٰن بن عثمان بن عبیداللہ تیمی متعدد اشخاص نے یہ اعلان کیا کہ اگر حسینؑ بن علیؑ اس معاہدہ کی بنا پر اپنے حق کو طلب کرنے کے لیے کھڑے ہوں تو ہم ساتھ ہوں گے۔ آخر ولید نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور حضرت کے مطالبہ کو منظور کیا (سیرت ابن ہشام ج ا ص۸۴)

شجرۂ نسب آلِ عدنان عہ

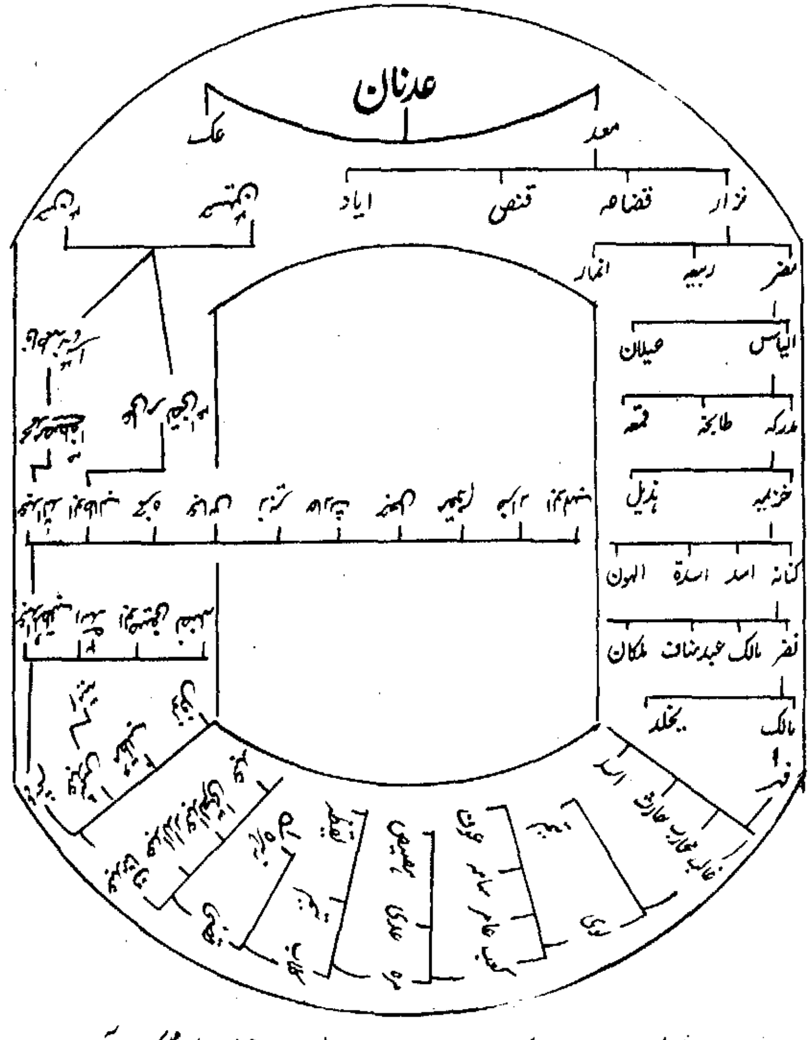

عہ ماخوذ از سیرۃ النبی للشیخ ابی محمد عبد الملک بن ہشام ج ۱، ط مصر۔ ؁ حضرت محمد مصطفےٰؐ کی والدہ آمنہ بنت وہب بن عبد مناف بن زہرہ تھیں (طبقات ابن سعد، ط لیدن ج ۱ ص ۳۱۔ ابن ہشام ج ۱ ص ۶۹۔ اصول کافی ط لکھنؤ ص ۲۷۸۔

؂ حضرت علی مرتضیٰؑ کی والدہ فاطمہ بنت اسد بن ہاشم تھیں۔ اسی لیے آپ کے خصوصیات میں سے ہے "اول ہاشمی ولدہ ہاشم مرتین" پہلے وہ شخص ہیں جو ددھیال اور ننھیال دونوں طرف سے ہاشمی النسل تھے (اصول کافی ط لکھنؤ ص ۲۸۷۔ الارشاد للمفید ط ایران ص ۳)۔

دوسرا باب

بنی ہاشم اور بنی امیّہ

بنی ہاشم کے بالمقابل تاریخ میں جو نام نظر آتا ہے وہ "بنی امیۃ" ہے۔ اس قبیلہ کی بنی ہاشم سے رقابت اور مخالفت کے لیے یہ حکایت بیان کی گئی ہے کہ امیۃ کا باپ عبد الشمس اور بنی ہاشم کے مورثِ اعلیٰ حضرت ہاشم یہ دونوں ماں کے پیٹ سے جڑواں پیدا ہوئے تھے اس طرح کہ انگلی ایک کی دوسرے کی پیشانی سے چسپاں تھی۔ مجبوراً ان کو کاٹ کر الگ الگ کیا گیا جس سے خون بہنے لگا۔ اس وقت لوگوں نے اسے بدشگونی مان کر کہا کہ ان میں آپس میں خونریزیاں ہوتی رہیں گی؂ یہ حکایت درست ہو یا نہ ہو لیکن اس سے یہ تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان دونوں خاندانوں کی جنگ نے کتنی جڑ پکڑ لی تھی کہ لوگ اس کو ایک ناگزیر اور قدرتی چیز سمجھنے لگے تھے۔ مگر ہم جہاں تک تاریخ کے واقعات کی چھان بین کرتے ہیں ہمیں خود عبد الشمس اور ہاشم میں جنگ یا منازعت کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ بے شک عبد الشمس کے بعد امیّہ کی طرف سے مخاصمت کی ابتداء نظر آتی ہے جبکہ وہ حضرت ہاشم سے مقابلہ کی کوشش میں ناکام ہوا اور اس وقت سے اس نے ایک شکست خوردہ فریق کی طرح انتقامی تصادم کا سلسلہ جاری رکھا۔ واقعہ یہ تھا کہ مکّہ میں قحط پڑا جس میں قریش بہت تباہ حال ہو گئے۔ حضرت ہاشم شام کی جانب گئے اور وہاں انھوں نے بہت زیادہ مقدار میں آٹا فراہم کر کے اس کی روٹیاں پکوائیں اور انھیں اونٹوں پر بار کر کے مکہ لائے۔ ان روٹیوں کو انھوں نے چورا کرایا اور ان اونٹوں کو نحر کر کے شوربا تیار کرایا اور بڑی بڑی دیگوں میں انڈلوا کر وہ تمام روٹیوں کا چورا ان دیگوں میں ڈلوا دیا۔ اس کھانے کو عرب میں "ثرید" کہتے تھے۔ اس طرح انھوں نے تمام مکّہ کے لوگوں کو کھلانے

؂ طبری، ج ۲ ص ۱۸۰۔

سے سیر کیا۔ اتفاق سے اس کے بعد ابر آیا، پانی برسا اور قحط سالی دور ہوگئی۔ ہر شخص کہنے لگا کہ اب کی پہلا بارانِ رحمت کا چھینٹا وہ تھا جو ہاشم کے ذریعہ سے برسا۔ "ہاشم" کے معنیٰ ہیں روٹیوں کا چُورا کرنے والا۔ شاعروں نے اس واقعہ کو خاص الفاظ میں نظم کیا۔ ایک شاعر نے کہا ؎

عمرو الذی ہشم الثرید لقومہ   قوم بمکۃ مسنتین عجاف

"عمرو (یہ ہاشم کا اصلی نام ہے) جنھوں نے اپنی قوم کے لیے روٹی کے ٹکڑے کر کے انھیں کھانا کھلایا، وہ قوم جو مکّہ میں قحط سے بھوکی اور تباہ حال ہو رہی تھی۔"[1]

امیّہ دولت مند آدمی تھا۔ اس نے جو دیکھا کہ حضرت ہاشم نے یہ کیا تو اسے حسد دامنگیر ہوا اور خواہ مخواہ بغرض مقابلہ اس نے بھی ہاشم کی نقل اتارنے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہیں ہوا اور یہ امر قریش میں اسکی رسوائی اور بدنامی کا باعث بن گیا۔ اس بارے میں ہاشم کا کوئی قصور نہیں تھا مگر لوگوں کے طعنوں تشنیعوں سے کھسیانے ہو کر وہ ہاشم کو بُرا بھلا کہنے لگا اور اس نے ہاشم کو "منافرت" کی دعوت دی۔ یہ ایک طرح کا مقابلہ عربوں میں رائج تھا کہ دو شخص اپنے اپنے کارناموں کو پیش کر کے کسی ثالث کو حکم بناتے تھے کہ وہ فیصلہ کر دے کہ کون ان میں زیادہ صاحبِ فخر و لائقِ عظمت ہے۔ اس ثالثی کے لیے زیادہ تر کاہن منتخب کیے جاتے تھے جو علمِ قیافہ اور نجوم میں بڑے ماہر ہوتے تھے۔ حضرت ہاشم نے اپنی عمر کی بزرگی اور اپنے رتبہ کی بلندی کے لحاظ سے امیّہ کے ساتھ مقابلہ سے انکار کیا مگر قریش کے عام افراد نے حضرت ہاشم کو مجبور کیا۔ آخر آپ بھی آمادہ ہو گئے اور کہا کہ میں اس شرط پر مقابلہ کرتا ہوں کہ شکست خوردہ فریق اپنے مقابل کو ۵۰ اونٹ سیاہ آنکھوں والے سپرد کرے جو سرزمینِ مکّہ میں نحر کیے جائیں اور دس برس کے لیے وہ مکّہ سے جلاوطن ہو جائے۔ امیّہ اس شرط پر رضامند ہو گیا چنانچہ قبیلہ خزاعہ کے کاہن کو حکم مقرر کیا گیا۔ اس نے فیصلہ ہاشم کے حق میں اور امیّہ کے خلاف دیا۔ حضرت ہاشم نے قرارداد کے مطابق ۵۰ اونٹ حاصل کیے اور انھیں نحر کرا کے پھر تمام اہلِ مکّہ کی

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص۸۵

دعوت کر دی اور امیّہ کو دس برس کے لیے مکّہ سے جلاوطن ہونا پڑا اور وہ اس مدت تک شام میں قیام پذیر رہا۔ یہ پہلی عداوت تھی جو امیّہ[1] کی اولاد میں بنی ہاشم کے مقابلہ میں نسل در نسل برقرار رہی۔ اس کے بعد ہاشم کے فرزند جناب عبدالمطّلب اور امیّہ کے فرزند حرب میں مقابلہ ہوا۔ اس طرح کہ جناب عبدالمطّلب کے جوار میں ایک یہودی کا قیام تھا جس کا نام اذینہ تھا۔ اسے تجارت میں بہت ترقی ہوئی جس سے وہ بہت دولت مند ہو گیا تو حرب بن امیّہ کو اس سے پُرخاش ہو گئی۔ اس نے کچھ لوگوں کو آمادہ کر کے اسے قتل کرا دیا اور اس کا سامان لُٹوا دیا۔ جناب عبدالمطّلب کو تحقیق سے قاتلوں کا پتہ چل گیا مگر یہ معلوم ہوا کہ حرب نے انھیں کہیں چھپا دیا ہے تو انھوں نے حرب کو سمجھایا کہ قاتلوں کو حوالہ کر دو لیکن وہ اس پر تیار نہ ہوا بلکہ جناب عبدالمطّلب سے لڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس کے نتیجہ میں پھر نفیل کاہن کو ثالث بنایا گیا جس کے فیصلہ پر حرب کو یہ جرمانہ ادا کرنا پڑا کہ وہ سَو اونٹنیاں جناب عبدالمطّلب کے حوالے کرے جنھیں وہ اس مقتول یہودی کے وارث کو خون بہا کے طور پر دے دیں اور اس یہودی کا جو مال لوٹا گیا تھا وہ سب بھی واپس دلوایا گیا۔ چند چیزیں دستیاب نہیں ہوئیں تو ان کا تاوان حضرت عبدالمطّلب نے اپنے مال سے ادا کیا۔[2] پے در پے شکست کھانے کے لازمی نتیجہ کے طور پر بنی امیّہ عربی خون کی بہت سی لطافتیں کھوتے گئے اور ان میں دناءت، فریب، احساسِ کمتری اور دوسرے اسی طرح کے اوصاف پیدا ہوتے گئے جو مسلسل شکست کھانے والوں کی خاصیت ہوا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ بنی ہاشم اور بنی امیّہ کے درمیان عام افرادِ عرب کی نگاہوں میں اتنا تفرقہ پیدا ہوتا گیا کہ یہ چیز قابلِ غور بن گئی کہ یہ دونوں ایک ہی نسل کی دو شاخیں ہیں بھی یا نہیں۔

عرب قوم کے یہ تاثرات دیکھ کر بنی امیہ بنی ہاشم کے خلاف ضربیں لگاتے تھے مگر ہر مرتبہ انھیں ناکامی ہی ہوتی تھی۔ حضرت محمد مصطفیٰؐ بھی اٹھے تو بنی ہاشم ہی کے یہاں سے۔ یہ آخری بڑی شکست تھی جسے بنی امیہ آسانی سے سہہ نہ سکتے تھے۔ شبلی نعمانی سیرۃ النبی جلد اوّل میں ص۵۹۱ پر لکھتے ہیں کہ "آنحضرتؐ کی نبوّت کو خاندان بنی امیّہ اپنے رقیب (ہاشم) کی فتح خیال کرتا تھا اس لیے سب سے زیادہ اسی قبیلہ نے آنحضرتؐ کی مخالفت کی۔"

[1] طبقات ابن سعد مطبوعہ لیدن (ہالینڈ) ج ۱ قسم ۱ ص۴۳ و ۴۴۔ طبری ج ۲ ص۱۸۱ [2] کامل ابن اثیر طبع مصر ج ۲ ص۶

سے سیر کیا۔ اتفاق سے اس کے بعد ابر آیا، پانی برسا اور قحط سالی دور ہوگئی۔ ہر شخص کہنے لگا کہ اب کی پہلا بارانِ رحمت کا چھینٹا وہ تھا جو ہاشم کے ذریعہ سے برسا۔ "ہاشم" کے معنیٰ ہیں روٹیوں کا چُورا کرنے والا۔ شاعروں نے اس واقعہ کو خاص الفاظ میں نظم کیا۔ ایک شاعر نے کہا ؎

عمرو الذی هشم الثرید لقومه   قوم بمکة مسنتین عجاف

"عمرو (یہ ہاشم کا اصلی نام ہے) جنھوں نے اپنی قوم کے لیے روٹی کے ٹکڑے کرکے انھیں کھانا کھلایا، وہ قوم جو مکہ میں قحط سے بھوکی اور تباہ حال ہو رہی تھی۔"[1]

امیہ دولت مند آدمی تھا۔ اس نے جو دیکھا کہ حضرت ہاشم نے یہ کیا تو اسے حسد دامنگیر ہوا اور خواہ مخواہ بغرض مقابلہ اس نے بھی ہاشم کی نقل اتارنے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہیں ہوا اور یہ امر قریش میں اسکی رسوائی اور بدنامی کا باعث بن گیا۔ اس بارے میں ہاشم کا کوئی قصور نہیں تھا مگر لوگوں کے طعنوں تشنیعوں سے کھسیانے ہو کر وہ ہاشم کو بُرا بھلا کہنے لگا اور اس نے ہاشم کو "منافرت" کی دعوت دی۔ یہ ایک طرح کا مقابلہ عربوں میں رائج تھا کہ دو شخص اپنے اپنے کارناموں کو پیش کرکے کسی ثالث کو حکم بناتے تھے کہ وہ فیصلہ کردے کہ کون ان میں زیادہ صاحبِ فخر و لائقِ عظمت ہے۔ اس ثالثی کے لیے زیادہ تر کاہن منتخب کیے جاتے تھے جو علمِ قیافہ اور نجوم میں بڑے ماہر ہوتے تھے۔ حضرت ہاشم نے اپنی عمر کی بزرگی اور اپنے رتبہ کی بلندی کے لحاظ سے امیہ کے ساتھ مقابلہ سے انکار کیا مگر قریش کے عام افراد نے حضرت ہاشم کو مجبور کیا۔ آخر آپ بھی آمادہ ہو گئے اور کہا کہ میں اس شرط پر مقابلہ کرتا ہوں کہ شکست خوردہ فریق اپنے مقابل کو ۵۰ اونٹ سیاہ آنکھوں والے سپرد کرے جو سرزمینِ مکہ میں نحر کیے جائیں اور دس برس کے لیے وہ مکہ سے جلاوطن ہو جائے۔ امیہ اس شرط پر رضامند ہو گیا چنانچہ قبیلہ خزاعہ کے کاہن کو حکم مقرر کیا گیا۔ اس نے فیصلہ ہاشم کے حق میں اور امیہ کے خلاف دیا۔ حضرت ہاشم نے قرارداد کے مطابق ۵۰ اونٹ حاصل کیے اور انھیں نحر کراکے پھر تمام اہلِ مکہ کی

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص۸۵

دعوت کردی اور امیہ کو دس برس کے لیے مکہ سے جلاوطن ہونا پڑا اور وہ اس مدت تک شام میں قیام پذیر رہا۔ یہ پہلی عداوت تھی جو امیہ کی اولاد میں بنی ہاشم کے مقابلہ میں نسل در نسل برقرار رہی۔ اس کے بعد ہاشم کے فرزند جناب عبدالمطلب اور امیہ کے فرزند حرب میں مقابلہ ہوا۔ اس طرح کہ جناب عبدالمطلب کے جوار میں ایک یہودی کا... تھا جس کا نام آذینہ تھا۔ اسے تجارت میں بہت ترقی ہوئی جس سے وہ بہت دولت مند ہو گیا تو حرب بن امیہ کو اس سے پرخاش ہوگئی۔ اس نے کچھ لوگوں کو آمادہ کرکے اسے قتل کرا دیا اور اس کا سامان لٹوا دیا۔ جناب عبدالمطلب کو تحقیق سے قاتلوں کا پتہ چل گیا مگر یہ معلوم ہوا کہ حرب نے انھیں کہیں چھپا دیا ہے تو انھوں نے حرب کو سمجھایا کہ قاتلوں کو حوالہ کردو لیکن وہ اس پر تیار نہ ہوا بلکہ جناب عبدالمطلب سے لڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس کے نتیجہ میں پھر نفیل کاہن کو ثالث بنایا گیا جس کے فیصلہ پر حرب کو یہ جرمانہ ادا کرنا پڑا کہ وہ سَو اونٹنیاں جناب عبدالمطلب کے حوالے کرے جنھیں وہ اس مقتول یہودی کے وارث کو خون بہا کے طور پر دے دیں اور اس یہودی کا جو مال لوٹا گیا تھا وہ سب بھی واپس دلوایا گیا۔ چند چیزیں دستیاب نہیں ہوئیں تو ان کا تاوان حضرت عبدالمطلب نے اپنے مال سے ادا کیا۔[1] پے در پے شکست کھانے کے لازمی نتیجہ کے طور پر بنی امیہ عربی خون کی بہت سی لطافتیں کھوتے گئے اور ان میں دناءت، فریب، احساسِ کمتری اور دوسرے اسی طرح کے اوصاف پیدا ہوتے گئے جو مسلسل شکست کھانے والوں کی خاصیت ہوا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ بنی ہاشم اور بنی امیہ کے درمیان عام افرادِ عرب کی نگاہوں میں اتنا تفرقہ پیدا ہوتا گیا کہ یہ چیز قابلِ ... ہو گئی کہ یہ دونوں ایک ہی نسل کی دو شاخیں ہیں بھی یا نہیں۔ عرب قوم کے یہ تاثرات دیکھ کر بنی امیہ، بنی ہاشم کے خلاف ... ضربیں لگاتے تھے مگر ہر مرتبہ انھیں ناکامی ہوتی تھی۔ حضرت محمد مصطفےٰ بھی اٹھے تو بنی ہاشم ہی کے یہاں سے۔ ... آخری بڑی شکست تھی جسے بنی امیہ آسانی سے سہہ نہ سکتے تھے۔ شبلی نعمانی سیرۃ النبی جلد اوّل میں ص۶۵ پر لکھتے ہیں: "آنحضرتؐ کی نبوت کو خاندان بنی امیہ اپنے رقیب (ہاشم) کی فتح خیال کرتا تھا اس لیے سب سے زیادہ اسی قبیلہ نے آنحضرتؐ کی مخالفت کی۔"

[1] طبقات ابن سعد مطبوعہ لیدن (پالینڈ) ج ۱ قسم ۱ ص۴۳، ۴۴، ۴۵۔ طبری ج ۱ ص۱۰۸۱ سے کامل ابن اثیر طبع مصر ج ۲ ص۶

تیسرا باب

اِسلام اور اُس کا پیغام

ظہورِ اسلام سے قبل کا زمانہ "ایامِ جاہلیت" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے متعلق یہ خیال درست نہیں ہے کہ عرب اس میں وحشت اور بربریت کے دور سے گزر رہے تھے اور تمدن و تہذیب سے واقف نہیں ہوئے تھے بلکہ جس طرح ڈاکٹر سید وحید مرزا صاحب نے لکھا ہے واقعہ یہ ہے کہ جنوبی عرب اسلام سے صدیوں قبل ایک بڑی تہذیب کا گہوارہ اور کاروبار تجارت کا ایک خوشحال مرکز تھا۔ حمیری بادشاہوں کے آثارِ قدیمہ، سدِّ مارب، باغِ شدّاد اور تختِ بلقیس ملکۂ سبا وغیرہ کے تذکروں میں اس کا مکمل ثبوت موجود ہے۔ اس کے علاوہ ایامِ جاہلیت کی شاعری جو کہ ادب کا بہترین نمونہ ہے اسی سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایامِ جاہلیت کے عرب بہت سی خوبیوں کے حامل تھے۔ مثلاً بہادری، سخاوت، مہمان نوازی، وفاداری، شوہری محبت اور برادری اُنس وغیرہ۔ خلاصہ یہ کہ شاعری ان کے اخلاقیات کا دفتر ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شرافت کا کافی عنصر رکھتے تھے۔ ان کی شاعری بالخصوص ان میں سے چند کی، اس بات کو بھی ظاہر کر دے گی کہ اگرچہ وہ اس زمانے کے الہامی مذہب کو نہ ماننے کے باعث مشرک تھے اور بت پرستی بھی کیا کرتے تھے تاہم وہ مذہب کے خاص خاص عقائد سے بالکل ناواقف و بیگانہ نہ تھے۔ وہ اپنی بت پرستی کی یہ تاویل کرتے تھے کہ ان بتوں کے ذریعہ سے ہم خدائے واحد (اللہ) کی بارگاہ میں قرب حاصل کرتے ہیں۔ پھر یہ کہ عربوں کی ایک بڑی تعداد جناب اسمٰعیلؑ کی نسل سے تعلق رکھتی تھی اور یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کی تعلیمات سے قطعاً بیگانہ ہو گئے ہوں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تمدنی حیثیت سے اسلام سے قبل کے زمانہ میں عرب کی جماعت ترقی کے بعد تنزل کی طرف جا رہی تھی۔ اب ان میں کچھ

عمدہ قدیم خوبیوں کا شائبہ تو موجود تھا لیکن زیادہ تر اس ... بری عادتیں داخل ہو گئی تھیں۔ وہ ہر سال مکہ میں بغرضِ حج جمع ہوتے تھے لیکن اس مقدس فرض کی اہمیت ان کے دلوں سے محو ہو چکی تھی۔ ان کے کارواں حجاز، عراق اور شام میں اب بھی اسباب ... سے لدے ہوئے جاتے تھے لیکن اب ان میں صنعت و تجارت کا جوش سرد ہو چکا تھا اور انتہائی غر... نے انھیں حریص بنا دیا تھا۔ ان میں اللہ کا ایک دھندلا اور مدھم تصور موجود تھا لیکن ان کے بُت ... ن کے نزدیک زیادہ مقدس تھے۔ وہ صلح پسند اور مطمئن زندگی کے فوائد سے واقف تھے اور جنگ ... متنفر رہنا چاہتے تھے جیسے وہ "شعلہ در آگ" یا اس منحوس جانور سے جس کے یہاں کثرت سے توام ... پیدا ہوتے ہیں تشبیہہ دیا کرتے تھے لیکن انکی خود غرضی اور غربت ان کو آمادہ کرتی تھی کہ وہ اپنے ... ایہ کے مال پر دست تطاول دراز کریں۔ وہ اپنے مُردوں کا خوب ماتم کرتے تھے لیکن انتقام ... سے اپنے کو باز نہ رکھ سکتے تھے نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ نسلاً بعد نسلٍ برابر خونریز جنگیں جاری رہتی ... ں۔ وہ اپنے بچوں سے محبت کرتے تھے، اس لیے کہ وہ ان کے جگر کے ٹکڑے ہیں جو زمین پر چلتے پھرتے ہیں لیکن ان ہی میں سے بعض کو اپنی عزت کا اتنا پاس رہتا تھا کہ وہ اس خیال کو برداشت ... نہیں کر سکتے تھے کہ ان کی لڑکیاں کسی ظالم بھائی یا چچا کی کنیزی میں چلی جائیں یا اُن کے رحم و کرم ... پر پڑ جائیں اور اس لیے وہ ان کی ہلاکت کو اپنی عزت کے برقرار رکھنے کا بہترین ذریعہ سمجھتے تھے

یہی حالت وہ ہوتی ہے جس کی اصلاح نہایت ... وار ہے کیونکہ دورِ بربریت و وحشت سے گزرتی ہوئی قومیں سادہ لوح ہوتی ہیں۔ ان کے دلوں پر ... یا نقش بٹھلایا جائے وہ آسانی سے اتر آتا ہے اس لیے کہ اس کے خلاف کوئی نقش جما ہوا نہیں ہے مگر عربوں کی تمدنی خرابیاں وہ تھیں جو خالص مادی ساخت کے تمدن اور ہوسِ اقتدار کی پیداوار ہوتی ... یں۔ انھوں نے عربوں کی افتادِ طبع کے ساتھ مل کر سونے پہ سہاگے کا کام کیا تھا۔

احساسِ برتری قومیت سے منتقل ہو کر جب انفر... یت کی طرف آتا ہے تو اس کا نتیجہ ہوتا ہے باہمی رقابت اور آپس کی خانہ جنگی۔ یہ بات عربوں ... انتہائی درجہ پر پہنچ گئی تھی۔ پھر اسی کا نتیجہ

تھا کہ مساواتِ انسانی کوئی چیز نہ رہی تھی اور غلبہ، طاقت اور اقتدار سب کچھ تھا۔ اس کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ ایک بڑے آدمی کے قتل ہو جانے پر صرف اس کے قاتل کو قتل نہ کیا جاتا تھا بلکہ اس کے قبیلہ کے سینکڑوں بے گناہ آدمیوں کو مار ڈالا جاتا۔ تب کہیں یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس کے خون کا بدلہ ہُوا۔ اس کے برخلاف اگر بڑے آدمی کے ہاتھ سے کوئی چھوٹا آدمی قتل ہوتا تھا تو اس کا خون قصاص کا مستحق نہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ بڑے اور چھوٹے کی تفریق ہزاروں تمدنی گناہوں کا سرچشمہ تھی اور انسانیت کے پرخچے اڑا رہی تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ انھوں نے مادیت کو سب کچھ سمجھ لیا تھا۔ ماوراء المادہ کا تخیّل باقی نہ رہا تھا اس لیے مادی طاقت ہی کی بنا پر وہ امتیازات قائم کرتے تھے۔ یہی حالت کم و بیش عرب کے علاوہ دوسرے ملکوں کی بھی تھی۔

مذہبی حیثیت سے عرب نہایت پستی میں تھے۔ ان میں کوئی ایک مذہب مشترک نہ تھا بلکہ وہاں متعدد مذاہب کے افراد رہتے تھے اور بڑی جماعت بُت پرستی اور ستاروں کی پرستش کو اپنا شعار بنائے ہوئے تھی چنانچہ کعبہ ہی میں تین سو ساٹھ ۳۶۰ بُت رکھے ہوئے تھے جن میں سے ایک ایک کی پرستش سال کے ایک ایک دن کی جاتی تھی کیونکہ عربی سال ۳۶۰ ہی دنوں کا ہوتا ہے۔ جو مذہب رائج تھے جیسے یہود، مجوس اور نصاریٰ وہ بھی پستی کی طرف مائل نظر آ رہے تھے۔ اعمالِ ناشائستہ، دوسری جماعتوں سے نفرت، رواداری کا مفقود ہونا، آپس کی خونریزی اور ایسی ہی بہت سی خرابیاں ان میں واضح طور پر موجود تھیں اور اس لیے فطرتِ انسانی کسی ایسی منتخب ہستی کی خواہاں تھی جو دنیا کو اس مصیبت سے نجات دلائے۔

ایسے وقت میں محمدؐ بن عبداللہ اسلام کا زلزلہ افگن پیغامِ انقلاب لے کر دنیا کے سامنے آ گئے اور مردہ انسانیت کو زندگی کا مژدہ سنایا جیسا کہ ڈاکٹر وحید مرزا صاحب نے لکھا ہے "حضرتؐ کا کام یقیناً دشوار تھا اس لیے کہ آپ محض وحشی لوگوں کو متمدّن نہیں بنا رہے تھے بلکہ بگڑی ہوئی سماجی کیفیت کو سُدھارنا چاہتے تھے۔ آپ کا کام ان تمام عقائد و توہمات، روایات و مراسم کا عربوں کے دلوں سے محو کرنا تھا جو اُن کی زندگی کا جزوِ لاینفک بن چکی تھی۔ رسولؐ ان لوگوں کو بردباری،

خاکساری، پاکبازی اور عفو کا سبق پڑھانا چاہتے تھے۔ جن کے نزدیک معاف کر دینا کمزوری کی دلیل اور انتقام نہ لینا ذلت اور بزدلی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ رسولؐ ان لوگوں کو مساوات اور اخوت کی تعلیم دینا چاہتے تھے جو کہ اپنے خاندانی شرف پر فخر کیا کرتے تھے اور اپنے آباؤ اجداد کے پورے شجرہ کو نہایت سختی کے ساتھ محفوظ رکھا کرتے تھے۔ ان چیزوں کے علاوہ اسلام کو عربوں کے اور بہت سے دوسرے رجحانات سے برسرِپیکار ہونا پڑا۔ مثلاً اس نے شراب کی ممانعت کر دی جس کے وہ عادی ہو چکے تھے اور جس کا استعمال وہ سخاوت کی دلیل سمجھتے تھے۔ اس نے قماربازی بند کر دی جو کہ عربوں کے نزدیک بذل و جُود کی ایک قطعی علامت تھی اور بہت سی مخرب اخلاق عادتوں کو ممنوع قرار دیا۔ عرب اس بات کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ سب سے زیادہ مقدس انسان کیونکر خدا کی بارگاہ میں سب سے زیادہ معزز ہو سکتا ہے یا اسلام قبول کرنے کے بعد کوئی پست انسان کیونکر عرب کے شریف ترین خاندانوں کے اشخاص سے برتری کا دعویٰ کر سکتا ہے۔"

خواجہ غلام السیدین صاحب نے اسے بہت اچھے لفظوں میں لکھا ہے کہ "اسلام ایک ایسی دنیا کے لیے جو پجاریوں کے قبضۂ اقتدار اور دولتمندوں کے زیرِ حکومت مصیبت کے دن کاٹ رہی تھی پیغامِ آزادی لے آیا۔ آزادی پجاریوں کی قید سے جو عبد و معبود کے درمیان واسطہ بننے کے ٹھیکیدار تھے آزادی گروہِ اُمرا کی حکومت سے جو نہ کسی خدائی قانون کی پروا کرتے تھے اور نہ کسی انسانی قانون کی، بلکہ بغیر روک ٹوک کے حریصانہ طریقوں پر دوسروں کی محنت و مشقت کے پھلوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے، آزادی غلاموں اور نیچ ذاتوں کے لیے ان کے مالکوں کے مظالم اور خلافِ انسانیت بے رحمانہ سلوک سے، آزادی طبقۂ نسواں کے لیے اس عملی غلامی سے جس میں وہ انسانی حقوق کے ابتدائی منازل سے بھی محروم کر دی گئی تھیں، آزادی عام انسانوں کے لیے ان قیود سے جن میں وہ ذات پات، رنگ اور قوم کی تنگ نظری کی بندشوں میں مبتلا تھے جس سے ان کی حیاتِ اجتماعی فنا ہو رہی تھی اور وہ متخاصمین کے گروہ میں منقسم ہو رہے تھے گروہِ انسانی کی طرح اپنی خود ساختہ ظالمانہ قیدوں میں مقیّد ہو رہا تھا۔ ہندوستان کے مشہور شاعر اور فلسفی

اقبال نے اس منظر کی تصویر کشی ذیل کے اشعار میں کی ہے ؎

بود انساں در جہاں انساں پرست
ناکس و نا بود ماند و زیردست

سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش
بند ہا در دست و پا و گردنش

کاہن و سلطان و پاپا و امیر
بہر یک نخچیر صد نخچیر گیر

از غلامی فطرتِ او دوں شدہ
نغمہ ہا اندر نئے او خوں شدہ

اسلام نے اسے ایک پیغامِ آزادی سنایا۔ حریت و مساوات اور انسانی برادری کی تلقین کی اور تواریخ انسانی میں پہلے پہل شہری اور انسانی حقوق پورے طور پر عام انسانوں کو بالعموم عطا کیے جس سے وہ بہ سبب قومیت، رنگ یا جنس کے یا بہ سبب غربت و فلاکت کے محروم تھے۔ غربا، مظلوم اور عام انسانوں کے عام طبقہ کو جواب تک بڑی بیدردی سے پیسا جا رہا تھا نئی امیدوں اور اپنے کار آمد ہونے کا نیا احساس عطا کیا ؎

تا امینے حق بہ حق داراں سپرد
بندگاں را مسندِ خاقاں سپرد

اعتبارِ کار بنداں را فزود
خواجگی از کار فرمایاں ربود

قوت او ہر کہن پیکر شکست
نوعِ انساں را حصارے تازہ بست

تازہ جاں اندر تنِ آدم دمید
بندہ را باز از خداونداں خرید

حریت زاد از ضمیرِ پاک او
ایں مئے نوشیں چکید از تاکِ او

ناشکیبِ امتیازات آمدہ
در نہاد او مساوات آمدہ

عصرِ نو کیں صد چراغ آوردہ است
چشم در آغوشِ او واکردہ است

یہ قیمتی خیالات تھے جن کو اسلام عربوں کی زندگی میں داخل کرنا چاہتا تھا اور عربوں کی وساطت سے تمام انسانوں میں پہنچانا چاہتا تھا۔"

اسلام نے اس ذہنی انقلاب کے پیدا کرنے کے لیے سب سے پہلے اصلی سبب کو دور کرنے ... غیر طاقت کی جانب متوجہ کیا جس

لحاظ سے تمام افراد انسانی یکساں حیثیت رکھتے تھے۔ اس کے سوا مساوات قائم کرنے کے لیے دولت کو برابر تقسیم کر دیا جائے لیکن بازوؤں کی طاقت، موروثی وجاہت، قوم و قبیلہ کی تقسیم کس طرح کی جا سکتی ہے؟ اسلام جانتا تھا کہ خارجی مساوات ممکن نہیں اس لیے اس نے ذہنی انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ اس ذہنی تبدیلی کے ذریعہ ایک انسان دوسرے انسان کو برابر سمجھے۔ اس نے صحیح طور پر سمجھا کہ برادری اور برابری کی اصل کنجی کیا ہے؟ احساسِ اخوت و مساوات کی واحد بنیاد یہ ہے کہ جب کوئی کثرت کسی وحدت کی طرف مستند ہو جائے گی تو اس کے اجزاء میں برادری اور برابری کا احساس پیدا ہو جانا فطری ہے۔ دو بھائی کیوں ایک دوسرے کے ساتھ برابری کا دعویٰ رکھتے ہیں؟ اس لیے کہ ایک باپ کے بیٹے ہیں، ایک خاندان کے آدمی کیوں آپس میں برادری اور برابری کا تصور رکھتے ہیں؟ اس لیے کہ ایک مورثِ اعلیٰ کی نسل سے ہیں۔ ایک ملک کے لوگ آپس میں کیوں رابطۂ اخوت محسوس کرتے ہیں اور کیوں حقوق میں برابری کے طالب ہوتے ہیں؟ اس لیے کہ ایک سرزمین کے باشندہ ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ مشرق والے آپس میں یگانگی اور مغرب والے آپس میں یکجہتی کیوں محسوس کرتے ہیں؟ اس لیے کہ وہ آفتاب کے لحاظ سے ایک سمت کے رہنے والے ہیں۔ معلوم ہوا کہ کثیر افراد میں اتحاد و مساوات کا احساس پیدا کرنے کا ذریعہ صرف وہ ایک وسیع نقطۂ واحد ہے جس کی طرف زیادہ سے زیادہ افراد یکساں طور پر منسوب ہو سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کلیہ یہ ہوا کہ جب کوئی کثرت وحدت کی طرف منسوب ہو تو اس کے اندر برابری اور برادری کا احساس پیدا ہو جائے گا۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ مذکورہ بالا اتحادوں میں سے ہر اتحاد افتراق کا پیش خیمہ قرار پایا یعنی جب ایک باپ کے بیٹوں میں ایکا پیدا ہوا تو دوسرے باپ کے بیٹوں کے سامنے محاذ قائم ہوا اور جب ایک خاندان کے لوگوں میں ایکا قائم ہوا تو دوسرے خاندان والوں کے سامنے محاذ قائم ہوا جس کا نتیجہ ہوا کرتا ہے قوموں کی جنگ اور ممالک کا باہمی تصادم اور فتح و شکست کا غیر متناہی سلسلہ جس کے کرشمے آج بھی نظر آ رہے ہیں اور جب ایک سمت والوں میں اتحاد ہوا تو دوسری سمت والوں کے سامنے محاذ قائم

ہوا۔ یہاں تک کہ یورپ والے ایک الگ قوم بن گئے اور ایشیا والے ایک الگ قوم اور جب اس کے ساتھ رنگ کے اتحاد نے اثر دکھایا تو گوروں اور کالوں کا ایسا افتراق پیدا ہوا کہ گوروں نے کالوں کو اپنے ساتھ ایک ہوٹل میں کھانا کھانے سے روکا بلکہ ایک عبادت گاہ میں عبادت کے لیے ایک ہی مذہب والوں کے لیے جمع ہونا تک ممنوع قرار دیا۔ یہ سب نتیجہ تھا اس کا کہ اتحاد کی دیواریں عالم انسانیت کے بیچ میں اٹھائی گئی تھیں اس لیے ہر دیوار جو اٹھی اس نے ادھر والوں کو تو متحد کیا اور اُدھر والوں کو جدا کر دیا۔ اسلام نے اس اصل اصول کو لیتے ہوئے کہ اتحادِ افراد کا راز اتحادِ مرکزی میں مضمر ہے ضرورت سمجھی کہ ان تمام درمیانی دیواروں کو ڈھا دیا جائے اور بیچ کے ان تمام خطوط کو مٹا کر ان کی بجائے ایک وسیع احاطہ ایسا قائم کیا جائے جہاں نسل، رنگ، ملک اور قومیت کسی چیز کی تفریق نہ ہو۔ وہ احاطہ ایسا ہو جو تمام عالم انسانی کو اپنے گھیرے میں لے لے اور چونکہ اس احاطہ کے باہر پھر کچھ رہ نہیں جائے گا اس لیے افتراق و امتیاز کا سوال ہی نہ پیدا ہو سکے گا۔ اس کے لیے کوئی مادی چیز نقطۂ مرکزی نہیں بن سکتی تھی کیونکہ جو مادی شے ہو گی وہ محدود ہو گی اور محدود ہونے کے ساتھ اس میں قرب و بعد نیز کمی اور زیادتی کے مدارج پیدا ہوں گے اس لیے ضرورت تھی کہ نگاہ کو تمام مادی چیزوں سے ہٹا کر اس غیر مادی بلند و بالاتر طاقت کی طرف موڑ دیا جائے جہاں حدود و اقدار قائم نہیں ہوتے۔ اس کا سب کے ساتھ یکساں تعلق ہے جو سب کا ہے اور سب اس کے ہیں۔ یہ خالق کی ذات ہے جسے اسلام نے معبودِ برحق اور خدائے کُل ثابت کرتے ہوئے سب کا قبلۂ مقصد قرار دے دیا ہے۔

اس احساس کے پیدا ہونے کے ساتھ کہ سب خدا کے بندے ہیں۔ افرادِ انسانی میں احساسِ اخوت و مساوات پیدا ہونا لازمی ہے۔ جب ایک باپ کے بیٹے آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ایک مورثِ اعلیٰ کی اولاد میں برادری قائم ہو جاتی ہے اور ایک سرزمین کے رہنے والے اپنی مادرِ وطن کے لحاظ سے آپس میں اخوت محسوس کرتے ہیں اور ایک سمت کے رہنے والے اپنے میں یکجہتی کا تصور کرتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ایک خالق کے بندے سب آپس میں بھائی بھائی نہ بن

جائیں، یہ تھا وہ عملی سبق جو اسلام کی توحید میں مضمر تھا۔

بعض مذاہب نے خالق کے تخیل میں بھی مغائرت برتی تھی۔ انھوں نے خدا کو اپنا قرار دے لیا تھا اور یہ کہتے تھے کہ ہم اس کے بیٹے ہیں۔ اسلام نے ان لوگوں کے خیال یا زعم کا ذکر کرتے ہوئے ایک طنزیہ انداز میں اس کی مخالفت کی اور اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کو یہ تلقین نہیں کیا کہ تم ہی اللہ کے سپوت ہو اور بس، بلکہ مسلمانوں کو اقوامِ عالم کے مقابلہ میں یہ کہنے کی تعلیم دی کہ هو ربّنا و ربّکم لنا اعمالنا ولکم اعمالکم (یعنی) وہ ہمارا بھی پروردگار ہے اور تمھارا بھی۔ ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمھارے لیے تمھارے اعمال، اس طرح اسلام نے سب کو مساوات کا درجہ دیتے ہوئے ایک معیارِ امتیاز کا بھی قائم کر دیا اور وہ انسانی کردار ہے۔ اب سابق کے تمام تفوق اور بلندی کے امتیازات مٹ کر ایک نیا معیارِ امتیاز کا قائم ہو گیا اور وہ یہ کہ جو شخص فرائضِ انسانی کو سب سے زیادہ انجام دیتا ہو وہ سب سے بہتر ہے (انّ اکرمکم عند اللہ اتقاکم) اس اصول کے ماتحت غلبہ، طاقت، اقتدار، قوم و قبیلہ کی زیادتی اور تعداد کی اکثریت یہ تمام باتیں کچھ نہ رہیں بلکہ یہ اصول قائم ہو گیا کہ ایک انسان کو دوسرے انسان پر فقط احساسِ فرائض کی بنا پر فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے ماتحت اخلاق پر بہت زور دیا گیا۔ یہاں تک کہ بانیٔ اسلام نے اپنا مقصدِ رسالت ہی یہ قرار دیا اور اعلان کیا انّما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔ دوسری لفظوں میں انّما بعثت لاتمّم حسن الاخلاق یعنی "میری بعثت محض انسان سدھار اور اچھے اخلاق کی تکمیل کی غرض سے ہے"[۱] مسلمانوں سے صاف کہہ دیا گیا کہ یہ خیال نہ کرنا کہ تمھیں تمھارے اعمال کی سزا نہ ملیگی بلکہ جو جیسے اعمال کرے گا ویسا ہی پائے گا۔ مسلمان وہ ہے جو احکامِ خدا کے آگے سرنگوں ہو جائے۔ سرکشی مسلم کی شان نہیں ہے۔ تم اللہ کے دوست جب ہی کہلائے جا سکتے ہو جب اس کے احکام کی تعمیل کرو ورنہ اس کی رحمت کے حقدار نہیں اور نہ امتِ مرحومہ میں شامل ہونیکے قابل۔

---

[۱] طبقات ابن سعد، ج ۱ ص ۱۲۸

معاشرت کے باب میں اس بات پر زور دیا گیا کہ سب انسان ذات اور اصلیت کے لحاظ سے ایک ہی ہیں (خلقکم من نفس واحدۃ)[1] قبائل اور اقوام میں ان کی تقسیم صرف تعارف اور شناخت کے لیے ہے (وجعلناکم شعوباً وقبائل لتعارفوا)[2] مگر فضیلت و بلندی کا تعلق ذات اور قومیت سے بالکل نہیں ہے۔ لا فخر للقرشی علیٰ غیر القرشی ولا للعربی علیٰ غیر العربی[3] فضیلت و بزرگی صرف پرہیزگاری اور تقویٰ یعنی انسانی اعمال اور فرائض کی بجا آوری کے ساتھ وابستہ ہے (ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم)[4] اس کو پیغمبر نے صرف قولاً نہیں بلکہ عملاً بھی دکھایا۔ آپ نے اپنا مؤذن بلال حبشی کو قرار دیا اور جب کسی نے اسے دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی اور کہا "یہ کالے رنگ کا غلام بھی بھلا اس قابل ہے کہ اذان دے؟" تو قرآن کی آیت اُتری (یاایھا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ) یعنی سب آدمی یکساں ہیں، ان میں کوئی فرق نہیں[5] جیسا کہ عبدالحامد صاحب بدایونی نے کہا ہے۔ "اسلام دراصل حکومتِ الٰہیہ کا قیام چاہتا ہے۔ اسلامی حکومت کا دار و مدار عدل و انصاف قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید نے اس بارے میں فرمایا ہے۔ واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل ان اللہ نعما یعظکم بہ (سورۂ نساء) ولا یجرمنکم شنان قوم علیٰ الا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ واتقوا اللہ (مائدہ) یعنی اگر تو غیر مسلمین کے بارے میں فیصلہ کرے تو انصاف سے فیصلہ کر۔ بے شک خدا انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ اسلامی قانون میں شاہ و گدا یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ لیس لاحد علیٰ احد فضل الا بالتقویٰ (مشکوٰۃ) اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام میں سیاست "حصولِ اقتدار کے کامیاب ذرائع کے

[1] اس نے تم کو ایک نفس سے پیدا کیا۔ [2] ہم نے تمھیں مختلف خاندانوں اور قبیلوں میں اس لیے قرار دیا کہ آپس میں شناسائی پیدا ہو۔ [3] قرشی کو غیر قرشی اور عرب کو غیر عرب پر کوئی فخر نہیں۔ [4] تم میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔ [5] اتقان سیوطی مطبوعہ دہلی ص ۳۹

استعمال" کا نام نہیں ہے بلکہ سیاست ملک و ملت کے صحیح نظم و ضبط اور امور خلق کے بہترین طریقہ پر چلانے کا نام ہے۔ اس لحاظ سے سیاسی حکومت مذہبی قیادت سے الگ نہیں ہو سکتی اور اس کی مثال خود حضرت پیغمبر کی ذاتِ گرامی ہے۔

مگر یاد رکھنے کی بات ہے کہ حضرت محمد مصطفےٰ نے اس مکمل اقتدار کے باوجود جس کے ماتحت اعلان کر دیا گیا کہ "ان کو ہر شخص پر خود اس کی ذات سے زیادہ حق اور اختیار ہے" کبھی اپنے کو بادشاہ کہا یا سمجھا جانا پسند نہیں کیا بلکہ اس سے انکار فرمایا۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جوں ہی آپ کے سامنے کھڑا ہوا رعب سے کانپنے لگا۔ آپ نے فرمایا۔ "اپنے آپے میں آؤ۔ میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں۔ میں تو ایک قرشی عورت کا بیٹا ہوں، جو شوربے میں روٹی بھگو کر (غریبانہ کھانا) کھاتی تھی۔"[1]

یہ اس لیے تھا کہ مسلمانوں میں شریعتِ الٰہیہ کی رہبری سے الگ حکمران کا تخیل پیدا نہ ہو اور سوا خداوندی اقتدار کے کسی اقتدار کے آگے مسلمانوں کی گردنیں نہ جھکیں۔

---

[1] طبقات ابن سعد، ج ۱ قسم ۱ ص ۷

چوتھا باب

اسلام کا مزاحم طاقتوں سے تصادم

جہاں تک کہ آئین اور نظام کی تشکیل کا تعلق ہے پیغمبرِ اسلامؐ کی زندگی میں یہ مقصد حاصل ہو گیا اور لاکھوں آدمی اس کے تسلیم کرنے والے اور اس کو حق کہنے والے ہو گئے اور یہ ایک انقلاب کی کوئی کم کامیابی نہیں ہے۔ مگر اس انقلاب پیدا کرنے میں رسولؐ کو کتنی دقتیں درپیش ہوئیں اور کن طاقتوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ یوں تو کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں جو جذبات کے لحاظ سے ہر قدیم شے کے ساتھ الفت رکھتے ہیں اس لیے انھیں ہر انقلاب کے محرک سے "بُغض للّہی" ہوتا ہے۔ بغض للّہی کا مطلب یہ ہے کہ چاہے اس انقلاب کا ان کی ذات سے کوئی تعلق نہ ہو اور انھیں اس سے کوئی نقصان بھی نہ پہنچتا ہو مگر وہ انقلاب سے صرف اس لیے دشمنی رکھتے ہیں کہ وہ انقلاب ہے لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے خود غرضانہ مفاد قدیم رسم و رواج کے ساتھ وابستہ ہیں اور انھیں اس انقلاب سے اپنے منافع کا خون ہوتے ہوئے نظر آتا ہے۔ چنانچہ اسلام جو انقلاب لے کر آیا تھا اور اس نے زندگی کے ہر شعبہ میں جو تبدیلیاں کر دی تھیں ان سے بہت سی قسم کے لوگوں کو ذاتی نقصانات پہنچ رہے تھے۔ یہ نقصانات مالی بھی تھے اور وجاہت و اقتدار کے بھی۔ مثال کے طور پر اسلام کی معاشی تعلیم کہ سود خواری ممنوع ہے، اس سے کیا تمام عرب کے ان مہاجنوں کا دیوالہ نہیں نکل گیا۔ جن کی زندگی ہی حاجت مند مخلوق کا خون چوس کر اپنی ہوس دولت مندی کے پورا کرنے پر تھی۔ پھر اگر صرف یہ ہوتا کہ سود لو نہیں تو یہ ممکن تھا کہ یہ لوگ اسلام نہ قبول کر کے اپنے کو اس حکم کی پابندی سے محفوظ رکھتے مگر وہاں تو یہ تھا کہ نہ سود لو اور نہ سود دو۔ ظاہر ہے کہ سود دینا کام ہوتا ہے کم حیثیت ہی لوگوں کا جو متقاضائے طبعی کشش کے ساتھ اسلام کے غریب پرور تعلیمات کی طرف کھنچے چلے جا رہے تھے۔ اب اگر سرمایہ دار خود اسلام نہ بھی قبول کریں تو کیا فائدہ، جب ان کی زندگی کا دار و مدار جن

لوگوں کے روپیہ پر تھا۔ انھوں نے اسلامی تعلیم پر عمل پیرا ہو کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور وہ اب ایک پیسہ سود کے نام سے دینے پر تیار نہیں۔ اس کے علاوہ اسلام کی یہ تعلیم کہ افراد انسانی میں امتیاز صرف اخلاق حسنہ و فرائضِ الٰہیہ کی بنا پر ہے۔ دوسری کسی حیثیت سے فضیلت و تفوق حاصل نہیں ہو سکتا ان لوگوں کے اقتدار پر کاری ضرب تھی جو اس کے پہلے نسلی تفوق یا مال و دولت یا قوم و قبیلہ کی کثرت کی بناء پر غلبہ و اقتدار کی جائیداد پر قبضہ کیے ہوئے تھے۔ اسلام نے نظریۂ تفوق و امتیاز بدل کر اس ملکیت میں داخل خارج کر دیا۔ اس طرح کے صاحبانِ اقتدار جتنے تھے وہ چونکہ اسلامی معیارِ عزت کے لحاظ سے صِفر کا درجہ رکھتے تھے اس لیے وہ کچھ نہ رہے اور جو لوگ پردیسی یا محتاج یا ان لوگوں کی نظر میں نیچ ذات ہونے کی وجہ سے نگاہ اٹھا کر بات کرنے کے قابل نہ سمجھے جاتے تھے وہ بڑے صاحبِ عزت ہو گئے۔ اس لیے کہ وہ عمل کی کسوٹی پر پورے اُترتے تھے اور پرہیزگاری اور تقویٰ میں درجۂ کمال پر فائز تھے۔ یہ بات ان لوگوں کو ٹھنڈے دل سے کیونکر گوارا ہو سکتی تھی جو اب تک عزت کی مسندوں پر اطمینان کے ساتھ براج رہے تھے اور جو خلقِ خدا کو خدا کے بدلے خود اپنا غلام بنائے ہوئے تھے۔

بنی امیّہ کے لیے ان تمام محرکات کے علاوہ ان کی دیرینہ مخاصمت بنی ہاشم کے ساتھ اور ذاتی رشک و حسد بھی تھا جس کے ماتحت ان کے سرگردہ ابوسفیان نے تقریباً تمام عرب کو حضرت محمد مصطفےٰؐ کے خلاف برانگیختہ کر دیا۔

آپ کو طرح طرح کی تکلیفیں دی جانے لگیں۔ جسم پر پتھر مارے گئے۔ سر پر کوڑا پھینکا گیا۔ نجاستیں ڈالی گئیں اور قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔ یہاں تک کہ جب خطرہ بہت بڑھ گیا تو حضرت کے چچا ابوطالبؑ نے آپ کو اپنے ایک محفوظ مکان میں جو پہاڑ کی گھاٹی میں ایک قلعہ کی صورت پر تھا منتقل کر دیا۔ تمام قریش نے باہم ایک تحریری معاہدہ کیا کہ بنی ہاشم سے نہ صرف شادی بیاہ ترک کر دیا جائے بلکہ ان کے ساتھ خرید و فروخت بھی نہ کی جائے گی۔ اس کے ماتحت محصورین تک ضروریاتِ زندگی، پانی اور کھانا تک پہنچنا تقریباً غیر ممکن بنا دیا گیا تھا۔ یہ واقعہ بعثت کے ساتویں سال کا ہے، جو چار

برس تک قائم رہا۔ چار برس کی طویل مدت کے بعد یہ ترکِ موالات ختم ہوا اور یہ لوگ قلعہ سے باہر نکلے۔ اب کچھ دن تک مخالفتیں ٹھنڈی رہیں مگر پھر ایک ہی سال کے اندر ابوطالب اور خدیجہ دونوں کی وفات[1] کے بعد اس مخالفت نے انتہائی زور پکڑا، یہاں تک کہ اہلِ مدینہ تک اسلام کی روشنی پھیلی اور انھوں نے آپ کو مدینہ کی طرف تشریف لے جانے کی دعوت دی اور آپ نے بہت سے مسلمانوں کو وہاں بھیج دیا۔ تو اب مشرکین نے آپ کو قتل کر دینے کا پورا منصوبہ تیار کر لیا جس کے بعد آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔

مدینہ میں آ کر بھی مخالفین نے چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ ایک طرف تو ان لوگوں کو جو آپ پر ایمان لائے تھے اور مجبوراً مکہ میں رہ گئے تھے طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائی جاتیں۔ دوسری طرف آپ کے جائے پناہ مدینہ منورہ پر فوج کشی کے انتظامات ہونے لگے۔ آپ کو اپنی حفاظت اور اپنے سے زیادہ ان لوگوں کے گھر بار کی حفاظت کے لیے جنھوں نے آپ کو پناہ دی تھی میدانِ مقابلہ میں نکل آنا پڑا۔

سب سے پہلی جنگ جو مدینہ میں آ کر ہوئی بدر کی لڑائی تھی۔ اس موقع پر مسلمان بالکل تیار نہ تھے۔ صرف تین سو تیرہ آدمی[2] جن کے پاس سوار ہونے کو صرف تین گھوڑے تھے[3] اور چند تلواریں۔ مگر بنی ہاشم کی تلوار نے مقابل والوں کے دانت کھٹے کر دیے۔ حمزہ بن عبدالمطلب، عبیدہ بن حارث اور علیؑ بن ابیطالبؑ نے وہ کارہائے نمایاں دکھلائے کہ مخالفوں کی ہمت پست ہو گئی۔ اگرچہ اسلام کو بالخصوص بنی ہاشم کو یہ بڑا نقصان پہنچا کہ عبیدہ اس جنگ میں شہید ہو گئے مگر مکہ والوں کو اور بالخصوص بنی امیہ کو بہت زیادہ نقصانات سے دوچار ہونا پڑا۔ اس میں ابوسفیان کو علیؑ بن ابیطالبؑ کے ہاتھ سے محض اپنے بیٹے حنظلہ کے قتل ہی پر ماتم کرنا نہیں پڑا[4] بلکہ آپ نے اس کے ایک دوسرے بیٹے عمرو کو قید بھی کیا۔[5] اس کے علاوہ اس کی بیوی ہند کو اپنے باپ عتبہ اور اپنے چچا شیبہ اور بھائی ولید کا ماتم کرنا[6]

---

[1] طبری، ج ۱ ص ۲۲۹۔ [2] طبری ج ۲ ص ۲۷۲ [3] ابن ہشام ج ۱ ص ۴۰۰ [4] ارشاد ص ۳۸

[5] ابن ہشام ج ۱ ص ۳۹۴ [6] ابن ہشام ج ۲ ص ۳۷، طبری ج ۲ ص ۲۷۹

پڑا۔ اس کے بعد ابوسفیان نے عہد کیا کہ وہ اس وقت تک نہائے گا نہیں جب تک کہ رسولؐ پر چڑھائی نہ کرے۔ مگر اب مشرکین میں عام طور پر مقابلہ کی ہمت نہ تھی۔ مجبوراً ابوسفیان نے صرف برائے نام اپنی قسم کو پورا کرنے کے لیے دو سو سوار قریش کے اکٹھا کیے اور ان کو لے کر مدینہ کی طرف روانہ ہوا۔ مدینہ کے حدود میں پہنچ کر اس نے رسولؐ کے دو پیرووں کو قتل کر ڈالا اور کھجور کے درختوں کو تباہ کر دیا۔ حضرتؐ مع اپنے پیرووں کے جنگ کے لیے نکل آئے مگر ابوسفیان مع اپنے ساتھیوں کے خوف کھا کر پہلے ہی فرار ہو چکا تھا اور سب بھاگنے کی جلدی میں اپنے سامان کے گٹھروں کو راستے میں پھینکتے گئے تھے۔ اس میں زیادہ تر ستو بندھے ہوئے تھے، جو مسلمانوں کو حاصل ہوئے۔ اسی وجہ سے اس کو "جنگِ سویق" کہتے ہیں کیونکہ عربی میں سویق کے معنی ستو کے ہیں۔[1]

ہجرت کے تیسرے سال وہ نہایت اہم لڑائی پیش آئی جس کو اُحُد کی جنگ کہتے ہیں۔[2] عکرمہ بن ابی جہل، ابوسفیان اور ہند کو اس وقت تک چین کہاں آسکتا تھا جب تک کہ وہ مدینہ والوں سے انتقام نہ لیتے۔ مکہ والوں نے بڑی بڑی تیاریاں کی تھیں۔ ان کی فوج میں قریش کے علاوہ خاندان کنانہ اور باشندگانِ تہامہ بھی شامل تھے۔[3] فوج میں تین ہزار مسلح سپاہی تھے۔[4] ان میں سات سو زرہ پوش تھے۔ ان کے بالمقابل رسولِ خداؐ کے ساتھ سات سو آدمی تھے جن میں صرف سو زرہ پوش تھے اور فوج میں فقط دو گھوڑے تھے۔[5] عکرمہ اور خالد بن ولید دونوں فوج کے افسر تھے اور خاص بات یہ تھی کہ فوج کے عقب میں ابوسفیان کی بیوی ہند مکہ کی دوسری عورتوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں ڈھول بجا بجا کر سپاہیوں کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔ ہند کے اشعار اس موقع کے جو وہ پڑھ رہی تھی کتبِ تاریخ میں محفوظ ہیں۔[6]

ہند کے انتقامی جذبات کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اُحد کی جنگ میں جب رسولؐ کے چچا حضرت حمزہ شہید ہوئے تو ہند جذبۂ انتقام میں اپنی صنف بلکہ انسانیت کی حدود سے گزر گئی۔ اس نے اس بربریت

---

[1] ابن ہشام ج ۲ ص ۵۵ طبری ج ۲ ص ۲۹۹ [2] ابن ہشام ج ۲ ص ۶۵ [3] ابن ہشام ج ۲ ص ۶۸

[4] ابن ہشام ج ۲ ص ۶۹ ...

کا ثبوت دیا کہ جناب حمزہ کا پہلو چاک کرا کے ان کا جگر نکلوایا اور اسے منہ میں رکھ کر چبانے کی کوشش کی۔
اور کشتوں کے کان اور ناک وغیرہ اعضائے جسم کا گلوبند اور سینہ بند بنایا[1] بلکہ بعض راویوں نے تو
یہاں تک بیان کیا ہے کہ اس نے حضرت حمزہ کے جگر کو بھون کر کھا لیا[2] اس سے اُس عناد اور دشمنی
کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جو اس خاندان کے مردوں اور عورتوں کے دلوں میں بنی ہاشم، پیغمبرِ اسلام اور اسلام
کے خلاف پایا جاتا تھا۔

اس جنگ میں اگرچہ عام طور پر مسلمانوں کی جماعت میں بڑی ابتری پیدا ہو گئی تھی مگر آخر میں بنی ہاشم
اور بالخصوص علیؑ بن ابیطالبؑ کی تلوار نے مخالف جماعت کو شکست دی اور وہ ہزیمت خوردہ صورت
میں واپس گئی۔ اب ان کی انفرادی طاقت رسولؐ کے مقابلہ میں ناکافی ثابت ہو چکی تھی۔ اس لیے ۵ھ[3]
میں آخری کوشش انھوں نے یہ کی کہ جتنی جماعتیں ملک عرب میں اسلام کے خلاف ان کو مل سکتی تھیں
سب کو متحد کیا۔ یہاں تک کہ یہود کو ساز باز کر کے اپنے ساتھ ملایا اور اجتماعی طاقت سے دس ہزار
کے لشکر کے ساتھ وہ اس جنگ کے لیے آئے جس کو اسی خندق بندی کی وجہ سے "جنگِ احزاب" کے نام
سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے مقابلہ میں مسلمان تین ہزار تھے مگر فوجِ مخالف کو اس مرتبہ بھی شکست کا
روزِ بد دیکھنا نصیب ہوا اور ان کا مایہ ناز سورما عمرو بن عبدوُد ابن ابی قیس عامری، علیؑ ابن ابیطالبؑ
کے ہاتھ سے تلوار کے گھاٹ اترا[4]۔ ابوسفیان کو بحالِ خستہ و تباہ مکہ واپس جانا پڑا اور اب ہمتِ مقابلہ و
لشکر کشی ختم ہو گئی مگر دل میں ان شکستوں سے جو گھاؤ پڑے تھے وہ کبھی بھی بھر نہ سکتے تھے۔

پیغمبرِ اسلامؐ نے جب کچھ عرصہ تک یہ دیکھا کہ اب مشرکین قریش کی طرف سے کوئی جنگی کارروائی نہیں
ہوتی تو آپ نے ۶ھ میں خانہ کعبہ کی زیارت (عمرہ) کا ارادہ کیا اور مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ
مکہ کی طرف روانہ ہوئے[5]۔ آپ کے پاس بُدنے (قربانی کے اونٹ) تھے[6] جس سے ظاہر تھا کہ آپ لڑائی
کے لیے نہیں جا رہے ہیں۔ مگر جب قریش کو رسولؐ کے آنے کی خبر پہنچی تو وہ خالد بن ولید کی قیادت میں کراع الغمیم"

[1] ابن ہشام ج ۲ ص۴۹ طبری ج ۳ ص۲۳ [2] استیعاب ج ۲ ص۴۸۶ طبری ج ۳ ص۴۳ [3] ابن ہشام ج ۲ ص۱۵۵
[4] ۱۷۱، ہشام ج ۲ ص۲۲۶ طبری ج ۳ ص۴۴ [5] ابن ہشام ج ۲ ص۲۱۲ طبری ج ۳ ص۷۱ [6] طبری ج ۳ ص۷۲

مقام تک رسولؐ کا راستہ روکنے کے لیے نکل آئے۔

ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی ہمتیں اس کے قبل کی حاصل شدہ پے در پے فتوحات سے بڑھی ہوئی تھیں
اور سامنے وہی شکست خوردہ جماعت تھی جو اس وقت جنگ کے لیے کوئی تیاری بھی نہ کر سکی تھی اس لیے
یہ بہت آسان تھا کہ آپ مقابلہ کا حکم دے دیتے اور فاتحانہ صورت سے مکہ میں داخل ہوتے مگر پیغمبرِ اسلامؐ
کو امن پسندی کا ثبوت دینا تھا۔ جونہی گرد و غبار اٹھتا نظر آیا آپ نے فرمایا، اس راستے کو چھوڑ دو کسی
دوسرے راستے سے آگے نکل چلو۔ چنانچہ دائیں جانب کا رُخ کیا گیا اور آپ "حمض" کی پشت پر سے
"ثنیۃ المرار" ہوتے ہوئے حدیبیہ کو جو راستہ جاتا ہے ادھر متوجہ ہوئے[1]

آپ کی اس امن پسندی کے مظاہرہ سے جماعت مخالف کو اس حد تک احساس ہوا کہ وہ بھی
واپس چلی گئی اور اس نے اب نامہ و پیام کا سلسلہ شروع کیا۔ چنانچہ عروہ بن مسعود ثقفی نے آکر گفتگوئے
صلح کا آغاز کیا اور حضرت رسول خداؐ کی صلح پسندانہ باتوں سے ایسی خوشگوار فضا قائم ہوئی کہ سہیل بن
عمرو قریش کا نمائندہ بنا کر گفتگوئے صلح کے لیے حضرت کے پاس بھیجا گیا اور اس نے اپنی جماعت
کے مطالبات پیش کر دیے۔ یہ مطالبات سب مشرکین کے حق میں تھے اور ان کے ذریعہ سے بظاہر
پیغمبرِ اسلام کو دبایا جا رہا تھا مگر آپ نے ان سب باتوں کو منظور فرما لیا اور صلحنامہ مرتب ہو گیا۔ اس
صلح نامہ کے شرائط حسب ذیل تھے:۔

۱۔ رسولؐ اس سال مع اپنے متبعین کے بغیر زیارت کیے ہوئے واپس جائیں۔
۲۔ دس سال تک آپس میں جنگ نہ ہو۔
۳۔ جو شخص قریش میں سے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر رسول اللہؐ کے پاس چلا جائے اس
کو آپ واپس کر دیں گے مگر جب آپ کے پاس سے کوئی نکل کر قریش کے پاس چلا جائے تو
قریش واپس نہ کریں گے۔
۴۔ جو قبیلہ رسولؐ کا حلیف ہونا چاہے وہ آپ کے ساتھ معاہدۂ دوستی کر لے اور جو قبیلہ

[1] طبری ج ۳ ص۷۳

قریش کے ساتھ معاہدۂ دوستی کرنا چاہے وہ ان کے ساتھ ہو جائے۔

۵۔ آئندہ سال مسلمان مکّہ کی زیارت کے لیے آسکیں گے اس طرح کہ باشندگان مکّہ تین دن کے لیے مکہ کو خالی کردیں گے مگر مسلمانوں کو لازم ہوگا کہ تین دن کے اندر مکہ سے باہر نکل جائیں اور ایک آدمی بھی تین دن کے بعد مکہ میں رہنے نہ پائے۔

۶۔ مسلمان اپنے ساتھ اس طرح کے اسلحہ لاسکیں گے جیسے مسافر اپنے ساتھ رکھتے ہیں یعنی تلواریں نیام کے اندر رکھی ہوئی[1]

یہ ایسی غیر متوازن شرطیں تھیں کہ پیغمبرِ اسلامؐ کے اکثر ساتھ والوں میں جو رسولؐ کے بلند مصالح کی تہ تک پہنچنے سے قاصر تھے۔ شدید بے چینی پیدا ہوگئی تھی۔ تاریخ کے الفاظ یہاں تک ہیں کہ "لوگوں کے دلوں میں امرِ عظیم پیدا ہوا یہاں تک کہ قریب تھا کہ وہ ہلاکت میں مبتلا ہو جائیں،" اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے عقائد میں تزلزل ہوگیا، ایسا کہ قریب تھا کہ وہ اسلام سے منحرف ہی ہو جائیں[2]

اسی کا نتیجہ تھا کہ جب پیغمبرِ خداؐ نے معاہدہ کی تکمیل کے بعد اصحاب سے فرمایا کہ اٹھو، قربانیاں کرو اور پھر سروں کے بال منڈوا کر واپس چلو۔ تو عالم یہ تھا کہ رسولؐ حکم دے رہے تھے اور مجمع کی اکثریت خاموش تھی۔ کوئی تعمیل کے لیے اٹھتا نہ تھا۔ یہاں تک کہ جب حضرتؐ نے ان کی طرف سے بے اعتنائی اختیار کر کے خود جا کر قربانی کی اور بال منڈوائے تو مجبوراً دوسرے لوگ بھی کھڑے ہوئے اور سروں کے بال مونڈنا یا تراشنا شروع کیے مگر رنج اور صدمہ کا یہ عالم تھا کہ معلوم ہوتا تھا ایک دوسرے کو قتل کر رہا ہے[3]

لیکن رسولؐ نے اپنے ساتھیوں کے ان جذبات کا کوئی لحاظ نہ کیا اور کفّار کے ان جابرانہ شرائط کو منظور کر کے واپسی اختیار فرمائی۔ اس خیال سے کہ اگر اس موقع پر جنگ کر کے مکہ کو فتح کیا جاتا تو کہنے کو ہو جاتا کہ رسولِ اسلامؐ چڑھائی کر کے آئے۔ اس طرح جارحانہ حملہ کا الزام آپ پر عائد کیا جاتا

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۱۶۔ طبری ج ۳ ص ۷۹۔ [2] طبری ج ۲ ص ۷۹
[3] طبری ج ۳ ص ۸۰

لہٰذا آپ نے اس کا موقع نہ دیا اور صلح کے شرائط کی پابندی اس حد تک فرمائی کہ ابھی یہ تحریر خشک نہ ہونے پائی تھی کہ خود سہیل بن عمرو (جو مشرکین کی طرف سے نمائندۂ صلح تھا) کا لڑکا جو پہلے سے مسلمان ہو چکا تھا اور اسے صرف اسلام لانے کی وجہ سے گھر والوں نے لوہے میں جکڑ دیا تھا۔ اس وقت موقع پا کر پابہ زنجیر ہونے ہی کی حالت میں وامحمّداہ، وامحمّداہ کہتا ہوا آیا اور اپنے کو رسولؐ کے سامنے ڈال دیا۔ سہیل نے جو یہ دیکھا تو وہ کھڑا ہو گیا، اسے طمانچہ لگایا اور گریبان پکڑ کر کھینچتا ہوا لے چلا۔ اس نے پکار کر آواز دی "کیوں مسلمانو! کیا میں پھر مشرکین ہی کی طرف واپس کر دیا جاؤں گا کہ وہ مجھے دین سے منحرف کرنے کی کوشش کریں،" مگر حضرتؐ نے کوئی تعرض نہیں فرمایا اور کہا "اے ابوجندل! صبر کر یہ چند دن کی تکلیف ہے۔ اللہ تیرے لیے اور تمام کمزور مسلمانوں کے لیے جو مشرکین کے پنجہ میں گرفتار ہیں کوئی کشائش کی صورت پیدا کرے گا۔ اس وقت تو ہم نے اس قوم کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیا ہے اور اس معاہدہ کی مخالفت ہم نہیں کریں گے[1]"

غرض پیغمبرِ اسلامؐ نے ان غیر مساویانہ شرائط پر صلح کر کے مکہ سے واپسی اختیار کی اور دوسرے سال معاہدہ کے مطابق مکہ کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے۔ مشرکین نے تین دن کے لیے شہر خالی کر دیا اور رسولؐ اپنے ساتھیوں سمیت مکہ میں داخل ہوئے۔ مراسم زیارت بجا لائے اور پھر حسب معاہدہ تین دن کے بعد مکّہ کو چھوڑ دیا اور مدینہ واپس چلے گئے[2] مگر مکہ والے اس کے بعد معاہدہ کے دوسرے دفعات عدم تعرض پر قائم نہیں رہے۔

معاہدہ میں قبائل کو جو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ جس کے ساتھ چاہیں شریک ہو جائیں۔ اس کے ماتحت قبیلۂ خزاعہ پیغمبرِ اسلامؐ کا حلیف ہوا تھا اور بنی بکر نے مشرکین کے ساتھ حلیف ہونے کا اعلان کیا تھا چونکہ ان دونوں قبیلوں میں قدیم عداوت تھی اس لیے دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف تیار رہتے تھے۔ مگر اب جو ان میں ہر ایک ایک جانب معاہدہ کے رو سے منسلک ہو

---

[1] طبری ج ۳ ص ۷۹-۸۰۔ [2] ابن ہشام ج ۲ ص ۲۴۹-۲۵۰۔ طبری ج ۳ ص ۱۰۰-۱۰۱۔ بخاری ج ۲ ص ۳۶۔ مسلم ج ۲ ص ۱۰۵

گیا اور یہ طے پاگیا کہ دس برس تک جانبین میں جنگ نہ ہوگی تو خزاعہ کے لوگ مطمئن ہوگئے۔ انھوں نے اسلحہ جسم سے اتار دیے اور جنگ کی تیاریاں ترک کر دیں۔ بنی بکر نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور بنی خزاعہ پر اس وقت جب کہ وہ ایک چشمہ کے کنارے مقیم تھے حملہ کر دیا اور بہت سے لوگوں کو قتل کر ڈالا۔[1]

قریش کے آدمیوں نے بھی علانیہ نہیں تو خفیہ بنی بکر کو مدد پہنچائی اور وہ بھی خزاعہ کی تباہی کے شریک ہوئے۔

مجبوراً قبیلۂ خزاعہ کا ایک آدمی جس کا نام عمرو بن سالم تھا فریاد کرتا ہوا مدینہ گیا اور اس وقت جب پیغمبرِ خداؐ اصحاب کے درمیان مسجد میں تشریف رکھتے تھے اس نے انتہائی دردانگیز اشعار میں اپنے قبیلہ کی رودادِ غم سنائی جس کے آخر میں حسب ذیل مضمون نظم تھا:

"اے خدا کے رسولؐ! آپ کو معلوم ہو کہ قریش نے آپ سے عہد شکنی کی۔ بنی بکر نے ہمارے قبیلہ پر چشمہ کے کنارے کمین گاہ سے حملہ کر دیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہمارا کوئی فریادرس نہیں ہے۔ اگر ہم جنگ کے لیے تیار ہوتے تو ان کی کیا مجال تھی کہ وہ ہم سے مقابلہ کرتے۔ وہ تعداد میں بھی کم اور طاقت میں بھی ہمارے مقابلہ میں ہمیشہ سبک ثابت ہوئے۔ مگر ہم تو نمازِ شب میں مصروف تھے۔ انھوں نے رکوع و سجود کی حالت میں آ کر ہم کو قتل کر دیا۔"

ان اشعار کے پڑھنے کے دوران میں آپ کی ہمدردی کے تاثرات اتنے شدید ہوگئے تھے کہ آپؐ نے جواب میں کوئی طویل کلام سننے کے انتظار کی زحمت بھی دینا نہ چاہی اور اشعار ختم ہوتے ہی آپ کی زبان سے جو جملہ نکلا وہ یہ تھا کہ "قد نصرت یا عمرو بن سالم"۔ اس کے نتیجہ میں آپ اتمامِ حجت کے درمیان کچھ مراحل طے کرنے کے بعد مسلمانوں کو لے کر مکہ معظمہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اب تیور بدلے ہوئے تھے۔ مشرکین میں طاقتِ مقابلہ تو اب تھی ہی نہیں۔ انھوں نے ہتھیار

۱۔ ابن ہشام ج ۲ ص ۲۶۔ طبری ج ۳ ص ۱۱۱

ڈال دینے مناسب سمجھے اور اسی مجبوری کے عالم میں ابوسفیان نے بھی ظاہری طور پر اسلام قبول کر لیا۔

جس کا واقعہ یہ ہے کہ عباس بن عبدالمطلب اور ابوسفیان میں پرانے زمانے کی دوستی تھی۔ اس رات کو جب رسولؐ مکہ کے قریب پہنچ چکے تھے اور مشرکین پر ہراس چھایا ہوا تھا ابوسفیان معہ چند آدمیوں کے رسولِ خداؐ کی نقل و حرکت کا حال معلوم کرنے کے لیے شہر سے باہر نکلا۔ اسی وقت عباس اس فکر میں نکلے تھے کہ اگر قریش نے پیغمبرِ خداؐ کی مخالفت برقرار رکھی تو یہ سب آج مارے جائیں گے۔ ابوسفیان کو وہاں پا کر انھوں نے کہا: کچھ خبر ہے؟ رسولؐ دس ہزار مسلمانوں کی جمعیت کے ساتھ آئے ہیں، تم ان کا مقابلہ ہرگز نہیں کر سکتے۔ ابوسفیان نے کہا پھر آپ کی کیا رائے ہے؟ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ انھوں نے کہا: تم میرے ساتھ اونٹ پر بیٹھ جاؤ اور رسولؐ کے پاس چل کر امان حاصل کر لو ورنہ اگر تم اُن کے ہاتھ آگئے تو بغیر قتل کیے نہ چھوڑیں گے۔ ابوسفیان کو یہ ذریعہ غنیمت معلوم ہوا وہ ناقہ پر پیچھے بیٹھ گیا اور عباس اسے لیے ہوئے پیغمبرؐ کے پاس حاضر آئے۔ رسولِ خداؐ سے اس کے لیے امان چاہی۔ پیغمبرؐ نے فرمایا کہ اچھا اس وقت امان ہے۔ صبح کو انھیں پھر میرے پاس لائیے گا۔ حسب الحکم صبح کو عباس نے ابوسفیان کو حاضر کیا۔ حضرتؐ نے اس کو اسلام کی دعوت دی۔ وہ پس و پیش کرنے لگا۔ عباس نے کہا اسلام قبول کرو نہیں تو جان کی خیر نہیں۔ یہ سن کر ابوسفیان نے اسلام قبول کیا۔[1]

بخاری کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابوسفیان اور اس کے ساتھی جب معلومات حاصل کرنے باہر نکلے تو اتفاق سے لشکرِ اسلام کے پہرہ داروں کے ہاتھوں میں گرفتار ہو گئے اور رسولؐ کی خدمت میں حاضر کیے گئے۔ اس وقت ابوسفیان نے اسلام قبول کیا۔[2]

پیغمبرِ خداؐ کی یہ وسعتِ قلبی تھی کہ آپ نے ابوسفیان کی نہ صرف جان بخشی فرمائی بلکہ اعلان کر دیا کہ جو ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے لے اسے بھی امان ہے اور جو مسجد الحرام میں داخل ہو جائے اسے امان ہے اور جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جائے وہ بھی امان میں ہے۔[3] دوسری روایت

۱۔ طبری ج ۳ ص ۱۱۶۔ ۲۔ بخاری ج ۳ ص ۲۹۔ ۳۔ طبری ج ۳ ص ۱۱۶۔

ہیں مسجد الحرام میں داخلہ کے بجائے یہ ہے کہ جو ہتھیار ڈال دے اسے امان ہے[1]۔ اور مکہ میں داخل ہونے کے بعد تو آپ نے سب ہی کی جان بخشی کر دی۔ آپ نے مکہ کے آدمیوں سے جو آپ کے سامنے تھے پوچھا۔ کیوں تمھارا کیا خیال ہے میں تمھارے ساتھ کیا سلوک کروں گا؟ انھوں نے کہا ہمیں نیکی ہی کا گمان ہے۔ آپ ہمارے فیاض بھائی ہیں اور فیاض بھائی کے بیٹے ہیں۔ فرمایا۔ اذھبوا انتم الطلقاء
"جاؤ تم سب کو میں نے چھوڑ دیا[2]"

اس کے بعد ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے بھی جس کے انتقامی جذبات کی تصویر جنگِ اُحد میں سامنے آچکی ہے اسلام قبول کیا اور جتنے سخت اور متعصب اکابر قریش اس وقت باقی تھے سب ہی مسلمان ہوگئے[3]۔

مگر مذکورہ واقعات سے ہر انسان یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ بے بس ہو جانے کے بعد آدمی سر جھکا سکتا ہے، ہاتھ روک سکتا ہے، ہتھیار ڈال سکتا ہے، زبان بند کر سکتا ہے لیکن اپنے دل میں تبدیلی نہیں پیدا کر سکتا۔ اپنے قلب میں یقین کی صفت پیدا نہیں کر سکتا اور اپنی نفرت کو محبت سے تبدیل نہیں کر سکتا۔ وہ نفرت و دشمنی جو اُن حدود تک پہنچ چکی تھی جن کا مظاہرہ گزشتہ واقعات سے ہو چکا ہے کیا اس سب کے بعد محبت و عقیدت سے تبدیل ہو سکتی ہے؟ عام اصولِ فطرت اور واقعات کی رفتار کے مطابق یہ بات غیر ممکن معلوم ہوتی ہے۔ عام فطرت کے مطابق صرف اتنا سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ دشمن جو اب تک پھنکارے مارتے ہوئے اژدہے کی طرح سامنے موجود تھا اب مارِ آستین بن کر خفیہ ریشہ دوانیوں کے لیے آزاد ہو گیا اور کوئی شبہ نہیں کہ دشمن موجودہ صورت میں پہلی صورت سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ یہی خیال تھا ان کے بارے میں اسلام کے نقاد حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کا۔ آپ نے فرمایا ہے مااسلموا ولکن استسلموا۔
"یہ لوگ حقیقتاً اسلام نہیں لائے تھے بلکہ اسلام کے سامنے انھوں نے ہتھیار ڈال دیے تھے اور بس"

---

[1] احمد مسند ج ۲ ص ۱۰۴ [2] طبری ج ۳ ص ۱۲۰ [3] طبری ج ۳ ص ۱۲۱

پانچواں باب

حسینؑ بن علیؑ کی ولادت اور ابتدائی زندگی

۳ھ - ۱۱ھ

حضرت محمد مصطفیٰؐ کو مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئے ہوئے تیسرا برس تھا[1] کہ ۵ شعبان کو حسینؑ بن علیؑ کی ولادت ہوئی[2]۔

حضرت فاطمہ زہراؑ اپنے پدر بزرگوار رسالتمآبؐ کی خدمت میں مولود کو لے کر حاضر ہوئیں۔ حضرت نے حسینؑ نام رکھا اور ایک مینڈھے کی قربانی کے ساتھ عقیقہ کیا[3]۔

اب پیغمبرِ اسلامؐ کی گود جو اسلام کی تربیت کا گہوارہ تھی ان دو بچوں کی پرورش کا مرکز بنی، ایک حسنؑ اور دوسرے حسینؑ۔

ان کی آنکھوں کے سامنے ایک طرف نانا کا اسوۂ حسنہ تھا جو بانیٔ اسلام تھے، دوسری طرف باپ جو مجاہد و محافظِ اسلام تھے اور تیسری طرف ماں جو طبقۂ خواتین کے لیے تعلیماتِ پیغمبرؐ کی عملی ترجمان بننے کے لیے پیدا ہوئی تھیں۔ بقول اقبال ؎

مزرعِ تسلیم را حاصل بتولؑ　　مادراں را اسوۂ کامل بتولؑ

مسجد میں پانچوں وقت نماز جماعت پیغمبرؐ کے بصیرت آفریں مواعظ اور خطبے، مسلمانوں کا ذوق و شوق اور جوش و خروش اور گھر میں رات دن عبادت و ذکرِ الٰہی کی آوازیں، تکبیر کی صدائیں، وحی کی آیتیں، غزوات کے تذکرے، اسلام کو ترقی دینے کے مشورے اور پھر غریبوں کی خبرگیری کمزوروں کی دستگیری اور مظلوموں کی دادرسی بس ہر وقت یہی ذکر ہے یہی فکر۔ یہی قصے ہیں اور یہی

---

[1] کافی ج ۱ ص ۳۹۴ [2] مقاتل الطالبین ص ۵۴۔ ارشاد [3] ارشاد

کہانیاں۔ ایک طرف فطرت کے مخصوص عطیے، دوسری جانب یہ نورانی اور روحانی ماحول اور اس پر تربیت پیغمبرؐ ایسے بلند معلم کی جن کا مقصدِ رسالت ہی قرآن کے اعلان کے مطابق تزکیۂ نفوس اور تعلیم کتاب و حکمت تھا[1] اور آپ نے خود بھی اعلان کیا تھا کہ مکارم اخلاق کی تکمیل میرا اصلی نصب العین ہے۔ پھر کیونکر ممکن تھا کہ رسولؐ اپنے اہل بیت کی تربیت میں اس فرض کو نظر انداز کر دیتے جو بحیثیت معلمِ اخلاق کے بحیثیت بزرگ خاندان کے اور بحیثیت ایک پیغمبر کے آپ پر عائد ہوتا تھا چنانچہ حضرت نے اس کمسنی ہی کے عالم میں ان بچوں کو اپنے اخلاق و اوصاف کا نمونہ بنا دیا اور ان آئینوں میں جو قدرت کی طرف سے کمال کا جوہر لے کر آئے تھے اپنی سیرت کا پورا عکس اتار دیا۔

انہی ذات و صفات کی مخصوص بلندیوں کا یہ نتیجہ تھا کہ رسولؐ ان اپنے نواسوں کے ساتھ غیر معمولی محبت رکھتے تھے جس کے مظاہرات تاریخ اور حدیث کی کتابوں میں یکساں طور پر درج ہیں۔ اس کے علاوہ آپ دوسروں کو بھی ان سے محبت کی تاکید فرماتے تھے۔ آپ کا قول تھا کہ جس نے حسنؑ و حسینؑ سے محبت رکھی، اس نے مجھ سے محبت رکھی اور جس نے ان کو دشمن رکھا اس نے مجھے دشمن رکھا[2] آپ اللہ کو گواہ کرتے تھے کہ میں ان سے انتہائی محبت کرتا ہوں[3] مگر ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ حسینؑ اپنے نانا کی بلند سیرت، فرائض کے بارے میں اہتمام اور اسلام کے متعلق آپ کے انہماک کو دیکھتے ہوئے یہ مشاہدہ کرتے تھے کہ رسول اللہ ہم کو بہت چاہتے ہیں مگر ہم سے زیادہ آپ اپنے دین یعنی اسلام اور اس کے آئین و شریعت کو چاہتے ہیں اس لیے اگر اس دین اور شریعت پر کوئی وقت پڑے تو پیغمبرؐ تیار ہوں گے کہ ہم کو اس پر نثار کر دیں۔

<u>۱۰ھ میں نجران (یمن) کے عیسائیوں کے ساتھ ایک طرح کے روحانی مقابلہ کا موقع آیا</u>

[1] قرآن کریم سورۂ بقرہ آیت ۱۲۹ و ۱۵۱۔ آل عمران آیت ۱۶۵۔ جمعہ آیت ۲
[2] سنن ابن ماجہ ج ۱ ص ۳۳۔ [3] صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۸۲

جس کا نام "مباہلہ" ہے یعنی دونوں فریق اللہ سے دعا کریں کہ جھوٹے پر عذاب نازل ہو۔ اس موقع پر رسولؐ تشریف لے گئے تو اس طرح کہ ہاتھ میں علیؑ بن ابی طالبؑ کا ہاتھ تھا، حسنؑ و حسینؑ آگے آگے تھے اور فاطمہ زہراؑ پیچھے آ رہی تھیں۔ نجران والے یہ نورانی منظر دیکھ کر مرعوب ہوئے اور خراج دینے کے لیے آمادہ ہو گئے[1] ظاہر ہے کہ پیغمبرِ خدا اس مہم کو تنہا سر کر سکتے تھے۔ پھر قرآن کی تصریح[2] کے مطابق رسول اللہؐ اپنے اہلبیت کو ساتھ لے جانے پر کیوں مامور ہوئے؟ اس کا مقصد ایک طرف حق کے کامل نمایندوں کا خلق سے تعارف تھا تو دوسری طرف تعلیم و تربیت کا انداز بھی تھا۔ گویا ابھی سے خاندانِ رسولؐ کی ان ہستیوں پر ذمہ داری کا بار ڈالا جا رہا تھا کہ ضرورت کے وقت حفاظتِ اسلام کی ان ہی سے امید ہے۔ رسولؐ ان میں سے ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر کہہ رہے تھے کہ دیکھو آج تو میں خود موجود ہوں۔ میں تم کو اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں لیکن اگر کسی وقت میں موجود نہ ہوں تو تم اسی طرح حفاظتِ اسلام کے لیے نکل کھڑے ہونا جس طرح میں نکلا ہوں۔ آج کے اس عمل سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اسلام کی نصرت اور خدمت کے موقع پر مرد، عورت، جوان، بچہ کوئی مستثنیٰ نہیں ہو سکتا اور ضرورت پر ہر ایک کو اس مقصد میں صرف ہونا لازم ہے۔ سب سے کم سن اس جماعت میں حسینؑ تھے اور ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ جیسے ان کا اس موقع پر ساتھ لانا قدرت کی طرف سے اس مستقبل کی تمہید ہے کہ انہی کو عملی طور پر دوبارہ اس مثال کے پیش کرنے کا موقع ملے گا جسے آج پیش کیا گیا ہے۔

حضرت محمد مصطفےٰؐ سے بڑھ کر کوئی شخص جوہر شناس نہیں ہو سکتا تھا۔ آپ جانتے تھے کہ آپ کے تعلیمات کی حفاظت کن کے ذریعہ سے ہو گی۔ اس لیے مختلف صورتوں سے اپنی امت کو ہدایت دی کہ میرے اہلبیت کی پیروی کرتے رہنا۔ کبھی فرمایا کہ میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑتا ہوں۔ جب تک تم ان سے تمسک رکھو گے گمراہی سے محفوظ رہو گے۔ ان میں سے ایک قرآن ہے اور دوسرے میرے اہل بیت[3] اور کبھی فرمایا کہ میرے اہلبیتؑ کی مثال کشتیٔ نوح کی سی ہے، جو اس کشتی پر سوار ہوا اس نے نجات پائی اور جو روگرداں ہوا وہ دریائے ہلاکت میں غرق ہوا[4]

[1] ارشاد ص ۸۷ [2] سورۂ آل عمران آیت ۶۱ [3] مسند احمد حنبل [4] معارف ابن قتیبہ

خصوصیت کے ساتھ اپنے دونوں نواسوں کے بارے میں کبھی فرمایا "حسنؑ و حسینؑ جوانانِ اہلِ بہشت کے سردار ہیں"[1] اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کا کردار اتنا بلند ہے اور رہیگا کہ ان کی سیرت زندگی کی عملی حیثیت سے تقلید ہی رضائے الہٰی کا سبب بن سکتی ہے اور کبھی فرمایا کہ "یہ دونوں میرے فرزند امام (واجب الاطاعت) ہیں خواہ کھڑے ہوں اور خواہ بیٹھے رہیں"[2] آئے گا ایک مستقبل جب ایک ان میں سے صلح کر کے بیٹھا ہوگا اور ایک جہاد میں کھڑا ہوگا۔ پیغمبرِ اسلامؐ کے ارشاد سے دونوں کے طرزِ عمل کے اپنی اپنی جگہ صحیح ہونے پر روشنی پڑے گی۔

اس کے ساتھ خاص امام حسینؑ کے بارے میں جو حدیثیں ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں[3]۔ یعنی میرا کام اور میرا نام دنیا میں حسینؑ کی بدولت قائم رہے گا۔ اس کے علاوہ بکثرت حدیثیں ہیں جو فضائل و مناقب کی کتابوں میں درج ہیں افسوس کہ حسینؑ کے لیے اس لطف و محبت، بے پایاں سکون اور اطمینان کی عمر طولانی نہیں ہو سکی۔ ابھی آپ کا سن سات برس کا بھی پورا نہ ہوا تھا کہ ربیع الاول سنہ ۱۱ھ میں[4] حضرت محمد مصطفےٰؐ کی وفات ہو گئی اور حسینؑ رسول اللہؐ کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے۔

---

[1] ابن ماجہ ج ۱ ص ۲۶

[2] ارشاد ص ۲۰۴

[3] ابن ماجہ ج ۲ ص ۳۳

[4] الکافی ج ۱ ص ۲۷۵، طبری ج ۳ ص ۲۰۷

چھٹا باب

امام حسینؑ کی زندگی کا دوسرا دور نانا کی وفات کے بعد سے باپ کی شہادت تک

سنہ ۱۱ھ - سنہ ۴۰ھ

حضرت رسولؐ کی وفات تمام خاندان کے لیے ایک بڑا روح فرسا حادثہ تھی۔ آپ کے اخلاق و اوصاف نے دوست اور دشمن کے دل کو مسخر کر لیا تھا اس لیے آپ کے دنیا سے اٹھ جانے کا احساس ہر فرد بشر کو موجود تھا اور اسلامی گروہ کا ہر فرد جتنا تعلق پیغمبرؐ سے رکھتا تھا، اس اعتبار سے غیر معمولی طور پر متاثر ہو رہا تھا۔

پھر خاص اہل بیتؑ کے غم و الم کا اندازہ کہاں کیا جا سکتا ہے خصوصاً حسینؑ جن کے ساتھ پیغمبرؐ کی شفقت کا انداز ہی ایک نرالا تھا، وہ نانا جو اپنی گود میں بٹھاتا تھا، سینہ پر لٹاتا تھا، کاندھے پر چڑھاتا تھا، جو ذرا سی بھی خاطر شکنی حسینؑ کی گوارا نہ کرتا تھا، آج حسینؑ آنکھیں پھرا پھرا کر چاروں طرف دیکھتے تھے اور وہ شفیق و مہربان نانا نظر نہ آتا تھا۔

یہ بھی کھلی ہوئی بات ہے کہ پیغمبرؐ کی حیات میں ان کی غیر معمولی محبتوں کو دیکھ کر نیز ان کے ان متواتر اعلانات کی وجہ سے کہ جو مجھ سے محبت رکھتا ہے اسے حسینؑ سے محبت کرنا چاہیئے، عام مسلمان جو بھی رسولؐ کے ساتھ عقیدت اور محبت کا دم بھرتے تھے اور ان کے پسینے پر خون بہانے کا دعویٰ رکھتے تھے پیغمبرؐ کے سامنے اُن کے اِن فرزندوں کے ساتھ انتہائی لطیف ترین جذبات محبت و نیازمندی کا اظہار کرتے تھے اور اگر ذرا سا بھی اس میں کمی کا شائبہ پیدا ہوتا تھا تو پیغمبرؐ کی تیوریوں پر بل دکھائی دینے لگتے تھے۔ ایک کھلا ہوا ثبوت اس کا اس واقعہ سے ملتا ہے جب رسولؐ حسن مجتبیٰؑ کو کاندھے پر سوار کیے ہوئے تھے اور ایک صحابی نے کہہ دیا کہ "اے صاحبزادے کتنا اچھا مرکب ہے

تمہارا۔" رسولؐ نے فوراً ٹوک دیا اور فرمایا "یہ سوار بھی تو کتنا اچھا ہے"[۱]۔ یہ باتیں ایسی نہ تھیں جن کے بعد مزاج نبوت میں کچھ بھی درخور رکھنے والے مسلمان یا آپ کے چشم و ابرو پر چلنے والے نیازمندان صاحبزادوں کی خاطرداری اور ان کے ساتھ اظہارِ محبت میں ذرا بھی فروگزاشت کرتے۔ اس طرح یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں ہے کہ اس دور میں حسینؑ ایک چراغ تھے جس کے گرد پروانے طواف کرتے تھے یا ایک آفتاب جس کے گرد ستارے چکّر لگاتے تھے۔ عقیدت کی ایک دنیا ان کے قدموں پر نثار ہوتی تھی اور محبت کا ایک آسمان تھا جو اُن کے سر پر سایہ فگن تھا مگر دنیا ایک حال پر نہیں رہتی۔ وہ انقلابات کا مجموعہ ہے۔ آج وہ مرکز جسکی مقناطیسی کشش دنیا کو جذب کیے ہوئے تھی قبر میں پہنچ چکا تھا۔ وہ ایک کیا گیا کہ حسینؑ کی دنیا بالکل بدل گئی۔ وہ ماحول بھی بالکل تبدیل ہوگیا جو آپ کے سامنے رہا تھا۔ صبح ہوئی اور رسولؐ نے دروازہ پر آکر آواز دی[۲] الصّلوٰۃ، الصّلوٰۃ۔ انّما یریداللّٰہ لیذ ھب عنکم الرّجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا (یعنی) اٹھو نماز کا وقت آگیا اور پھر یہ قرآن کی آیت[۳] پڑھتے تھے (جو آیتِ تطہیر کے نام سے مشہور ہے یعنی) "اللہ کو منظور یہی ہے کہ اے اہل بیتؑ تم سے ہر طرح کی نجاست کو دور رکھے اور تم کو پاک رکھے جو پاک رکھنے کا حق ہے۔" سب فوراً اٹھ بیٹھے باپ اور بھائی کی طرح حسینؑ نے بھی فوراً وضو کیا۔ مسجد میں پہنچے۔ مسلمانوں کا اجتماع ہوا۔ پیغمبرؐ نے نماز پڑھائی۔ پھر ظہر، عصر، مغرب اور عشا ہر وقت یہی سماں۔ نمازوں کے بعد یا پہلے اور ضرورت کی صورت میں مختلف اوقات پر پیغمبرؐ کے خطبے۔ شریعتِ اسلام کی تعلیم حاصل کرنے والوں کا ہجوم۔ قبائل عرب اور سلاطین دنیا کے وفود اور سفراء کا دور۔ مختلف جماعتوں کی سرگرمیوں کا تذکرہ اور اس کے مدافعتی انتظامات، دیوانی اور فوجداری کے مقدمات کا پیش ہونا، گواہوں کے بیانات، بحث اور جرح اور مقدمات کا فیصلہ۔ مجرموں کی سزائیں۔ زکوٰۃ و خمس اور اموالِ غنیمت کا آنا اور مقررہ اصول و قواعد کے مطابق تقسیم۔ غرض یہ کہ دین اور دنیا کے تمام مسائل اس ایک نقطہ پر مجتمع نظر آتے تھے۔ حسینؑ اپنے نانا کے پاس تقریباً ہر وقت موجود رہتے تھے اور آنکھ

۱؎ صواعق محرقہ ص۸۳ ۲؎ استیعاب ج ۲ ص۶۱۵ ۳؎ سورۂ احزاب آیت ۳۳۔

کھول کر اسی عالم سے روشناس ہوئے تھے۔ اب پیغمبرؐ کی وفات کے بعد یہ تمام سماں آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔ انقلاب اور عظیم الشان انقلاب۔

افسوس ہے کہ رسولؐ کی خلافت کا مسئلہ اتنا اختلافی بن گیا کہ آج تک اسکی بنیاد پر شیعہ اور سنّی کا تفرقہ قائم ہے۔ اس کتاب میں جو واقعۂ کربلا کو غیر نزاعی طور پر دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لیے لکھی جارہی ہے اس پر بحث کرنا منظور نہیں ہے۔ نہ ان ناگوار واقعات کا کوئی مستقل تذکرہ مقصود ہے۔ بہرحال یہ متفق علیہ تاریخی حقیقت ہے کہ رسولؐ کے بعد کچھ افرادِ امّت نے متفق ہو کر سیاسی اقتدار خاندانِ رسولؐ سے ہٹا دیا۔ اس انقلاب کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ سرکارِ رسالت کے بعد ڈیوڑھی کی چہل پہل اور رونق سناٹے سے تبدیل ہوگئی اور وہ ماحول جس میں حسینؑ زندگی بسر کر رہے تھے ایک دم بالکل بدلا ہوا نظر آیا۔

حسینؑ ماں کے پاس جاتے تو یہ دیکھتے کہ سوا اوقات نماز کے ہر وقت گریہ و زاری سے کام ہے کچھ دن تک تو گھر ہی پر رویا کرتی تھیں پھر اہلِ مدینہ کی اس شکایت پر کہ آپ کے نالہ و شیون نے ہم پر خواب و خور حرام کر دیا ہے، آپ جنۃ البقیع میں چلی جاتی تھیں اور اس قبرستان میں گریہ کرتی رہتی تھیں[۱]۔ حسینؑ باپ کے پاس آتے تو یہ دیکھتے کہ انھوں نے اہلِ زمانہ کی بے رخی کو دیکھتے ہوئے گھر سے نکلنا اور لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا ہے۔ آپ ہر وقت ایک گوشہ میں بیٹھے قرآن مجید کے متفرق اجزا کو اصلی ترتیب اور شانِ نزول کے مطابق کتابی شکل میں مرتب کرتے رہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میں نے عہد کیا ہے کہ عبا دوش پر نہ ڈالوں گا جب تک کہ قرآن جمع نہ کر لوں[۲]۔ کیا اس صورتِ حال کو دیکھ کر حسینؑ کا دل نہ گھٹتا ہوگا۔ وہ سوچتے ہوں گے کہ اے خدا یہ کیسا اندھیرا ہے جو ایک دم ہماری آنکھوں کے سامنے چھا گیا۔ بہرحال اپنے باپ کے طرزِ عمل میں یہ نصب العین نمایاں پایا کہ چاہے حالات کتنے ہی ناسازگار ہوں مگر ہمیں اسلام کی خدمت سے ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے۔ ہمارا اور قرآن کا ساتھ ہے اس لیے قرآن کی حفاظت ہمارا فرض ہے اور اس فرض کو کسی وقت نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

۱؎ کشف الغمہ ص۱۴۸ ۲؎ صواعق محرقہ ص۷۶

حسینؑ نے یہ بھی دیکھا کہ لوگ میرے باپ کے پاس آتے ہیں اور وہ انھیں جوش دلانا چاہتے ہیں کہ آپ اسلامی حکومت کے حصول کے لیے کوشش کیجیے جو واقعی آپ کا حق ہے۔ اٹھیے اور ہم آپ کی امداد کے لیے تیار ہیں۔ ان میں سچے دوست بھی ہیں اور نمائشی بھی۔ ایک طرف رسولؐ کے چچا عباس بن عبد المطلب کہتے ہیں کہ اپنا ہاتھ بڑھاؤ، میں تمھاری بیعت کرلوں اس کا مسلمانوں پر بڑا اثر پڑے گا اور وہ کہیں گے کہ پیغمبرؐ کے چچا نے ان کے ابن عم کی بیعت کرلی پھر کسی کو عذر نہ ہوگا اور دوسری طرف بنی امیہ کا سردار ابوسفیان بن حرب ہے اور وہ آکر کہتا ہے کہ کتنے غضب کی بات ہے کہ آپ کے ہوتے ہوئے عرب کے ایک رذیل ترین خاندان نے غلبہ حاصل کرلیا۔ خدا کی قسم اگر آپ چاہیں تو میں آپ کی امداد کے لیے مدینہ کو سوار اور پیادوں سے بھردوں۔ مگر چونکہ آپ کی ذات جذبات سے بلند اور نفسانیت کے لوث سے پاک تھی اور آپ اسلام کا حقیقی درد اپنے سینہ میں رکھتے تھے اس لیے آپ اپنا حق سمجھتے ہوئے بھی ان لوگوں کے کہنے میں نہیں آئے اور آپ نے ابوسفیان کو اس طرح ڈانٹ کر جواب دیا کہ "خدا کی قسم تم ہمیشہ اسلام اور اہلِ اسلام کے دشمن رہے ہو"[1]۔ یہ اس کا عملی اظہار تھا کہ چاہے ہمارے حقوق ہاتھ سے جائیں۔ ہمارے شخصی مفاد کو نقصان پہنچے مگر ہم کو ہمیشہ اجتماعی اور اسلامی مفاد پر نظر رکھنا چاہیے اور اس کے لیے ہر طرح کی قربانی کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ یہ نتیجہ بھی اس واقعہ سے ظاہر تھا کہ ابوسفیان اور اس کے خاندان کے لوگوں کا اسلام صرف نمائشی حیثیت رکھتا ہے اور ان سے اسلام کے متعلق ہمیشہ نقصان رسانی کا اندیشہ موجود ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی کہ اسلام کو اس کے کھلے ہوئے دشمنوں کے ہاتھوں اتنا نقصان نہیں پہنچ سکتا جتنا ان نمائشی دوستوں سے پہنچ سکتا ہے اس لیے اگر اسلام کا تحفظ کرنا ہے تو ہمیشہ اس جماعت کی نقل و حرکت پر نظر رکھنا چاہیے اور کوئی موقع نہ آنے دینا چاہیے کہ یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائے۔

افسوس ہے کہ رسولؐ کی وفات سے چند ہی مہینوں کے بعد گوناگوں مصائب و تکالیف اٹھانے کے ساتھ حسینؑ سے ان کی بزرگ مرتبہ ماں بھی جدا ہوگئیں۔ حضرت فاطمہ زہراؑ کی وفات سے علیؑ بن

[1] ارشاد ص۱۰۔ استیعاب جلد۲ ص۱۱۔ صواعق محرقہ ص۳۷۔ تاریخ الخلفاء ص۴۵۔ طبری ج ۳ ص۲۰۲-۲۰۳

ابی طالبؑ اور بھی دل شکستہ ہوگئے اور حسنؑ و حسینؑ کے لیے مہر و محبت کی دنیا بڑی حد تک ویران نظر آنے لگی۔ اب ان کے لیے گہوارۂ شفقت و تربیّت صرف ایک تھا اور وہ ان کے بزرگ مرتبہ باپ کی ذات۔ سات برس کی عمر سے لیکر چھتیس سال کی عمر تک انتیس سال برابر حسینؑ اپنے وہبی کمالات کے ماورا، حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ ایسے حکیمِ الٰہی، عالمِ ربّانی، معلّمِ اخلاقِ انسانی اور مجموعۂ فضائلِ نفسانی کے علمی اور عملی فیوض سے بہرہ ور ہوتے رہے اور یہی وہ زمانہ ہے جس میں عام نظامِ اسباب کی دُنیا میں انسانیّت کی حقیقی تعمیر ہوتی ہے۔ اس عمر کے آغاز سے بلوغ کی مدت تک اوصاف و ملکات کی داغ بیلیں پڑتی ہیں۔ نوجوانی کے زمانہ میں اُن پر دیواریں اٹھتی ہیں اور جوانی کے اختتام تک یہ عمارت مکمّل ہوکر اس پر نقش و نگار بن جاتے ہیں اور وہ ساز و سامان اور شیشہ آلات سے بھی آراستہ ہوجاتی ہے۔ حسینؑ کے لیے ان تمام منازل کی ظاہری تکمیل علیؑ ابن ابیطالبؑ کی نگرانی میں ہورہی تھی۔

حسینؑ نے دیکھا کہ ان کے والدِ بزرگوار علیؑ بن ابیطالبؑ باوجودیکہ زمانہ کی بے توجّہی، حق فراموشی اور سرد مہری سے کبیدہ خاطر ضرور تھے لیکن جب کسی علمی مسئلہ میں کسی مہم کے متعلق مشورہ میں، کسی مقدمہ کے فیصلہ میں اُنکی ضرورت پڑجاتی ہے اور ان سے امداد کی خواہش کی جاتی ہے تو وہ فوراً بلا عذر امداد کرنے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں۔ یہ جذباتی انسانوں کے روّیہ کے بالکل خلاف ہے۔ وہ اگر کسی منصب کے حصول سے جس کے حقدار ہوں محروم کردیے جائیں تو وہ متعلقہ افراد سے خفا ہوکر الگ ہوجائیں گے اور اگر اس منصب سے تعلق رکھنے والے معاملات میں اُن سے مدد طلب کی جائے تو وہ اپنی دلی رنجش کی بنا پر تعاون سے انکار کردیں گے۔ اس سے اہلبیتؑ کے ہر فرد کے سامنے یہ نمونہ پیش ہورہا تھا کہ ہم چاہے مسلمانوں کے معاملات سے کتنے ہی غیر متعلق کردیے جائیں مگر ہمیں کبھی اپنے کو غیر متعلق سمجھنا نہیں چاہیے۔ ہمیں ہر ایسے موقع کا منتظر رہنا چاہیے کہ جس وقت ہمارے ذریعہ سے اسلامی مفاد کو حقیقی فائدہ پہنچ سکتا ہو تو اس موقع پر فوراً ہمیں اپنے فرض کو انجام دینا چاہیے اور اسلام کی خدمت کو اپنا نصب العین سمجھنا چاہیے۔

تیسرے خلیفہ کے انتخاب کے موقع پر ایسا وقت آیا کہ حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ تختِ حکومت کو حاصل کر لیتے جبکہ خلیفہ دوم نے اپنے انتقال کے وقت چھ آدمیوں کی کمیٹی بنا کر خلافت کو ان میں منحصر کر دیا اور ان میں سے ایک حضرت علیؑ ابن ابیطالبؑ کو بھی قرار دیا تھا۔ تمام دوسرے ارکان حضرت علیؑ کو خلافت کے منصب پر نامزد کرنے کے لیے تیار تھے بشرطیکہ آپ کتاب و سنّت کے علاوہ شیخین (ابوبکر و عمر) کی سیرت پر عمل کا بھی عہد کریں[1] مگر حسینؑ نے دیکھا کہ ان کے حقیقت پرور، بلند ہمت اور مستغنی طبیعت باپ نے اس موقع کو اپنے ہاتھ سے دے دیا۔ اس بنا پر کہ وہ کتاب اور سنت پر عمل کے علاوہ کسی دوسری شرط کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ جس کے نتیجہ میں وہ ظاہری خلافت کا ہُما جو اُن کے سرِ ہمایوں پر چکر لگا رہا تھا ایک طویل عرصہ تک کے لیے ان سے علیحدہ ہو گیا۔

حسینؑ نے اس میں ایک بڑے اہم سبق کا عملی نمونہ دیکھا جس پر اُن کے آئندہ اقدامات کی بنیاد قائم تھی اور وہ یہ کہ شریعت اور مسلمان حکمرانوں کی سیرت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ جو حکومتِ وقت کا آئین اور اس کا عمل ہو اس کو شریعت کی رو سے بھی صحیح ماننا پڑے بلکہ شریعت کے مستقل اصول ہیں جنھیں مقتدا ہونا چاہیے اور حکومت کے عمل کو ان کا ماتحت ہونا چاہیے اور جب ایسا نہ ہو تو ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ شریعت کو تسلیم کرے اور حکام کے عمل کو تسلیم نہ کرے اور اگر کسی وقت ایسا موقع پیش آئے کہ حکام کا عمل کھلم کھلا شریعت کے خلاف اور آئینِ مذہب میں بنیادی تبدیلی کا باعث ہو تو مسلمان کا فرض ہے کہ وہ شریعت کی حمایت میں کمربستہ ہو جائے اور اس کے لیے بشرطِ ضرورت کسی قربانی سے دریغ نہ کرے۔ اسی دور میں ۳۱ھ میں یزدجرد بادشاہِ ایران کا سراسیمگی اور کس مپرسی کے عالم میں ایک ایرانی ہی کے ہاتھ سے خاتمہ ہوا[2] جس کے بعد شاہزادیاں بحیثیت قیدی کے مدینہ بھیجی گئیں اور اس موقع پر جبکہ غنیم ملک کی شاہزادیوں کو قید دیکھ کر بہت سے آدمی خوش ہو رہے ہوں گے حضرت علیؑ اور اُن کے عالی دماغ شاہزادہ حسینؑ نے انھیں کنیزی کی ذلت سے بچا ہی نہیں لیا بلکہ انھیں خاندانِ رسول کے گھر کی ملکہ کا تاج پہنا دیا چنانچہ وہ شاہزادی جن کا نام

[1] ... [2] طبری ج ۵ ص ۶۱

شہر بانو یا شاہ زنان مشہور ہے حسینؑ کے عقد میں آئیں اور اس طرح انھوں نے اسلام کی اس تعلیم کو زندہ رکھا جو ملکی تفریق کو مٹا دینے کی علمبردار ہے۔

تیسرے خلیفہ عثمان کے دور کا آخری حصہ بڑی بے اطمینانی اور کشمکش میں گزرا۔ مسلمانوں کو اُن سے شکایتیں پیدا ہوئیں اور آخر اقدامات کی حد تک پہنچیں مگر حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ نے ان اقدامات کو تقویّت پہنچانے کے بجائے پوری کوشش کے ساتھ ان کو روکنے کی سعی فرمائی۔ کئی مرتبہ بیچ میں پڑ کر صلح کرائی۔ مخالف جماعت کی شکایات دور کرائیں اور اسے سمجھا بجھا کر منتشر کیا[1] مگر مروان جو اس دور میں "کاتب"[2] کے عہدہ پر تھا اس کی شرارتوں نے ان کوششوں کو کامیاب نہ ہونے دیا اور آخر اس جماعت نے حاکمِ وقت کے مکان کا محاصرہ کر لیا[3]۔ اس وقت بھی حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ نے یہ ہمدردی کی کہ جب آپ کو معلوم ہوا کہ محاصرہ کرنے والوں نے پانی بند کر دیا ہے تو آپ نے حسنؑ اور حسینؑ اپنے دونوں فرزندوں کو کچھ مشکوں کے ساتھ روانہ کیا اور ان دونوں صاحبزادوں نے اپنے کو خطرہ میں ڈال کر پانی قصرِ حکومت کے اندر پہنچا دیا۔ بہرحال نظمِ حکومت کا پیمانہ لبریز تھا اور پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ حملہ آور جماعت نے دار الحکومت کی سرزمین کو خلیفہ کے خون سے رنگین اور ان کے رشتۂ حیات کو قطع کر دیا۔ حیرت کا امر ہے کہ اتنا بڑا مسلم اکثریت کا مسلّم الثّبوت فرمانروا خود اپنے دار السلطنت میں ایک مہینہ انیس دن[4] محصور رہا اور آخر تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا اور اس دار السلطنت کے لوگوں میں جو پیغمبرؐ کا دار الہجرت اور مسلمانوں کا سب سے بڑا مرکز تھا اور جہاں کے اہلِ حل و عقد خلیفہ گری کے کام کا اپنے کو واحد ذمہ دار سمجھتے تھے کوئی جوشِ مقاومت پیدا نہ ہوا۔ اس سے زیادہ تعجب کی یہ بات ہے کہ لاش تین دن تک بے گور و کفن رہی[5] اور عامۂ مسلمین دفن کی طرف

[1] طبری ج ۵ ص ۹۶ و ۹۷ - ۱۱۰ - ۱۱۷ و ۱۲۲

[2] کاتب کا درجہ اس دور میں "وزیر" کا سا ہوتا تھا۔ وہ حاکم کا رازدار، مشیرِ کار، اسکی مُہر کا امانتدار اور اس کی طرف سے خط و کتابت کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ [3] الوزراء والکتاب ص ۱۴ - طبری ج ۵ ص ۱۱۱ - ۱۱۲

[4] طبری ج ۵ ص ۱۲۲ - [5] طبری ج ۵ ص ۱۴۳

متوجہ نہیں ہوئے آخر میں رات "حش کوکب" نام کے مقام پر جو مسلمانوں کے قبرستان سے الگ تھا سپرد خاک کیے گئے[1]۔

اس عبرت خیز مرقع سے ایک حساس انسان کس قدر اہم نتائج اخذ کرسکتا تھا؟ سلطنتِ دنیا کی بے ثباتی، جمہور کی وفاداری پر عدم اعتماد نیز مروان اور دوسرے بنی امیہ کے ہاتھوں اسلام کے شیرازہ کی ابتری یہ سب کچھ حسینؑ نے دیکھا اور اپنی آیندہ زندگی کے سب سے اہم کارنامہ کی بنیادوں کو مستحکم بنانے میں ان میں سے ہر ایک پہلو کا لحاظ رکھا جس کے سننے اور سمجھنے کیلیے آپکو مستقبل کا انتظار کرنا چاہیے

حالات بہت تیزی سے تبدیل ہوتے ہیں اور ان حالات کے لحاظ سے جمہور کے رجحانات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اس ہنگامی انقلاب کے نتیجہ میں مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں اور ان کے انتخاب کی نگاہیں حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے چہرہ پر جم گئیں۔ انھوں نے آپ کے پاس آکر خلافتِ اسلامی کی ذمہ واری کو سنبھالنے کی درخواست کی۔ یہ بات حیرت میں ڈالنے والی تھی کہ حضرت علی باوجودیکہ اس کے پہلے ہمیشہ خلق خدا کی ہدایت اور ان کے نظم ونسق کی اصلاح کے لیے بےچین اور خلافتِ رسولؐ کے لیے اپنے استحقاق کا اعلان فرماتے رہے تھے۔ آج مسلمانوں کی اس متفقہ ملتجیانہ پیشکش کو مسترد فرما رہے تھے[2] اور اس کے لیے کسی طرح تیار نہیں تھے۔ حسینؑ خوب جانتے تھے کہ اس کا سبب کیا ہے؟ حکومت اور عمّالِ حکومت کے رویہ کی بدولت مسلمانوں کی عادتیں بگڑ چکی تھیں اور زاویۂ نگاہ میں تبدیلی ہوچکی تھی۔ اسلامی حکومت بڑی حد تک دنیوی اقتدار سلطنت کے قالب میں ڈھل گئی تھی اور کسرویت وقیصریت کے آثار اس میں نمودار ہوگئے تھے۔ یہ چیز کسی طرح اس سادگی اور مساوات کے ساتھ سازگار نہ تھی جسے پیغمبر اسلامؐ نے دنیا میں پھیلایا تھا اور جس پر حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ نہایت سختی کے ساتھ عامل تھے اس لیے حضرت خوب جانتے تھے کہ اگر میں اس وقت حکومت کی باگ کو سنبھالوں تو یا تو مجھے زمانہ کے ساتھ سازکرکے ہوا کے رُخ پر چلنا پڑے گا اور اس کے لیے میرا ضمیر مجھ کو اجازت نہیں دے سکتا اور یا میں زمانہ کے ساتھ جنگ کروں گا۔ بیشک اگر میں ذمہ واری اپنے سر لے لوں تو مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے

[1] طبری ج ۵ ص ۱۴۳ و ۱۴۴ [2] طبری ج ۵ ص ۱۵۲

مگر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مملکت میں خلفشار رہے گا اور بحیثیت ایک حاکم کے میرا دور ناکامیاب سمجھا جائیگا۔ آپ نے پورے طور پر انکار کیا مگر مسلمانوں کا اصرار اتمامِ حجّت کی صورت اختیار کر گیا یعنی وہ علیؑ بن ابی طالبؑ پر یہ ذمہ واری عائد کرنے لگے کہ دنیا آپ سے ہدایت واصلاح کی طالب ہے اور آپ اس سے گریز کرتے ہیں۔ ایک داعئ حق کو یہ بھی زیبا نہیں ہے کہ وہ خلق خدا پر بے اعتمادی کی آڑ پکڑ کر ان کی درخواست کو ٹھکراتا رہے اور ان کی ہدایت کی ذمہ واری کو پورا کرکے ان پر حجّت تمام نہ کرے۔ مجبوراً حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کو یہ ذمّہ واری قبول فرمانا پڑی۔ بے شک آپ نے دنیا کو دھوکے میں مبتلا نہ رکھنے کے لیے صاف اعلان کردیا کہ دیکھو جب تم ذمہ واری کو میرے سپرد کر رہے ہو تو میں جو ٹھیک راستہ سمجھوں گا اسی پر تمھیں چلاؤں گا اور کسی کے اعتراض اور نکتہ چینی کی پروا نہ کروں گا[1] لوگوں نے اس کا اقرار کرکے ذی الحجہ ۳۵ھ میں علیؑ بن ابی طالبؑ کی بیعت کی اور خلیفۃ المسلمین تسلیم کرلیے گئے۔ اس سے ایک طرف یہ ثابت کیا گیا کہ دنیا کی فضا اب اہلبیتؑ کے حکومت واقتدار کے لیے موزوں نہیں ہے۔ دوسری طرف یہ کہ اگر اللہ کے بندے وفاداری کے عہد کے ساتھ رہنمائی کے طالب ہوں تو جب تک حجّت ان پر پورے طور سے تمام نہ ہوجائے ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم لظاہر ان کے عہد وپیمان کو باور کریں اور ان کی خواہش رہنمائی کی تکمیل کے لیے قدم آگے بڑھائیں۔

خلافت کی ذمہ واری قبول کرنے کے بعد وہی ہوا جو حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ پہلے سے سمجھے ہوئے تھے کہ دنیا آپ کے تعلیمات کی پیروی کے لیے تیار نہیں ہوئی۔ کچھ لوگوں نے تو بیعت سے پہلوتہی کی جیسے اسامہ بن زید، حسان بن ثابت، عبداللہ بن عمر اور سعد بن ابی وقاص وغیرہ۔ حضرت علیؑ نے ان کے ساتھ کوئی سختی نہیں کی حالانکہ تمام مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے آپ کی بیعت مکمل ہوچکی تھی اور اس لیے ان کا بیعت سے انحراف ان سب کے نزدیک غلط تھا مگر جب تک وہ عملی طور سے کوئی مخالفت نہ کرتے اور اس نظام میں خلل نہ ڈالتے،

[1] طبری ج ۵ ص ۱۵۶

ضرورت ہی کیا تھی کہ ان سے تعرض کیا جائے جبکہ اصول مذہب میں دستور یہ ہے کہ لا اکراہ فی الدین تو خلافت کے تسلیم کرانے میں اکراہ کے کیا معنی؟

لیکن بعض لوگوں کا یہ مشورہ کہ معاویہ اور جتنے عثمان کے زمانہ کے عامل ہیں ان سب، کو آپ برقرار رکھیں اور جب وہ مطمئن ہو جائیں اور آپ کی گرفت میں آ جائیں تو پھر چاہے سب کو معزول کر دیں۔ اسے آپ نے منظور نہیں فرمایا اور آپ نے کہا، اور مذہبی ذمہ داری[1] کے لحاظ سے آپ اس کے سوا کہہ ہی کیا سکتے تھے کہ سیاست دنیا کے لحاظ سے تو بیشک یہی بہتر ہے جو تم کہتے ہو مگر جب میں جانتا ہوں کہ وہ ظالم اور نااہل ہیں تو انھیں اپنی طرف سے حکومت کا پروانہ بھیج کر میں ان کے مظالم میں شریک ہوں۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے[2]

یہ بڑا دورس واقعہ ہے۔ اگر علیؑ بن ابی طالبؑ اپنی ماتحتی میں معاویہ ایسے شخص کی حکومت کو دینی فریضہ کے ماتحت برداشت نہیں کر سکتے تھے تو اس کے بعد کبھی حسینؑ بیعت کر کے معاویہ سے بڑھ کر یزید ایسے شخص کی حکومت کیونکر تسلیم کر سکتے ہیں؟

پھر بھی حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ نے معاویہ کے نام جو خط لکھا اس میں کوئی سختی و درشتی، لب و لہجہ کی تلخی اور جنگجویانہ انداز نہ تھا بلکہ ایک برسرِ اقتدار آنے والے حاکمِ اعلیٰ کو اپنے کسی عامل کو جس طرح کا خط لکھنا چاہیے ویسا ہی تھا۔ اس خط کا مضمون جو مشہور مؤرخ واقدی کی کتاب الجمل سے منقول ہے حسب ذیل ہے:-

"تم کو معلوم ہوگا کہ میں نے مسلمانوں کے معاملات میں اپنے دامن کو کس طرح صاف رکھا اور کس طرح تختِ خلافت سے بے اعتنائی اختیار کرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ ہوا جو ٹل نہ سکتا تھا (قتل عثمان)

[1] پیغمبرِ اسلامؐ کا ارشاد ہے کہ جو شخص مسلمانوں کی حکومت کا ذمہ دار ہو پھر وہ اپنی جانب سے کسی شخص کو والی قرار دے درانحالیکہ اس سے بہتر شخص مسلمانوں کے مفاد کے لیے موجود ہو تو اس نے خدا و رسولؐ سے خیانت کی۔ دوسری حدیث میں ہے کہ جو شخص کسی آدمی کو کوئی منصب عطا کرے کسی جماعت کے اندر حالانکہ اس جماعت میں اس آدمی سے زیادہ پسندیدہ شخص موجود ہے تو ... نے خدا اور اس کے رسولؐ اور تمام مومنین کی خیانت کی (السیاسۃ الشرعیہ فی اصلاح الراعی والرعیۃ لسنبہ ...)
[2] ... سنہ ۳۵ھ، جلد ۵ صفحہ ۱۵۶-۱۷۰

اور اس کے بعد میرے لیے چارۂ کار باقی نہ رہا۔ یہ واقعات بہت طولانی ہیں۔ بہرحال جو ہونا تھا وہ ہوا اور اب جو حالات پیش ہیں وہ آنکھوں کے سامنے ہیں۔ اب تم وہاں کے لوگوں سے بیعت حاصل کرو اور اپنے یہاں کے آدمیوں کے ایک وفد کے ساتھ میرے پاس حاضر ہو[1]"

معاویہ اگر مخالفت پر پہلے ہی سے تلے ہوئے نہ ہوتے تو اس خط کے مضمون پر انھیں عمل کرنا چاہیے تھا مگر وہاں تو عناد و مخالفت کی چنگاریاں پہلے سے سلگ رہی تھیں۔ آخر آپ کے مقابلہ میں قتل عثمان کا غلط الزام تراشا گیا اور اس بہانہ سے آپ کی مخالفت کا جھنڈا اونچا کیا گیا۔

معاویہ نے شام والوں کو حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ کے خلاف اس غلط تہمت کو ان کے ذہن نشین کر کے پورے طور پر مشتعل کر دیا۔ مسجد جامع دمشق میں ماتمی جلسے کیے گئے۔ مقتول خلیفہ کا خون بھرا کرتا منبر پر ڈال دیا گیا اور عالم یہ تھا کہ پچاس ساٹھ ہزار کا مجمع اسے دیکھ دیکھ کر نالہ و زاری کرتا اور اس جوش رقت میں ان سے کہا جاتا تھا کہ اب تمھیں علیؑ سے اس خون کا بدلا لینا ہے[2] اب حضرت علیؑ شام کی مہم کے تدارک کا سامان کرنا چاہ رہے تھے جو یک بیک یہ خبر آئی کہ طلحہ اور زبیر نے زوجۂ رسولؐ عائشہ بنت ابی بکر کو آمادہ کر کے آپ کے خلاف محاذ تیار کر لیا ہے[3]

وہ لوگ جو پچیس برس تک حضرت علیؑ کو میدانِ جنگ سے بالکل علیحدہ رہتے ہوئے خاموشی کی زندگی گزارتے دیکھ چکے تھے انھیں یقین ہوگا کہ حضرت علیؑ کسی نہ کسی طرح اس قضیہ کو رفع دفع کر دیں گے اور جنگ کی نوبت نہ آنے دیں گے مگر انھوں نے دیکھ لیا کہ وہی علیؑ جو اپنی تلوار کو اتنے عرصہ تک نیام میں رکھ چکے تھے کہ جوانی گزر کے بڑھاپا آ گیا تھا، آج وہ ذمہ داری اپنے اوپر عائد ہو جانے کے بعد آئین و اصول اور حق کی حفاظت کے لیے جنگ پر بالکل تیار ہیں۔ بیشک امام حسینؑ نے دیکھا کہ ان کے پدر بزرگوار نے اس اصول کی سختی کے ساتھ پابندی فرمائی کہ جب تک فریق مخالف عملاً جنگ کی ابتدا نہ کر دے اس وقت تک تلوار نیام سے نہ نکالی جائے چنانچہ جمل[4] کے میدان میں یہی ہوا کہ جب صفوف لشکر مرتب

[1] نہج البلاغہ ج ۲ صفحہ ۱۴۰ [2] طبری ج ۵ صفحہ ۱۶۳ [3] طبری ج ۵ صفحہ ۱۶۴ [4] جمل عربی میں اونٹ کو کہتے ہیں چونکہ اس جنگ میں زوجۂ حضرت رسولؐ، عائشہ کو ایک اونٹ پر محمل میں سوار کر کے حضرت کے مقابلہ پر لایا گیا تھا اس لیے اس کا نام

ہو چلے تو حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ نے ایک قرآن ہاتھ میں لے کر اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ کون ہے جو اس قرآن کو لے جا کر انھیں اس پر عمل کرنے کی دعوت دے مگر یہ بتائے دیتا ہوں کہ وہ قتل کر دیا جائے گا۔ یہ سنکر اہلِ کوفہ میں سے ایک جوان جس کا نام مسلم تھا کھڑا ہو گیا۔ کہا میں جاؤنگا۔ حضرت نے سکوت فرمایا اور پھر بلند آواز سے کہا کون ہے جو اس قرآن کو لے جا کر انھیں اس پر عمل کی دعوت دے مگر وہ قتل ہو جائے گا۔ پھر کھڑا ہوا تو وہی جوان۔ حضرت نے پھر سکوت کیا اور پھر وہی الفاظ بلند آواز سے کہے۔ جب پھر وہی جوان کھڑا ہوا تو آپ نے وہ قرآن اس کے سپرد کیا وہ اسے لے کر صفوف مخالف کے سامنے گیا۔ ظالموں نے اس کا داہنا ہاتھ قطع کر دیا تو اس نے قرآن کو دونوں کٹے ہوئے بازوؤں سے تھام کر سینہ سے لگا لیا۔ اس حالت میں کہ خون کی اس کے کپڑوں پر بارش ہو رہی تھی۔ اس کے بعد وہ قتل کر دیا گیا۔ علیؑ بن ابیطالبؑ پکارے کہ اب ان سے جنگ حلال ہو گئی[1] اب دنیا نے دیکھا کہ وہی تلوار جو بدر، اُحد، خندق اور خیبر میں کسی وقت چمک چکی تھی جمل کے میدان میں چمکنے لگتی ہے۔ وہی ہاتھ ہے اور ہاتھ کی صفائی وہی دل ہے اور دل کی طاقت۔ یہاں تک کہ جمل کا معرکہ فریق مخالف کی شکست پر ختم ہوا اس وقت حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ نے فریق مخالف کی سرگردہ ام المومنین عائشہ کے ساتھ وہ شریفانہ اور باعزت برتاؤ کیا جیسا کہ کسی فاتح نے اپنے مفتوح فریق کے ساتھ نہیں کیا ہوگا[2] یہ معرکہ روز پنجشنبہ ۱۰ جمادی الثانیہ ۳۶ھ کو پیش ہوا[3]

ظاہر ہے کہ عام اسباب کے لحاظ سے اب جناب امیر کا سن لڑائیوں کی امنگوں کا متقاضی نہیں تھا۔ انسٹھ برس کی عمر تھی مگر آپ کا پچیس برس کی خاموشی کے بعد اب میدان جنگ میں آجانا اعلان کر رہا تھا کہ حقیقتاً ہمارا حرکت و سکون سب فرض کے احساس کا نتیجہ ہونا چاہیے۔ فرض کی پکار پر ہمیں ہمیشہ جواب دینا چاہیے۔ اصول اور فرض کے حدود میں جذبات کا تقاضا اور سن کا اختلاف کوئی چیز نہیں ہے۔ اگر فرض ہمارا خاموشی کا ہو تو چاہے جوانی کی تمام امنگیں قدم اٹھانے پر آمادہ کر رہی ہوں پھر بھی ہم کو اپنی زندگی خاموشی کے ساتھ گزار دینا چاہیے اور جوانی سکون کے عالم میں بسر کرنا

۳ طبری ج ۵ ص ۲۱۴

چاہیے اور اگر فرض ہمارا عملی اقدام کا ہو تو چاہے بڑھاپے کا اضمحلال جسمانی قوتوں کو متاثر بھی کیے ہو مگر ہمیں عزم و ارادہ کے قدموں پر کھڑا ہونا چاہیے اور وہ کرنا چاہیے جو جوانمردانہ ہمت کا تقاضا ہے۔

اُدھر شام میں اشتعال انگیزی مسلسل جاری رہی۔ جناب عثمان کا خون بھرا کُرتہ اور اُن کی زوجہ نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں منبر پر آویزاں اور اس کے سامنے گریہ وزاری، یہ سلسلہ ایک سال تک برابر جاری رہا۔ بہت سے اہلِ شام نے قسم کھائی کہ وہ عورتوں کے قریب نہ جائیں گے سوا غسل واجب کے کسی دن نہائیں گے نہیں اور بچھونے پر سوئیں گے نہیں جب تک ان آدمیوں کو جو قتلِ عثمان میں شریک تھے قتل نہ کر لیں گے[1] اس طرح معاویہ نے پورے شام کو حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ کے خلاف برانگیختہ کر دیا مگر آپ نے اپنی جانب سے اصلاح کی کوشش جاری رکھی۔ چنانچہ اسی کے لیے آپ نے جریر بن عبداللہ بجلی کو دمشق بھیجا مگر اس کا کوئی بھی نتیجہ نہ نکلا۔ آخر کو صفین کی جنگ کے لیے فوجیں میدان میں آگئیں۔ اب بھی آپ نے فہمائش اور نصیحت کا سلسلہ موقوف نہیں کیا۔ بشیر بن عمرو بن محصن انصاری، سعید بن قیس ہمدانی اور شبث بن ربعی تمیمی ان تین آدمیوں کو معاویہ کے پاس روانہ فرمایا کہ وہ جا کر اتحاد و اتفاق اور اطاعت و اجتماع کی طرف دعوت دیں۔ مگر اس امن پسندانہ پیش قدمی کا جواب یہ ملا کہ پلٹ جاؤ میرے پاس سے کیونکہ میرے تمہارے درمیان بس تلوار سے فیصلہ ہوگا[2] کہاں تو حاکم شام کے یہ جنگجویانہ انداز اور کہاں حضرت علیؑ کی وہ گفتگو جو آپ نے نمائندگانِ شام حبیب بن مسلم فہری، شرجیل بن سمط اور معن بن یزید بن اخنس کے سامنے فرمائی تھی جس میں آپ نے کہا تھا "میں تم لوگوں کو کتابِ خدا اور سنتِ رسولؐ باطل کو پامال کرنے اور حق کو زندہ کرنے کی جانب دعوت دیتا ہوں[3]" لیکن آپ کی یہ دعوت مسترد کر دی گئی اور بالآخر مسلمانوں کا خون بے دریغ بہایا جانے لگا۔

اس جنگ کا آغاز اثنا اور انجام میں بہت سے جاذبِ توجہ امور پیش آتے رہے۔ پہلے یہ کہ اس جنگ میں بھی حضرت علیؑ نے اپنی فوج کو ہدایت کر دی کہ جب تک دشمن ابتدا نہ کرے تم جنگ نہ کرنا[4] آپ نے ان تمام معرکوں میں جو نام نہاد مسلمانوں کے ساتھ پیش آئے ہیں برابر

۱ طبری ج ۵ ص ۲۳۵ ۲ طبری ج ۵ ص ۲۴۳ ۳ طبری ج ۶ ص ۲ ۴ طبری ج ۵ ص ۲۳۸

اپنی فوج کو یہ ہدایت فرمائی کہ اس وقت تک جنگ نہ چھیڑنا جب تک کہ وہ ابتدا، نہ کریں۔ اس لیے کہ تمھاری حجت بحمداللہ حقانیت کے لحاظ سے تو تمام ہے ہی اب یہ تمھارا جنگ میں ابتدا نہ کرنا اور اُدھر سے ابتدا ہونا ان کے مقابلہ میں مزید اتمام حجت کا باعث ہو جائے گا اور جب لڑائی چھڑ جائے اور پھر دشمن کو شکست ہو تو کسی بھاگتے ہوئے کا پیچھا نہ کرنا۔ کسی زخمی پر ہاتھ نہ اٹھانا کسی عورت کی بے حُرمتی نہ کرنا کسی مقتول کے اعضاء قطع نہ کرنا، خیام میں بلا اجازت داخل نہ ہونا ان کے مال و اسباب کو نہ لُوٹنا اور دشمنوں کی عورتیں تمھیں اور تمھارے سرداروں کو گالیاں بھی دیں تو انھیں کوئی ایذا نہ پہنچانا۔[۱]

اس کے علاوہ یہ بھی ایک واقعہ سامنے آیا کہ معاویہ کے مقدمۃ الجیش ابوالاعور سلمی نے نہر فرات پر قبضہ کر لیا اور حضرت علیؑ کے لشکر پر پانی بند کر دیا۔ مجبوراً آپ نے پانی کے لیے جنگ کا حکم دیا۔ آپ کے لشکر نے ابوالاعور سلمی کی فوج سے گھاٹ چھین لیا اور یہ ارادہ کیا کہ اب دشمن کی فوج پر اسی طرح پانی بند کر دیا جائے جیسے اس نے ہم پر بند کیا تھا۔ مگر حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ نے اس کو گوارا نہ فرمایا۔ آپ نے کہا کہ وہ اُنکا فعل تھا مگر تم اُنھیں پانی سے نہ روکو۔ اطمینان کے ساتھ سیراب ہونے دو۔ اس سے یہ سبق دیا جا رہا تھا کہ ہماری مخالف جماعت انسانیت اور اخلاق میں کتنی ہی پست ہو جائے مگر ہم کو ہمیشہ بلند ظرفی سے کام لینا چاہیے اور اس کے کمینہ طرزِ عمل کا معاوضہ اس کے مثل سے نہیں کرنا چاہیے بلکہ ہمیں انسانیت کی بلندی کا تحفظ کرنا ضروری ہے۔

جنگِ صفین میں حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کو مسلمانوں کی خونریزی سے بڑی تکلیف محسوس ہو رہی تھی چنانچہ آپ نے پکار کر امیرِ شام سے کہا کہ اس سے کیا حاصل ہے کہ عام مسلمانوں کا خون فیاضی کے ساتھ بہہ رہا ہے۔ بس تم نکل آؤ میدان میں اور میں آجاؤں اور اس جنگ کا فیصلہ ہو جائے۔[۲] مگر معاویہ نے اس خطرہ کو اپنی ذات کے لیے مول نہ لیا۔ وہ دوسروں کے گلے کٹواتے رہے اور خود کبھی مقابلے کے لیے میدان میں نہیں آئے۔ برخلاف اس کے حضرت علیؑ جان کو جان نہ سمجھتے ہوئے برابر مجاہدین کی صفوں

کے آگے آگے تھے اس لیے کہ ان کا ضمیر مطمئن تھا۔ وہ شہادت کے مشتاق تھے۔ ان کا تو قول تھا کہ میں موت کے ساتھ اس سے زیادہ مانوس ہوں جتنا بچہ آغوشِ مادر سے مانوس ہوتا ہے۔ بیشک وہ اس موت کو ناپسند کرتے تھے جو بزدلی کے ساتھ بسترِ راحت پر ہو۔ چنانچہ اصحاب سے فرماتے تھے کہ یاد رکھو اگر تم قتل نہ ہوئے تو اپنی موت مرو گے اور قسم اس خدا کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ ہزار ضربتیں تلوار کی جو سر پر پڑیں آسان ہیں فرشِ خواب پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے سے۔[۱] چنانچہ ان کا طرزِ عمل ہمیشہ اسی کا مظہر رہا تھا۔ ابتدائے شباب میں جب ہر انسان کو زندگی انتہائی عزیز ہوتی ہے، رسولؐ کا ارشاد کہ علیؑ میرے بستر پر سو رہو اور علیؑ کا بسر و چشم آمادہ ہو جانا اس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی، معلوم تھا کہ خون کے پیاسے دشمن کھنچی ہوئی تلواریں لیے قتل پہ آمادہ ہیں۔ مگر وہاں راہِ حق میں موت تو خوشگوار سمجھی جاتی تھی۔

اسی جنگِ صفین میں ایک موقع پر امام حسنؑ سے فرمایا:۔

"تمھارے باپ کو کوئی پروا نہیں ہے کہ موت اس پر گر رہی ہے یا وہ خود موت کے اوپر گر رہا ہے۔"[۲] پھر ایسے باپ کے جو بیٹے ہوں، جن کے سامنے یہ سیرت ہو اور جن کے کانوں میں یہ باتیں پڑ رہی ہوں انھیں موت کا اندیشہ کیونکر رہ سکتا ہے۔ چنانچہ حسینؑ اپنے بھائی حسنؑ اور محمد بن حنفیہ کے ساتھ اس جنگ میں برابر سے حصہ لے رہے تھے اور سخت سے سخت موقعوں پر ثبات قدم کے جوہر دکھلا رہے تھے۔ تاریخ نے ایک ایسے موقع کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہ جب علیؑ بن ابیطالبؑ کے لشکر کا بڑا حصہ شکست کھا چکا تھا لکھا ہے کہ اس وقت نہیں رہ گئے تھے علیؑ کے پاس مگر بڑے فرض شناس اور پُر جگر افراد اُس وقت آپ نے اپنے گھوڑے کا رُخ میسرہ کی جانب پھیرا کہ جدھر قبیلۂ ربیعہ کے لوگ اب تک دشمنوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ راوی جس کا نام زید بن وہب جہنی ہے بیان کرتا ہے کہ میں دیکھ رہا تھا علیؑ کو کہ آپ ربیعہ کی فوج کی طرف جا رہے تھے اور آپ کے فرزند حسنؑ حسینؑ اور محمد حنفیہ آپ کے ساتھ ساتھ تھے اور تیر علیؑ کے

[۱] ارشاد ص ۱۲۵ [۳] طبری ج ۶ ص ۱۱

کان اور شانوں کے پاس سے گزر رہے تھے مگر آپ کے فرزند بڑھ بڑھ کر سپر بن جاتے تھے اور اپنے باپ کی حفاظت کرتے تھے[1] کیا یہ جذبۂ فداکاری اور قربانی کا معمولی مظاہرہ ہے جو علیؑ کی آنکھوں کے سامنے ان صاحبزادوں سے ظاہر ہو رہا تھا؟ کیا اس کے بعد کبھی یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ علیؑ کے یہ بہادر بیٹے موت کے ڈر سے کسی فرض میں کوتاہی کریں یا کسی باطل طاقت کے سامنے جان کے خوف سے سر جھکائیں؟

اسی صفین کے میدان میں ایک اور منظر کا بھی مشاہدہ ہوا۔ وہ یہ کہ عین جنگ کی حالت میں حضرت علیؑ ابن ابیطالبؑ کی نگاہ آفتاب پر تھی۔ ابن عباس نے سبب دریافت کیا۔ حضرت نے فرمایا کہ دیکھتا ہوں نماز ظہر کا وقت آیا یا نہیں۔ ابن عباس نے عرض کیا کیا یہ نماز کا موقع ہے؟ جنگ تو ہو رہی ہے! آپ نے فرمایا کہ اور یہ ہماری جنگ کس بات کے لیے ہے؟ اسی نماز کے لیے تو جنگ کر رہے [illegible] یہ عبادتِ الٰہی کے فرض کی اہمیت کا ایک بےمثل عملی درس تھا کہ تیروں کی بارش ہو یا آگ برس رہی ہو جب نماز کا وقت آئے تو لازم ہے کہ اس فرض کے ادا کرنے کے لیے کھڑے ہو جائیں [illegible] جنگ کو بہت طول ہو چکا تھا۔ آخر ایک دن حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ نے طے کر لیا کہ اب مکمل فتح حاصل کرنے کے بعد ہی جنگ کو موقوف کیا جائیگا۔ ایک دن اور رات مسلسل ہنگامہ دار و گیر برپا رہا جس کے نتیجہ میں فوج شام کے قدم اکھڑنے لگے اور معاویہ کو شکست کا یقین ہو گیا مگر عمر بن العاص نے اس دن کے لیے ایک چال اٹھا رکھی تھی۔ وہ یہ کہ فوراً قرآن نیزوں پر بلند کر دیے گئے اور ندا دی گئی کہ بھائیو یہ کتابِ خدا ہی ہمارے اور تمھارے درمیان فیصلہ کر[illegible] دے گی۔ شام والے سب ہلاک ہو گئے تو شام کے حدود کا کون نگہبان ہوگا[2]۔ حالانکہ آغاز جنگ [illegible] سے پہلے ہی حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ قرآن کے فیصلہ کی دعوت دے چکے تھے۔ مگر اس وقت [illegible] کامیابی کے تخیلات کی بنا پر علیؑ کی دعوت کو مسترد کر دیا گیا۔ اب شکست کے آخری انجا[illegible] سے بچنے کے لیے قرآن درمیان میں لایا جا رہا تھا۔ حضرت علیؑ نے اپنی فوج والوں کو اس مکر [illegible]

اور چالبازی سے آگاہ کیا اور صاف فرمایا کہ یہ لوگ نہ اہلِ دین ہیں نہ اہلِ قرآن[1]۔ مگر آپ کی فوج کے بہت سے لوگ آپ سے منحرف ہو کر اس بات پر مُصِر ہو گئے کہ اب تلوار روک لیجیے۔ نہیں تو ہمارے آپ کے درمیان تلوار چلے گی۔ یہ بڑی کشمکش کا موقع تھا۔ دشمن سے مقابلہ کے ہنگام میں ایسی صورت پیدا ہو جانا کہ خود اپنی فوج میں تلوار چلنے لگے ایک انتہائی ہولناک صورتِ حال تھی جسے حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ گوارا نہ کر سکتے تھے۔ مجبوراً آپ نے جنگ کے التوا کا حکم دیا اور طے پایا کہ ایک حکم اہلِ شام کی طرف سے نامزد ہو اور ایک اہلِ کوفہ کی طرف سے۔ مگر اہلِ شام کی طرف سے عمرو بن عاص ایسا امیرِ شام کا نفسِ ناطقہ مقرر کیا گیا اور جب حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ نے چاہا کہ مالک اشتر یا عبداللہ بن عباس یا کسی دوسرے ایسے ہی اپنے مخلص اور خیرخواہ کو اپنی جانب سے مقرر کریں تو وہی اپنی فوج والے پھر بگڑ گئے کہ یہ لوگ تو بالکل اس جنگ کے ذمہ دار ہیں ہم ان کو کیونکر مقرر کریں[2] آخر سب نے ابوموسیٰ اشعری کو جو پہلے ہی حضرت علیؑ کی موافقت سے گریز کر چکے تھے اپنی جانب سے مقرر کیا۔ مصلحتِ وقت یہی تھی کیونکہ اپنی جماعت میں خونریزی کا انسداد اسی پر موقوف تھا کہ حضرت بادلِ ناخواستہ اس کو برداشت کریں۔ یہاں تک کہ نتیجہ سب کی آنکھوں کے سامنے آجائے۔ تاہم آپ نے جو صلحنامہ لکھوایا اسکا مضمون حسبِ ذیل تھا:-

"علیؑ بن ابیطالبؑ ذمہ لیتے ہیں اہلِ کوفہ اور تمام ان مسلمانوں کا جو اُن کے ساتھ ہیں اور معاویہ نے ذمہ داری لے لی ہے اہلِ شام اور تمام اپنے طرفداروں کی کہ ہم اللہ اور اس کی کتاب کے فیصلہ پر دار و مدار رکھتے ہیں اور سوا کتابِ خدا کے کوئی شے ہم میں فیصلہ کُن نہیں ہوگی اور کتابِ خدا ہمارے سامنے رہے گی۔ شروع سے لے کر آخر تک ہم زندہ کریں گے اسی بات کو جسے خدا زندہ کرے۔ اور مردہ کریں گے اس کو جسے کتابِ خدا مردہ کرے۔ لہٰذا حکمین کو لازم ہوگا کہ وہ کتابِ خدا پر نظر کریں اور جو کچھ اُس میں ملے اس پر عمل کریں اور اگر کتابِ خدا میں انھیں کوئی ہدایت

[1] طبری ج ۶ ص ۲۷ ، ارشاد ص ۱۴۴   [2] طبری ج ۶ ص ۲۸

نظر نہ آئے تو رسولِ خداؐ کی سنت پر جو اختلافی نہ ہو عمل کیا جائے گا۔"

اس معاہدہ کے الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ حکمین کو اپنی ذاتی رائے سے جو کسی سیاستِ دنیوی کا تقاضا ہو فیصلہ کرنے کا حق نہیں دیا گیا تھا۔ چنانچہ حضرت علیؑ نے خود حکمین سے جو فیصلہ کے لیے مقرر ہوئے تھے فرمایا تھا کہ "تم اس شرط پر حکم ہو کہ کتاب اللہ کے رُو سے فیصلہ کرنا اور اگر تمھیں کتابِ خدا کی رُو سے فیصلہ نہ کرنا ہو تو تمھیں اپنے کو حکم نہیں سمجھنا چاہیے[1]۔ دوسرے اشخاص کو بھی یہ بتا دیا گیا کہ حکمین پر یہ شرط لگا دی گئی ہے کہ وہ قرآن کی بنا پر فیصلہ کریں اور اپنی ذاتی رائے کو کام میں نہ لائیں[2]۔

یہ اقرار نامہ ۱۳ صفر ۳۷ھ کو پایۂ تکمیل تک پہنچا۔

باوجود حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کی اس دور اندیشی اور احتیاط کے پھر بھی ساتھ والے مفسد آدمی فتنہ و فساد برپا کرنے سے باز نہ آئے اور ابھی اقرار نامہ لکھا ہی گیا تھا کہ اسی وقت حضرت علیؑ کی فوج میں یہ آواز بلند ہو گئی کہ انسانوں کو حکم بنانا درست نہیں لَاحُکْمَ اِلَّا لِلّٰهِ یعنی حکم ہونا اللہ سے مخصوص ہے۔ اس آواز کا سب سے پہلا بلند کرنے والا قبیلۂ بنی تمیم کا ایک شخص عروہ بن ادبہ تھا[3]۔

یہ جماعتِ خوارج کا سنگِ بنیاد تھا۔ ان لوگوں نے حضرت علیؑ سے اصرار کیا کہ پہلے معاویہ سے جنگ کیجیے ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ نے وہی جواب دیا جو رسولِ خداؐ صلح حدیبیہ کے بعد دیتے تھے

"ہم نے نوشتہ دے دیا ہے۔ شرائط طے کیے ہیں۔ عہد و میثاق کر لیا ہے۔ اب اس کی مخالفت ممکن نہیں ہے۔ قرآن میں حکم ہوا ہے کہ وفا کرو عہد و پیمان کے ساتھ اور قسم کھانے کے بعد اس کی مخالفت نہ کرو جبکہ تم نے اللہ کو اس کا ضامن بنا دیا ہے اور یقیناً اللہ تمھارے افعال و اعمال پر مطلع ہے۔"

آپ نے اس سختی کے ساتھ معاہدہ پر قیام کیا مگر حکمین نے خود شرائطِ مقررہ کی پابندی نہیں

[1] اسد الغابہ ج ۳ ص ۲۴۶ [2] طبری ج ۶ ص ۳۲ ارشاد ص ۱۳۶ [3] طبری ج ۶ ص ۳۰ و ۳۱

کی اور کتابِ خدا و سنتِ رسولؐ سے کوئی سروکار ہی نہیں رکھا۔ چونکہ ابو موسیٰ سادہ لوح آدمی تھے اور جنابِ امیرؑ سے کوئی خلوص و محبت بھی نہیں رکھتے تھے، انھیں عمرو بن العاص نے اپنی سیاست کا شکار بنا لیا۔ اس طرح کہ جب وقت مقررہ پر دومۃ الجندل میں جو کوفہ و شام کے لحاظ سے بالکل وسط میں واقع تھا اور اس لیے فیصلہ کے لیے وہیں اجتماع طے پایا تھا۔ یہ لوگ یکجا ہوئے۔ روزانہ ملاقات اور تبادلۂ خیالات کا سلسلہ قائم ہو گیا تو عمرو بن عاص نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب گفتگو ہو تو ابو موسیٰ اشعری کو اپنے اوپر مقدم قرار دیں اور کہیں کہ آپ بزرگ ہیں۔ رسولِ خداؐ کی صحابیت کا مجھ سے زیادہ شرف رکھتے ہیں۔ آپ پہلے تقریر کیجیے، پھر میں جو کہنا ہے کہوں گا۔ اس طرح عمرو عاص نے ابو موسیٰ اشعری پر اپنے خلوص و عقیدت کا اثر جمایا اور آئندہ کے لیے جو منصوبہ سوچا تھا اس کی تمہید قائم کر دی۔

پھر زیرِ بحث مسئلہ کے متعلق تبادلۂ خیالات کیا اور ابو موسیٰ کو یہ پٹی پڑھائی کہ ہم دونوں فریق یعنی حضرت علیؑ اور معاویہ کو ایک ساتھ معزول کر دیں اور پھر مسلمانوں کو اختیار دیں کہ وہ از سرِ نو جس کو چاہیں منتخب کر لیں۔ ابو موسیٰ اس فریب میں آ گئے اور بخیالِ خود متفقہ حیثیت سے یہی طے کر لیا۔

جب فیصلہ کا وقت آیا اور طرفین کے آدمی فیصلہ سننے کو جمع ہوئے تو عمرو عاص نے حسبِ عادت ابو موسیٰ اشعری سے کہا "بسم اللہ! آپ فرمائیے جو کچھ فرمانا ہے۔" ان کو تو عادت پڑی ہی تھی کہ ہمیشہ گفتگو میں پہل وہ کریں۔ وہ بلا عذر تقریر کے لیے آمادہ ہو گئے۔ عبد اللہ بن عباس نے جو سمجھ دار آدمی تھے متنبہ بھی کیا کہ دیکھو عمرو بن عاص کہیں چوٹ نہ دے دے۔ پہلے اسے تقریر کر لینے دو۔ پھر تم تقریر کرنا۔ مگر ابو موسیٰ اشعری نے کہا کہ نہیں، ہم نے باہم متفقہ طور پر ایک چیز طے کر لی ہے۔ چنانچہ کھڑے ہو گئے اور حمد و ثنا کے بعد کہنے لگے کہ "ہم نے انتہائی غور و خوض کے بعد ایسی بہترین صورت طے کی ہے جس سے افتراق و اختلاف کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ ہم دونوں علیؑ اور معاویہ دونوں کو معزول کر دیں اور خلافت کو از سرِ نو مسلمانوں کے حوالے کر دیں، کہ وہ جسے چاہیں منتخب کر لیں۔" وہ یہ کہہ کر چونہی بیٹھے عمرو عاص نے کھڑے ہو کر کہا کہ "حضرات!

آپ لوگوں نے ابوموسیٰ اشعری کی تقریر سُنی وہ علیؓ کے نمائندہ ہیں اور انھوں نے علیؓ کو معزول کر دیا ہے میں معاویہ کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے علیؓ کے معزول کرنے میں ان سے متفق ہوں مگر معاویہ کو میں برقرار کرتا ہوں۔" یہ سننا تھا کہ ابوموسیٰ چیخ اٹھے۔

"ارے یہ تُونے کیا کیا؛ خدا تجھ سے سمجھے، تونے غدّاری کی، بے ایمانی کی۔ تُو کتّے کی طرح ہے کہ جا ہے اس پر حملہ کر دیا اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ وہ بھونکنے سے باز نہ آئے گا۔"

عمرو عاص نے جواب دیا۔

"تمھاری مثال گدھے کی سی ہے جس کی پشت پر کتابیں لاد دی گئی ہوں۔"

مجمع میں سے کوئی ابوموسیٰ کی طرف جھپٹ کر حملہ آور ہوا اور کوئی عمرو عاص پر۔ غرض اس ہڑبونگ اور ان تہذیب و اخلاق کے مظاہروں کے ساتھ یہ اجتماع منتشر ہو گیا[۱] ظاہر ہے کہ اس طرح کی مکارانہ دھاندلی کو کسی باضابطہ فیصلہ کا درجہ دیا ہی نہیں جا سکتا تھا چنانچہ اسے کسی نے بھی صحیح تسلیم نہ کیا اور اختلاف جوں کا توں قائم رہ گیا لیکن اس سے حضرت علیؓ کی جماعت کے انتشار میں کچھ اور زیادتی ہوگئی۔

اُدھر خوارج نے اپنی جماعت کو منظم کر کے مقابلہ کی تیاری کر دی جس سے ۳۸ھ میں جنگِ نہروان کی صورت پیش آئی۔

واقعات کے اس طویل سلسلہ میں بڑے نتائج برآمد ہوتے تھے اور محسوس ہوتا تھا کہ ایک قائد کو اپنے ساتھ والوں کے ہاتھوں جبکہ وہ خالص و مخلص، یکدل اور ہم آہنگ نہ ہوں کتنی کشمکش اور روحانی تکلیف کا سامنا ہوا ہے اور اس سے مقصد کو کس درجہ نقصان پہنچ جاتا ہے۔

نہروان کے بعد بھی یہ فتنے اور شورشیں بالکل ختم نہیں ہوئیں۔ ایک طرف خوارج نہروان کے ہم خیال افراد جو جنگ میں نہیں گئے تھے اور شہروں کے اندر مقیم تھے حضرت امیرؑ کے خلاف فضا میں انتشار پیدا کرتے رہتے تھے اور دوسری طرف امیر شام معاویہ جنھوں نے اہلِ کوفہ کے افتراق

---

[۱] طبری ج ۶ ص۴۲

فائدہ اٹھا کر اپنی قوت کو زیادہ منظم کر لیا تھا برابر اطرافِ مملکت میں اپنی فوجیں بھیجکر بدامنی کا سلسلہ قائم کیے ہوئے تھے جس میں خفیہ اور علانیہ ہر قسم کے اقدامات شامل تھے مثلاً مصر میں جناب امیرؑ کے بہت بڑے معاون مالک اشتر کا زہر دلوا کر خاتمہ کیا[۱] اس کے بعد محمد بن ابی بکر گورنر بنا کر بھیجے گئے تو عمرو بن عاص نے خطوط لکھ کر خود مصر کے بعض عمائد سے ساز باز کی اور پھر اپنی فوج لے کر حملہ کر دیا۔ اُدھر سے شام کی فوج اور اِدھر سے خود مصر والوں کا ایک مسلح لشکر محمد بن ابی بکر مع اپنی جماعت کے چکی کے دو پاٹوں[۲] میں آ گئے۔ آخر اُن کی فوج نے شکست کھائی اور خود انتہائی بیدردی کے ساتھ قتل کیے گئے، بلکہ لاش کو بھی آگ میں جلا دیا گیا[۳]۔ محمد ابن ابی بکر کے بعد مصر میں معاویہ کا تسلّط قائم ہو گیا۔ اسی سے ان کی ہمت اور بڑھی چنانچہ ۳۹ھ میں نعمان بن بشیر کی سرکردگی میں دو ہزار کی فوج نے عین التمر پر حملہ کیا جو ناکامی کے ساتھ پسپا ہوا[۴] سفیان بن عوف غامدی نے چھ ہزار کی فوج کے ساتھ انبار پر حملہ کیا اور اشرس بن حسان بکری کو جو جناب امیرؑ کی طرف سے وہاں مقرر تھے ان کے تیس ہمراہیوں سمیت قتل کر دیا اور تمام مال و اسباب لوٹ کر واپس چلا گیا[۵] عبداللہ بن مسعدہ فزاری نے سترہ سو آدمیوں کے ساتھ تیماء پر حملہ کیا۔ حضرت علیؓ نے مسیّب بن نجبہ فزاری کو اس کے مقابلہ کے لیے بھیجا جنھوں نے جنگ کر کے اس کو شکست دی اور اس نے شام کی جانب فرار کیا[۶] اسی صورت سے ضحاک بن قیس کو تین ہزار فوج کے ساتھ بھیجا گیا جو لوٹ مار کرتی ہوئی قادسیہ کے حدود[۷] تک پہنچ گئی اور حجر بن عدی فوج لے کر گئے، تو اس نے فرار اختیار کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ صفین کی جنگ کے بعد محسوس ہو گیا تھا کہ حضرت علیؓ سے کھلے میدان میں مقابلہ کر کے کامیابی حاصل کر لینا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے یہ گوریلا جنگ کا طریقہ اختیار کر لیا گیا تھا جس سے اسلامی ملک میں ایک مستقل خلفشار قائم رکھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس سلسلہ کا سب سے اندوہناک سانحہ بسر بن ابی ارطاۃ کا تین ہزار کی فوج کے ساتھ حجاز پر حملہ تھا جس نے مدینہ اور مکّہ والوں

---

[۱] طبری ج ۶ ص۵۴ [۲] طبری ج ۶ ص۵۸ [۳] طبری ج ۶ ص۶۰ [۴] طبری ج ۶ ص۷۷
[۵] طبری ج ۶ ص۷۷ [۶] طبری ج ۶ ص۷۸ [۷] طبری ج ۶ ص[illegible]

سے بجبر بیعت لینے کے بعد یمن کا رُخ کیا اور وہاں کئی آدمیوں کو قتل کیا۔ عبیداللہ بن عباس کا مکان لوٹا اور اُن کے دو کمسن بچوں کو ذبح کرادیا۔ پھر جب حضرت علیؑ نے مقابلہ کے لیے لشکر بھیجا تو وہ مع اپنی فوج کے فرار کر گیا[1]

یہ بزدلی کا طریقہ جنگ حضرت علیؑ کے لیے انتہائی تکلیف کا باعث تھا۔ مجبوراً پھر آپ نے تہیہ فرمالیا تھا کہ دمشق پر فوج کشی کر کے ہمیشہ کے لیے اس قصہ کو ختم کیا جائے۔ جس کے لیے آپ نے ایک نہایت پُر زور خطبہ پڑھ کر مسلمانوں کو آمادہ کر لیا مگر اس کے بعد ایک ہفتہ بھی پورا نہ ہوا تھا کہ مسجد میں عین حالتِ نماز میں ۱۹ ر ماہ رمضان کو آپ کے سر مبارک پر ابن ملجم مرادی نے زہر میں بجھی ہوئی تلوار لگائی[2] جس کے اثر سے ۲۱ ر ماہ رمضان ۴۰ھ کو آپ نے دنیا سے رحلت فرمائی۔

اس وقت حسینؑ بن علیؑ چھتیس برس کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ اس طولانی دور میں حسینؑ نے اپنے والد بزرگوار علیؑ بن ابیطالبؑ سے کیا کچھ دیکھا، کیا کچھ سُنا اور کتنا اثر لیا؟ مسلم الثبوت شیعی معتقدات سے قطع نظر کرنے کے بعد بھی عام تاریخی حالات اور ظاہری اسباب کے ماتحت یہ اہم تجربات اور گراں قدر تعلیمات جو ایک ربع صدی سے زیادہ تک حضرت امام حسینؑ کو حاصل ہوتے رہے۔ ایک انسان کے بلندی اخلاق و صفات اور پختہ کاری کے قطعی ضامن اور ذمہ دار ہیں۔

---

[1] طبری ج ۶ صفحہ ۸۰-۸۱ [2] طبری ج ۶ صفحہ ۸۴-۸۵

ساتواں باب

بنی امیہ کا اقتدار اور ان کی سیاسی روش

بنی امیہ اور اس طرح کے اکثر لوگ جو دبدبہ اور شکوہ سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے تھے ان کی نفسیاتی کیفیت وہی تھی جو ہر دبی ہوئی اور شکست خوردہ قوم کی ہوتی ہے یعنی نفرت، دشمنی، غصہ، جذبۂ انتقام اور اس کے ساتھ ساتھ ڈر جس کے نتیجہ میں وہ کھل کر اپنی عداوت کا اظہار تو نہ کر سکتے تھے مگر برابر موقع کے منتظر تھے کہ کس طرح ہم اسلام کو نقصان پہنچائیں اور اگر اس کو ختم نہ کر سکیں تو کم از کم ان خصوصیات امتیازی کو تبدیل کردیں جو اس نے قائم کیے ہیں اور جن سے ہمارے اقتدار کو صدمہ پہنچا ہے اور اسلام کے پردے ہی میں سہی ان حدود و امتیازات کو قائم کردیں جو اسلام کے پہلے عرب میں قائم تھے۔ انھوں نے اس کی تیاری تو رسولؐ کے زمانہ ہی سے شروع کردی تھی مگر پیغمبرِ اسلامؐ کی زندگی میں ان کے اس مقصد کی تکمیل مشکل تھی۔ پیغمبرؐ نے ان کے دلوں کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے واسطے ہر طرح کوشش کی مگر ان کے جذبات وہی رہے اور ایک ذرا اسلام پر کوئی مصیبت پڑتی تو ان کے چہرے خوشی سے کھل جاتے اور کبھی جذباتِ دلی زبان پر آجاتے تھے۔ چنانچہ جنگِ حنین میں جب معدودے چند کے سوا باقی تمام مسلمان میدان جنگ سے رُو بفرار ہوئے تو ابوسفیان نے کہا، بس اب یہ سمندر تک بھاگتے چلے جائیں گے۔ اور ایک نومسلم نے کہا۔ بس اب جادو ختم ہو گیا[1]

وفاتِ رسولؐ کے بعد ابوسفیان نے اسلام پر حملہ کرنے کی پہلی کوشش وہ کی جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے کہ حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے پاس آکر آپ کو تلوار اٹھانے پر آمادہ کرنا چاہا۔

---

[1] طبری ج ۳ صفحہ ۱۲۸

یقیناً اس موقع پر اگر کوئی جذباتی انسان ہوتا تو ابوسفیان کا یہ حربہ اتنا کاری ثابت ہوتا کہ اسلام کی بنیاد ہل جاتی مسلمان اسی وقت خانہ جنگی میں مبتلا ہوجاتے اور اسلام کا شیرازہ درہم و برہم ہوجاتا مگر وہ نورِ الٰہی سے دیکھنے والے نباضِ فطرت علیؑ تھے جنھوں نے مخاطب کے مقصد کو تاڑ لیا اور باوجودیکہ خلافت کا مستحق وہ صرف اپنے کو سمجھتے تھے۔ پھر بھی ابوسفیان کو ڈانٹ کر جواب دیا کہ تم ہمیشہ اسلام اور اہلِ اسلام کے دشمن رہے ہو۔

جب ادھر سے مایوسی ہوئی تب ابوسفیان نے چولا بدلا۔ اُدھر جاکر مل گئے اور اس روش میں کامیابی بھی ہوگئی۔ اس طرح کہ ١٣ھ ہجری کے آغاز میں خلیفۂ اول ابوبکر نے ملک شام پر فوج کشی کا بندوبست کیا اور سات ہزار کے لشکر کے ساتھ یزید بن ابی سفیان کو روانہ کیا[1] فوج کے دوسرے حصہ پر ابوعبیدہ جراح کو مقرر کیا گیا اور یزید بن ابی سفیان کے ساتھ سہیل بن عمرو دیگر شیوخِ قریش کو مشیر کار بنایا گیا اور اس کے بعد جب کچھ اور فوج جمع ہوئی تو اس پر معاویہ ابن ابی سفیان کو افسر مقرر کرکے یزید کے پاس روانہ کیا گیا[2]

مجموعاً یہ ستائیس ہزار کی جمعیت ہوگئی۔ ان لوگوں کی امداد کے لیے خالد بن الولید کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی فوج لے کر عراق سے پہنچ جائیں چنانچہ ۹ ہزار فوج لے کر وہ پہنچے۔ اس طرح مسلمانوں کا چھتیس ہزار کا لشکر ہوگیا۔ اسی وقت ان امراء میں سے ہر ایک کو ایک جگہ کی حکومت کے لیے نامزد بھی کردیا گیا تھا۔ چنانچہ ابوعبیدہ جراح کو حمص، شرحبیل بن حسنہ کو شرق اردن، عمرو بن عاص اور علقمہ بن مجزز کو فلسطین اور یزید بن ابی سفیان کو دمشق کا حاکم قرار دیا گیا[3]

اس فوج میں خود ابی سفیان فوج کے سرداروں کا دل بہلانے کے لیے قصہ گوئی کی خدمت انجام دیتے تھے[4]

ابوسفیان کی اولاد میں سے یزید اور معاویہ کے علاوہ ان کی ایک بہن جویریہ بنت ابی سفیان بھی اپنے شوہر کے ساتھ موجود تھیں اور انھوں نے جنگ میں شرکت بھی کی[5]

---

1 طبری ج ۴ ص ۲۸ 2 طبری ج ۴ ص ۳۰ 3 طبری ج ۴ ص ۳۲ 4 طبری ج ۴ ص ۳۴ 5 طبری

اس دوران میں خلیفۂ اوّل کا انتقال ہوگیا لیکن ملک شام میں لڑائیاں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ رجب ١٤ھ میں شہر دمشق فتح ہوا اور حسب قرارداد سابق یزید بن ابی سفیان وہاں کے حاکم ہوئے[1] اس کے بعد تدریجاً شام کے دوسرے شہر بھی فتح ہوئے۔

١٨ھ کے طاعون میں ابوعبیدہ اور یزید بن ابی سفیان دونوں کا انتقال ہوگیا[2]

ابوسفیان اس وقت مدینہ میں تھے۔ ان کو بیٹے کی اتنی فکر نہ تھی جتنی کہ شام کے ملک کی۔ چنانچہ خلیفۂ دوم نے جب انھیں بلاکر یزید کے مرنے کی اطلاع دی تو انھوں نے فوراً یہ سوال کیا کہ آپ نے اس کی جگہ پر کسے مقرر کیا؟ جب معلوم ہوا کہ معاویہ کو وہاں کا حاکم بنا دیا گیا تو وہ خوش ہوگئے[3]

اب معاویہ بن ابی سفیان کو دمشق اور اس کے مضافات' اور شرحبیل بن حسنہ کو شرق اردن اور اس کے مضافات کی حکومت ملی[4] اس کے کچھ عرصہ کے بعد شرق اردن کی حکومت بھی معاویہ ہی کو مل گئی[5]

اس دور میں ابوسفیان وغیرہ نے خوب ہی فوائد حاصل کیے۔ یہاں تک کہ ہندہ مادرِ معاویہ کو جنھیں ابوسفیان نے اب طلاق دے دی تھی مرکزی حکومت کے بیت المال سے چار ہزار درہم کی رقم قرض دی گئی جس سے انھوں نے تجارت شروع کی اور نفع خطیر حاصل کیا اور ابوسفیان دمشق گئے تو انھیں ایک دفعہ میں سو اشرفیاں بطور پرورش حاصل ہوئیں[6]

حالانکہ ان کے جذبات اسلام کے متعلق اب بھی خیرخواہی کے نہ تھے۔ چنانچہ جنگ یرموک میں جبکہ مسلمانوں کا مقابلہ سلطنتِ روم کے لشکر سے تھا اور معرکہ کارزار گرم تھا اسوقت ابوسفیان دور سے کھڑا ہوا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ جب رومیوں کو غلبہ حاصل ہوتے نظر آتا تو کہتا تھا ایہ بنی الاصفر یعنی "شاباش اے ملک روم کے بہادرو" اور جب مسلمانوں کو ذرا تقویت حاصل ہوتی تھی تو ابوسفیان کی زبان سے حسرت و یاس کے ساتھ یہ شعر نکلتا تھا ؎

وبنو الاصفر الملوك ملوك   الرّوم لم يبق منهم مذكور

---

1 طبری ج ۴ ص ۵۵ و ص ۵۹ 2 طبری ج ۴ ص ۲۰۲ 3 طبری ج ۵ ص ۶۹ 4 طبری ج ۴ ص ۲۰۲ 5 طبری ج ۵ ص ۶۹
6 طبری ج ۵ ص ۳۰

مطلب یہ تھا کہ "ہائے افسوس سلطنتِ روم کے پُرشوکت بادشاہوں کا نام مٹتے ہوئے نظر آتا ہے"۔ عبداللہ بن زبیر نے اس واقعہ کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا اور اپنے باپ زبیر سے بیان کیا۔ اس وقت کہ جب مسلمانوں کو کامل طور پر فتح حاصل ہو چکی تھی زبیر نے کہا۔ خدا اسے غارت کرے، یہ نفاق سے باز نہ آئے گا۔ کیا ہم اس کے لیے رومیوں سے بہتر نہیں ہیں؟[1]

اس کے بعد ۲۳ھ میں جب عثمان خلیفہ ہوئے تو چونکہ وہ خاندان بنی امیہ کے ایک فرد تھے، ابوسفیان وغیرہ سمجھے کہ اب ہماری بن آئی۔ دلی جذبات اتنی قوت کے ساتھ اُبلے کہ تاب نہ رہی۔ ابوسفیان اُن کے پاس آیا۔ وہ اس وقت بہت بوڑھا تھا اور آنکھوں سے بھی معذور ہو چکا تھا۔ اس نے کہا بڑی مدت کے انتظار کے بعد اب یہ خلافت تم تک پہنچی ہے۔ اب اس کو گیند کی طرح اپنی مرضی کے مطابق گردش دو اور بنی امیہ کے ذریعہ سے اس کی بنیادوں کو مضبوط کرو۔ اس لیے کہ جو کچھ ہے وہ یہی دُنیوی سلطنت۔ رہ گیا جنت و دوزخ اس کو میں کچھ سمجھتا نہیں[2]

چنانچہ ابوسفیان کے خاندان والوں نے اس خلافت سے خوب فائدہ اٹھایا اور کوئی شک نہیں کہ ابوسفیان نے اپنے دنیوی خوابوں کی تعبیر اپنی زندگی میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لی ۳۱ھ تک دمشق اور شرقِ اردن کے ساتھ ساتھ حمص، قنسرین اور فلسطین بھی معاویہ کے زیرنگین ہو گئے اور وہ بلا شرکت غیرے پورے ملک پر قابض قرار دے دیے گئے۔[3]

اسی ۳۱ھ میں ابوسفیان بن حرب ۸۸ برس کی عمر میں رہ سپارِ عالمِ آخرت ہوئے۔[4]

مگر وہ مشورہ جو انھوں نے خلیفۂ سوم کو دے دیا تھا وہی ان کے بعد ان کی جان جانے کا باعث ہوا۔ چنانچہ حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ نے اپنی سب سے پہلی ملاقات میں جو اصلاحِ حالات کے لیے خلیفۂ ثالث سے کی تھی ان سے صاف کہہ دیا تھا کہ آپ اپنے قرابتداروں کے ساتھ غیر معمولی مراعاتیں برتتے ہیں۔ ان کی غلطیوں سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ معاویہ بغیر آپ کی مرضی کے جو چاہتا ہے کرتا ہے اور لوگوں سے کہتا ہے کہ عثمان کا حکم ہے۔ آپ کو اس کا علم

[1] استیعاب [2] استیعاب [3] طبری ج ۵ ص ۶۹ [4] طبری ج ۵ ص ۶۹

ہوتا ہے اور پھر بھی آپ معاویہ کو اس پر کوئی تنبیہہ نہیں کرتے۔[1]

اب حضرت عثمان کے منہ پر یہ کہا جانے لگا تھا کہ ان کے بعد عالمِ اسلامی کی خلافت معاویہ کو ملے گی اور اس کی کوئی رد نہ کی جاتی تھی۔[2]

غالباً اسی کا نتیجہ تھا کہ جب ان کا محاصرہ ہوا اور انھوں نے معاویہ کو مدد کے لیے لکھا تو معاویہ نے اپنی جگہ سے کوئی جنبش نہیں کی بلکہ نتیجہ کے منتظر ہو گئے۔[3] کیونکہ وہ یقین رکھتے تھے کہ ان کے بعد خلافت مجھے ملیگی اور عمرو بن عاص تو صاف صاف عثمان کے خلاف اشتعال انگیزی کرتے تھے، اور جب قصرِ حکومت کا محاصرہ ہو گیا تو وہ فلسطین جا کر اپنی کوششوں کے انتظار میں بیٹھ گئے اور ہر آنے والے سے مدینہ کا حال بڑی بیتابی سے دریافت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جب قتل عثمان کی خبر ملی تو کہا، کیا کہنا میرا۔ یہ تو میری ہی کوشش کا نتیجہ ہے۔[4]

اس کے بعد یہی عمرو بن عاص معاویہ کے دست راست بنے۔ اور بڑے مناصب حاصل کیے۔ انھوں نے خود ایک موقع پر معاویہ سے صاف کہہ دیا کہ اگر حقانیت سامنے ہوتی تو ہم تمھارا ساتھ ہی کیوں دیتے۔ علیؑ کا ساتھ نہ دیتے جن کے اسلامی خدمات، فضیلت اور رسولؐ سے قرابت سب کو معلوم ہے۔ مگر ہمارے پیش نظر تو دنیا ہے۔ اسی لیے تمھارا ساتھ دے رہے ہیں۔[5]

آلِ ابوسفیان نے شام میں حکومت قائم کرنے کے بعد ابتدا ہی سے اپنی سیاسی روش شاہانہ رکھی۔ کوئی سیاح اگر ممالکِ اسلامیہ کا سفر کر کے اسلامی سادگی اور مساوات کی مثالیں دیکھ چکا ہوتا اور پھر شام جا کر وہاں کے تزک و احتشام کا مشاہدہ کرتا تو وہ حیرت و استعجاب کی ایک دنیا میں چکر لگانے لگتا۔ وہ سادگی جو اسلامی زندگی کا طرۂ امتیاز تھی وہاں نام و نشان کو بھی نہ تھی بلکہ اس کے بجائے ملوکانہ عظمت و جلالت کے مظاہرات پوری طاقت کے ساتھ نظر آتے تھے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا اور پیغمبرِ اسلامؐ کے جاری کیے ہوئے طرزِ زندگی سے مانوس بعض صحابہ

[1] طبری ج ۵ ص ۹۶ [2] طبری ج ۵ ص ۱۰۱ [3] طبری ج ۵ ص ۱۱۵ [4] طبری ج ۵ ص ۱۰۹ و ۱۱۱ [5] طبری ج ۵ ص ۲۳۵۔

کو اندیشہ ہوا کہ اس طرح اسلام کا اصول، قدر و قیمت اور معیارِ عظمت جو اس نے بڑی کوشش سے دنیوی جاہ و شوکت کی قدر و قیمت کو مٹا کر قائم کیا تھا فنا ہو جائے گا۔ چنانچہ معاویہ نے پانی پینے کے پیالے سونے کے زیادہ وزن پر فروخت کیے تو ابو درداء صحابی نے منع کیا اور کہا، ہم نے رسول اللہؐ سے سنا ہے کہ زیادہ وزن پر خرید منع ہے۔ معاویہ نے کہا، میرے نزدیک تو اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ یہ سنکر ابو درداء نے کہا۔ کیا خوب! میں تو رسول اللہؐ کا حکم بیان کر رہا ہوں اور تم اس پر اپنی رائے ظاہر کر رہے ہو۔ میں ایسے مقام پر جہاں تم ہو نہیں رہونگا۔

عبادہ بن صامت (مشہور صحابی) کے ساتھ بھی سونے کی بیع و شراء کے معاملہ میں اسی طرح کا قصہ ہوا تھا اور معاویہ نے ان کو بھی یہی جواب دیا تھا کہ ہم اس کو کسی طرح برا نہیں سمجھتے۔ عبادہ نے کہا، میں تو رسولِ خداؐ کا حکم بیان کرتا ہوں اور تم اپنی رائے بیان کرتے ہو۔ خدا مجھ اس جگہ سے نکالے۔ میں اس سرزمین پر ہرگز نہ رہوں گا جس پر تم حاکم ہو۔[۱]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک کشمکش دمشق کی سیاست اور پرستارانِ شریعت میں اس وقت سے شروع ہوگئی تھی۔

اس کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔ عبدالرحمٰن بن سہل انصاری تیسری خلافت کے دور میں ایک جہاد کے سلسلہ میں شام کی طرف گئے۔ تو انھوں نے دیکھا کہ اونٹوں پر شراب کی مشکیں بھری ہوئی جا رہی ہیں۔ وہ آگے بڑھے اور انھوں نے اپنے نیزہ سے ان مشکوں کو چاک کر دیا۔ غلاموں نے مزاحمت کی اور یہ خبر معاویہ کو پہنچائی۔ انھوں نے کہا چھوڑو اس بڈھے کو، اس کی عقل جاتی رہی ہے۔ عبدالرحمٰن نے کہا میری عقل نہیں گئی ہے مگر رسول اللہؐ نے ہم کو ممانعت فرمائی ہے کہ شراب ہمارے شکموں اور ہمارے ظروف میں داخل نہ ہو۔[۲]

انہی باتوں کا نتیجہ تھا کہ ان سن رسیدہ افراد کو جو صحابۂ رسولؐ میں محسوب ہوتے تھے معاویہ سے تنفر پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ معاویہ اہلِ شام کی ایک جماعت کے ساتھ

۱؎ سنن ابن ماجہ ج ۱ ص ۳ ۲؎ اصابہ ج ۲ ص ۴۰۱ - اسد الغابہ ج ۳ ص ۲۹۹۔

جبکہ وہ مکہ معظمہ حج کو گئے ہوئے تھے۔ صبح سویرے سعد بن ابی وقاص کی طرف سے گزرے۔ انھیں سلام کیا مگر سعد نے جواب نہیں دیا۔ معاویہ نے اپنی خفت مٹانے کو اپنے ساتھ والوں سے کہا کہ یہ سعد ہیں، حضرت رسولؐ کے صحابی۔ ان کا اصول ہے کہ سورج طالع ہونے تک کسی آدمی سے بات نہیں کرتے۔ سعد کو یہ خبر معلوم ہوئی۔ کہا۔ اس کی کوئی اصلیت نہیں مگر بخدا میں نے اس سے بات کرنا پسند نہ کی۔[۱]

اس کے بعد سلطنت دمشق جتنی طاقتور ہوتی گئی اتنا ہی اس نے اسلامی تمدن کے بجائے دنیا دارانہ تمدن کو فروغ دیا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اسلامی قدر و قیمت کے معیار اور وہ امتیازات ختم ہو گئے جو اسلام کے سادہ اور غرباء پرور اصول نے قائم کیے تھے۔ اس کا ایک نمونہ ہے ۳۰ھ میں حضرت ابوذر غفاری کا جلاوطن کیا جانا۔ ان کا ایک قصور یہ تھا کہ وہ اس سرمایہ پرستی کی مذمت کرتے تھے جو انھیں اس وقت اسلامی ملک میں نظر آرہی تھی۔ وہ غریب مسلمانوں کو بھوکا مرتے دیکھتے تو دمشق کی گلیوں میں وہ آیتیں قرآن کی پڑھتے پھرتے تھے جو سرمایہ پرستی کے خلاف ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ جو لوگ سونا چاندی خزانوں میں جمع کر رہے ہیں اور انھیں راہِ خدا میں صرف نہیں کرتے انھیں منتظر رہنا چاہیے اس وقت کا کہ جب آتشِ جہنم سے ان کی پیشانیاں، ان کے پہلو اور ان کی پشتیں داغی جائیں گی۔[۲]

یہ بھی تھا کہ وہ حکومت کی خوشامد نہیں کرتے تھے بلکہ موقع پر سچی بات کہہ گزرتے تھے۔ چنانچہ جب معاویہ نے قصرِ خضرا کی تعمیر کی تو ابوذر سے پوچھا، کیوں اسے آپ کیسا سمجھتے ہیں؟ حضرت ابوذر نے فرمایا۔ اگر تم نے اسے خدا کے مال سے بنایا ہے تو تم نے خیانت کی اور اگر خود اپنے ذاتی مال سے بنایا ہے تو اسراف کیا۔[۳]

مزاجِ قیصریت اس کا متحمل کب ہو سکتا تھا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی شکایت دارالسلطنت مدینہ میں بھیجی گئی اور وہاں سے ہدایت ہوئی کہ ابوذر کو مدینہ کی طرف روانہ کر دو۔[۴]

۱؎ الوزراء والکتاب ص ۲۶ ۲؎ طبری ج ۵ ص ۶۶ ۳؎ کتاب البلدان ص ۱۵۷ ۴؎ طبری ج ۵ ص ۶۶

جس میں جانبداری اور عدم مساوات پیدا ہو جائے اسلام کے اصول کے خلاف تھی اور اسلام کے سچے محافظین اس کے قریب نہ جا سکتے تھے۔ اس لیے آلِ رسولؐ کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ خزانہ میں روپیہ جمع کرکے دولتمند بنیں اور خصوصیت سے ان لوگوں کو زر و جواہر سے مالا مال کریں جن سے ان کو اپنے اقتدار کے قوی بنانے میں فائدہ کی امید ہو۔ یہاں تو یہ عالم تھا کہ حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ جو کچھ بیت المال میں آتا ہے روز کا روز تقسیم کر دیتے ہیں اور پھر بیت المال میں جھاڑو دلوا دیتے ہیں اور وہیں پر نماز پڑھتے ہیں کہ وہ زمین خدا کے یہاں گواہی دے کہ علیؑ نے مسلمانوں کے مال کے پہنچانے میں مستحق لوگوں تک دریغ نہیں کیا۔[1]

اصفہان سے مال آتا ہے۔ اس وقت اتفاق سے سات آدمی صاحب استحقاق موجود ہیں آپ نے تمام مال کے سات برابر حصے کر دیے اور ایک روٹی بھی اس مال میں نظر آ گئی تو اُسکے بھی سات ٹکڑے کرکے ہر حصہ میں ایک ٹکڑا رکھ دیا۔ ممکن ہے خیال کیا جائے کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا آدمی کو لحاظ نہیں کرنا چاہیے اور اس روٹی کو کسی ایک حصہ میں شامل کر دیا جاتا تو بظاہر شریعت کے مطابق کوئی جرم نہ تھا مگر یاد رکھنا چاہیے کہ ذہنیتِ عوام کی تشکیل ان ہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہوتی ہے بحضرت علیؑ ابن ابیطالبؑ تو عوام کی ذہنیت اسی مساوات کے سانچے میں ڈھالنے کا کام انجام دے رہے تھے جسے رسولؐ نے سکھایا تھا اور مسلمان رسولؐ کی رحلت کے بعد اسے بھلا بیٹھے تھے۔

اس کے برخلاف امیرِ شام کے یہاں ان باتوں کی کوئی پروا نہ تھی۔ وہاں اپنے اقتدار کے قائم رکھنے کے لیے خزانہ کا منہ کھلا تھا اور جس کو مطلب کا سمجھا جاتا تھا اسے مالا مال کر دیا جاتا تھا۔ پھر لوگ جو امتیازات کے عادی ہو چکے تھے ان کا ساتھ دیتے یا اُن کا؟

دنیا کی تو یہ حالت ہے کہ چاہے ملے ملائے کچھ نہیں لیکن اگر معلوم ہو کہ کسی کے پاس روپیہ بہت ہے اور خزانہ میں دولت جمع ہے تو یہی اس کا اثر قائم ہونے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

[1] استیعاب جلد ۲ ص۴۷

اور اس طرح اس کی ساکھ قائم ہو جاتی ہے۔ یہاں حضرت علیؑ کی یہ کیفیت کہ منبر پر اپنی تلوار کے فروخت کا اعلان کرتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ مجھے ایک لباس کی ضرورت ہے جو بغیر اس تلوار کے فروخت کیے ہوئے ممکن نہیں ہے۔ عبدالرزاق محدث نے اس روایت کو نقل کرکے لکھا ہے کہ یہ اس حالت میں تھا کہ جب سوا شام کے تمام عالمِ اسلام کی سلطنت آپ کے قبضہ میں تھی۔[1] ہر ایک حریص شخص سمجھتا تھا کہ جس کے پاس خود اپنے لباس کے لیے روپیہ نہ ہو اس کے پاس ناحق کسی دوسرے کو دینے کے لیے روپیہ کہاں ہو سکتا ہے۔

دنیا ظاہری طمطراق اور آؤ بھگت سے بھی مرعوب ہوتی ہے مگر یہاں یہ حالت تھی کہ جناب امیرؑ اپنی حکومت کے زمانے میں کبھی اس کو عار نہ سمجھتے تھے کہ میثم تمار کی دکان پر خرید و فروخت کریں۔ بازار میں قنبر کو ساتھ لے کر گئے اور دو پیراہن خریدے۔ ایک سات درہم کا اور ایک پانچ درہم کا۔ سات درہم کا پیراہن قنبر کو دیا اور پانچ درہم کا خود زیب بدن کیا۔ قنبر نے کہا یہ زیادہ قیمت والا آپ لیں۔ کوئی اور ہوتا اور وہ ایسا کرتا تو شاید جواب دیتا کہ میں مساوات کے پھیلانے اور غلاموں کا درجہ بلند کرنے کے لیے ایسا کرتا ہوں۔ علیؑ کا مقصد یقیناً ایسا ہی تھا لیکن اگر یہ جواب دیتے تو اس میں خود عدم مساوات کا پہلو مضمر تھا۔ سننے والے کو احساس غلامی ضرور پیدا ہو جاتا اس لیے آپ نے ایسا جواب دیا جو اپنے بچوں کو دیا جاتا ہے۔ فرمایا قنبر! تم نوعمر ہو، تمھیں وہی پیراہن اچھا معلوم ہوتا ہے۔ میرا کیا، میں یہی پہن لوں گا۔ ان باتوں کی قدر اہلِ دنیا کہاں کر سکتے تھے اور ان کے دل پر ان باتوں کا اثر کہاں قائم ہو سکتا تھا۔

اس کے علاوہ اسلام نے ان تمام منفرد اشخاص اور جماعتوں کے امتیازات کو ختم کیا تھا جو اس کے پہلے برسرِ اقتدار تھیں۔ وہ مقتدر جماعتیں آپس میں کتنی ہی رقیبانہ چشمک رکھتی ہوں لیکن اسلام سے زخم خوردہ وہ سب ہی تھیں۔ اس لیے اسلام کے حقیقی مقصد اور قائم کردہ امتیاز کے مٹانے میں وہ سب ہم آہنگ بن سکتی تھیں کیونکہ اس کے مٹانے میں ان میں سے ہر

[1] استیعاب ج ۲ ص۴۷

ایک کے اقتدار رفتہ کی واپسی منحصر تھی اور پھر سابق کی شکستوں کا اثر سب ہی پر تھا اور سب ہی میں جذبۂ انتقام پایا جاتا تھا۔ پھر یہ بھی کہ اسلام نے اپنے اصول مساوات کی تلقین سے خود قوم عرب کا بحیثیت قوم بھی امتیاز خاص ختم کیا تھا۔ اور پردیسیوں کے حقوق پر بڑا زور دے دیا تھا اور غیر عربی عناصر جو آتے تھے انھیں عربوں کے برابر حقوق دیے جاتے تھے۔ یہ بات تمام عرب ہی کے کھلنے کی تھی۔ بنی امیہ نے اپنے دور میں عربی تعصب کا مظاہرہ کر کے عربی قومیت کے امتیاز کی حمایت کی اور موالی اور اعجام کی کور دبانے کی کوشش کی چنانچہ اس دور کے امتیازی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ عرب اور غیر عرب کا سوال پیدا ہو گیا۔ بنی امیہ کی اس سیاسی روش کا قدرتاً یہ نتیجہ ہونا چاہیے تھا کہ عرب زیادہ تر بنی امیہ کے طرفدار ہو جاتے۔ بنی ہاشم اسلامی اصول کے حامی ہونے کی وجہ سے عربی قومیت کے اس جذبہ کی طرفداری نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے ان کا عرب کی جانبداری کا پہلو کمزور تھا۔ اس کی تصدیق اس سے ہو سکے گی کہ اس کے بعد جب بنی امیہ کے خلاف ہاشمیین یعنی بنی عباس وغیرہ نے علم بلند کیا تو ہاشمیین کا ساتھ دینے والے موالی اور عجم زیادہ تھے۔

بنی ہاشم کے قدیمی روایات اور سیادت و شرافت کے امتیاز کی وجہ سے عرب خاندانوں کو ان سے پہلے ہی حسد و عناد تھا۔ اس لیے نسلی تعصبات بھی مخالفت پر آمادہ کرتے تھے اور عرب میں قبائلی نظام بڑی قوت کے ساتھ قائم تھا۔ ہر قبیلہ کے سرگروہ اور بڑے افراد اپنے جذبات کی بناء پر جس راستے پر جاتے تھے عوام اور پست افراد اہلِ قبیلہ بھی اِن ہی کی پیروی کرتے تھے کیونکہ عوام کا کوئی نظریہ نہیں ہوا کرتا۔ وہ لیڈروں کے پابند ہوتے ہیں اور لیڈر زیادہ تر جذبات کے شکنجہ میں قید ہوتے ہیں۔ انہی باتوں کا نتیجہ تھا کہ آلِ رسولؐ کے مقابلہ میں ان کے مخالفین کی تعداد زیادہ رہتی تھی۔

نواں باب

حسن مجتبیٰؑ کی صُلح اور اس کے نتائج

سنہ ۴۰ھ — سنہ ۶۰ھ

انتقال فرمانے سے پہلے حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ نے ایک تحریری وصیت نامہ امام حسنؑ کے نام لکھا اور اس پر امام حسینؑ اور محمد بن حنفیہ اور اپنی دیگر اولاد، اعزّا اور مخصوص اصحاب کی گواہیاں لکھوائیں اور وصیت نامہ حسن مجتبیٰؑ کو سپرد کرتے ہوئے فرمایا کہ دنیا سے رخصت ہوتے وقت تم اسے حسینؑ کے سپرد کر دینا[1] اس کے علاوہ ایک وصیت آپ نے حسنؑ اور حسینؑ دونوں بھائیوں سے مشترک طور پر فرمائی وہ یہ تھی کہ "میں تم کو فرض شناسی کی وصیت کرتا ہوں اور یہ کہ تم کبھی دنیا کے طلب گار نہ ہونا، چاہے وہ دنیا خود تمھاری طلبگار رہو، اور کسی دنیوی نقصان پر کبھی رنجیدہ نہ ہونا اور ہمیشہ حق کے لیے زبان کھولنا اور ثواب کے لیے کام کرنا اور ظالم کے مدِمقابل اور مظلوم کے مددگار رہنا[2] میں تم کو اپنی تمام اولاد اور اعزّا اور ان لوگوں کو جن تک میرا پیغام پہنچے وصیت کرتا ہوں کہ ہمیشہ خدا سے ڈرتے رہنا اور اپنے شیرازہ کو منتشر نہ ہونے دینا اور اپنے درمیانی جھگڑوں کو صلح و آشتی کے ساتھ طے کرتے رہنا اور دیکھو یتیموں کا خیال رکھنا، ان کی برابر خبرگیری کرتے رہنا اور پڑوسیوں کا خیال رکھنا اس لیے کہ رسول اللہؐ نے ان کے بارے میں وصیت کی تھی، اور دیکھو قرآن کا خیال رکھنا۔ تم سے بڑھ کر کوئی قرآن پر عمل کرنے والا نہ ہو، اور نماز کا خیال رکھنا، یہ تمھارے دین کا ستون ہے۔ اور اللہ کے گھر (خانہ کعبہ) کا خیال رکھنا۔ زندگی بھر اس کو کبھی اکیلا نہ چھوڑنا، اور

---

[1] کافی ج ۱ ص ۱۸۴ [2] طبری ج ۶ ص

دیکھو خدا کی راہ میں اپنے جان و مال اور زبان سے جہاد کرتے رہنا، اور آپس میں صلۂ رحم رکھنا، اور ایک دوسرے کے ساتھ فیاضی کے ساتھ پیش آنا اور دیکھو کبھی خلق خدا کو نیک اعمال کی ترغیب دینے اور بداعمالیوں سے روکنے سے باز نہ آنا تاکہ تم پر برُے لوگوں کا اقتدار قائم نہ ہونے پائے [1] اور دیکھو میرے بعد ایسا نہ ہونے پائے کہ بنی ہاشم مسلمانوں میں میرے خون کے بہانے سے خونریزی شروع کردیں۔ زیادہ سے زیادہ میرے خون کے قصاص کے طور پر بس میرے قاتل کو قتل کیا جاسکتا ہے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ اس کو ایک ضربت کی پاداش میں بس ایک ہی ضربت لگائی جائے اور اس کو ہرگز مثلہ نہ کیا جائے۔ یعنی اعضاء و جوارح قطع نہ کیے جائیں۔ اس لیے کہ رسول اللہؐ فرما گئے ہیں کہ خبردار کسی کو مثلہ نہ کرو چاہے وہ کاٹنے والا کتا ہی کیوں نہ ہو [2]

نفسیات کے واقفکار خوب جانتے ہیں کہ کچھ وہ حالات ہوتے ہیں جن میں بات پتھر کی لکیر کی طرح سننے والے کے دل پر جم جاتی ہے۔ یہ صورت کہ ایک بزرگ مرتبہ واجب الاطاعت باپ بستر بیماری پر ہے۔ اس کی رحلت کا ہنگام قریب ہے اور اس وقت وہ اپنے تمام اہل بیتؑ میں سے دو ایک سعید فرزندوں کو خصوصیت کے ساتھ بلاکر کوئی خاص بات کہتا ہے۔ یقیناً اس وقت کی کہی ہوئی بات ان فرزندوں کے دل و دماغ پر ایسا اثر کرے گی جیسا کسی دوسرے صبر و سکون کے لمحوں کی بات اثر نہیں کرسکتی۔

عام دنیا سے جانے والے باپ اس وقت اپنی اولاد سے وصیت اپنے گھر کے نجی معاملات کے متعلق کرتے ہیں مگر آلِ محمدؐ تو دین و شریعت، کتاب اور سنت کو اپنے ذاتیات میں داخل سمجھتے تھے۔ انھوں نے اس وقت پر جو وصیتیں کی ہیں وہ سراسر مفادِ عامہ مفادِ شریعت اور احکامِ الٰہی سے متعلق تھیں۔

یوں تو یہ فرزند وہ تھے جو خود صحیح اور مناسب ہی کام کرتے مگر حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ

---

[1] نہج البلاغہ ج ۲ صفحہ ۷۸-۷۹۔ طبری اور ابوالفرج اصفہانی نے ان میں سے اکثر فقرات کو امام حسنؑ کے نام کے تحریری وصیت نامہ میں درج کیا ہے۔ مقاتل الطالبیین صفحہ ۲۵-۲۷۔ [2] طبری ج ۶ صفحہ ۸۶ نہج البلاغہ ج ۲ صفحہ ۸

کو تو بظاہر اسباب ایک مربّی باپ کی طرح اپنا فرض انجام دینا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ ان وصیتوں کا ہر ہر لفظ سعادت شعار بیٹوں کے دل پر نقش ہوجائے۔ یہ الفاظ ان کے کانوں میں ہمیشہ گونجتے رہیں کہ فرض شناسی کو اپنا اصول رکھنا۔ دنیوی جاہ و اقتدار کے کبھی طالب نہ ہونا۔ دنیوی نقصان کی کبھی پروا نہ کرنا۔ زبان پر حق کو جاری رکھنا۔ ظالم کے مدِمقابل رہنا اور مظلوم کے مددگار رہنا۔ چنانچہ ان تمام تعلیمات کو دونوں فرزندوں نے اپنے عمل سے مجسم شکل میں پیش کیا اور آپس میں ہم آہنگی کو بھی ہر صورت میں برقرار رکھا۔

یہ الفاظ کہ "خدا کی راہ میں اپنے جان و مال اور زبان سے جہاد کرتے رہنا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (اچھی باتوں کی ہدایت اور بری باتوں سے ممانعت) کو کبھی ترک نہ کرنا۔ ایسا نہ ہو کہ تم پر برُے لوگوں کا اقتدار قائم ہوجائے۔"

خصوصیت کے ساتھ ان کو عملی جامہ پہنانے کا جس طرح حسینؑ کو موقع ملا وہ دنیا کی تاریخ میں یادگار ہے۔

حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کی وفات کے بعد تمام مسلمانوں نے متفقہ طور پر آپ کے بڑے فرزند امام حسنؑ کی خلافت تسلیم کی۔ آپ پر اپنے والد بزرگوار کی شہادت کا بڑا اثر تھا۔ آپ نے اس موقع پر جو خطبہ ارشاد فرمایا اس میں حضرت علیؑ ابن ابیطالبؑ کے فضائل و مناقب تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہوئے خاص طور پر آپ کی سیرت اور ترکِ دنیا کا تذکرہ کیا اور اس ذکر میں گریہ آپ کے گلوگیر ہوا اور تمام حاضرین بھی آپ کے ساتھ بے اختیار رونے لگے۔ پھر آپ نے اپنے ذاتی اور خاندانی فضائل بیان کیے۔ اس کے بعد عبداللہ بن عباس نے کھڑے ہوکر لوگوں کو آپ کی بیعت کرنے کی طرف دعوت دی۔ اور سب نے برضا و رغبت آپ کی بیعت کی۔ یہ جمعہ کے دن ۲۱ ماہ رمضان سنہ ۴۰ھ کا واقعہ ہے [1] آپ نے اسی وقت لوگوں سے صاف صاف یہ قول و قرار لے لیا تھا کہ اگر میں صلح کروں تو تم کو صلح کرنا ہوگی اور اگر میں جنگ کروں تو تمھیں میرے ساتھ مل کر جنگ کرنا ہوگی۔ اس کے بعد آپ ملک کے بندوبست کی

طرف متوجہ ہوئے۔ اطراف میں عمّال مقرر کیے حکام معین کیے اور مقدمات کے فیصلے کرنے لگے۔

ابھی ملک حضرت علیؑ کے غم میں سوگوار ہی تھا اور حضرت امام حسنؑ پورے طور پر انتظامات بھی نہ کر چکے تھے کہ معاویہ کی طرف سے آپ کی مملکت میں دراندازی شروع ہوگئی اور ان کے خفیہ کارکن ریشہ دوانیاں کرنے لگے۔ چنانچہ ایک شخص قبیلۂ حمیر کا کوفہ میں اور ایک شخص بنی قین میں سے بصرہ میں پکڑا گیا۔ یہ دونوں اس مقصد سے آئے تھے کہ یہاں کے حالات سے دمشق میں اطلاع دیں اور فضا کو امام حسنؑ کے خلاف ناخوشگوار بنائیں۔ غنیمت ہے کہ اسکا انکشاف ہوگیا۔ حمیر والا آدمی کوفہ میں ایک قصائی کے گھر سے اور قین والا آدمی بصرہ میں بنی سلیم کے یہاں سے گرفتار کیا گیا اور دونوں کو جرم کی سزا دی گئی۔ اس واقعہ کے بعد حضرت امام حسنؑ نے معاویہ کو ایک خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ "تم اپنی دراندازیوں سے باز نہیں آتے ہو۔ تم نے لوگ بھیجے ہیں کہ میرے ملک میں بغاوت پیدا کرائیں اور اپنے جاسوس یہاں پھیلا دیے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم جنگ کے خواہشمند ہو۔ ایسا ہے تو پھر تیار رہو۔ یہ منزل کچھ دور نہیں ہے نیز مجھ کو خبر معلوم ہوئی ہے کہ تم نے میرے باپ کی وفات پر طعن و تشنیع کے الفاظ کہے یہ ہرگز کسی ذی ہوش آدمی کا کام نہیں ہے۔ موت سب کے لیے ہے۔ آج ہمیں اس حادثہ سے دوچار ہونا پڑا تو کل تمھیں ہوگا، اور حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنے مرنے والے کو مرنے والا سمجھتے نہیں۔ وہ تو ایسا ہے جیسے کوئی ایک مکان سے منتقل ہو کر اپنے دوسرے مکان میں جائے اور آرام کی نیند سوئے۔" اس خط کے بعد معاویہ اور امام حسنؑ کے درمیان بہت سے خطوط کی ردّ و بدل ہوئی[1]۔ بہرحال ان واقعات سے یہ امر بالکل ظاہر ہوگیا کہ امیر شام معاویہ کو جناب امیرؑ کی ذات سے کوئی وقتی عداوت نہ تھی ورنہ وہ ان کی شہادت کے ساتھ ختم ہو جاتی بلکہ یہ آلِ رسولؐ سے ایک مستقل دشمنی ہے جس کے نتائج آئندہ دیکھیے کیا ہوں۔ یہ بھی اس واقعہ سے ثابت ہوگیا کہ ملک میں دشمن کے جاسوسوں اور مخبروں کے لیے جائے پناہ

---

۱ ارشاد ص۱۹۲-۱۹۳

موجود ہے اور اگر دو ایک واقعات کا انکشاف ہوا اور دو آدمی گرفتار ہو گئے تو یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ ایسے ہی کچھ دوسرے لوگ موجود نہیں ہیں جن کا انکشاف نہیں ہو سکا ہے اور جنھیں کافی کام کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ بہرحال امام حسنؑ دشمن کے مقابلہ کے لیے تیار تھے اور حق کے بارے میں اس کے ساتھ کوئی مراعات کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ بیشک آپ کو اور آپ کے ساتھ حسینؑ کو اپنے ملک کی فضا کی طرف سے بے اطمینانی ضرور تھی۔ اس لیے کہ خوارج کے فتنہ کے بعد سے خود اہل کوفہ میں پھوٹ پڑ چکی تھی اور بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو بظاہر حضرت علیؑ کی فوج میں شامل تھے مگر قرابت، دوستی یا کسی اور وجہ سے خوارج کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے۔ حضرت امیرؑ کو خود ان لوگوں کی شورش پسندی، اختلاف رائے اور نظم کی کمی سے اتنی تکلیف اور پریشانی تھی کہ آپ موت کے آرزومند تھے۔ تمام کتب تاریخ اور بالخصوص نہج البلاغہ میں وہ خطبے آپ کے درج ہیں جو آپ کی کبیدہ خاطری بلکہ روحانی تکلیف کے مظہر ہیں۔ آپ نے ان کو مخاطب کر کے کبھی فرمایا کہ تم نے میرا دل پیپ سے بھر دیا اور میرے سینہ کو غم و غصّہ سے پُر کر دیا[1]۔ کبھی فرمایا کہ کاش معاویہ میرے ساتھ اپنی جماعت کا تمھاری جماعت سے تبادلہ کر لیتا۔ اس طرح جیسے سونے کے سکّہ کا تبادلہ چاندی کے سکّہ سے ہوتا ہے۔ یعنی تم میں سے دس لے لیتا اور اپنوں میں کا ایک مجھے دے دیتا[2]۔ کبھی فرمایا، کتنے افسوس کی بات ہے کہ اہلِ شام باطل راستے پر متفق ہیں اور تم حق راستے پر ہو کے باہم تعاون نہیں رکھتے[3]۔ اہلِ شام اپنے حاکم کی اطاعت کرتے ہیں درانحالیکہ وہ خدا کی نافرمانی کرتا ہے اور تم اپنے امام کا کہنا نہیں مانتے درانحالیکہ وہ خدا کی اطاعت کرتا ہے[4]۔ اور کبھی فرمایا کہ تم لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ جہاد کے لیے چلو جاڑے کے زمانہ میں تو تم کہتے ہو کہ یہ کڑاکے کا جاڑا ہے ہمیں اتنی مہلت دیجیے کہ یہ سردی کم ہو جائے اور جب تم سے کہا جاتا ہے گرمی کے زمانہ میں تو کہتے ہو کہ یہ تو تڑاقے کی گرمی ہے۔ اتنی مہلت دیجیے کہ یہ گرمی کم ہو جائے۔ افسوس! تم گرمی اور سردی سے اتنا بھاگتے ہو تو تلوار کی آنچ

---

۱ الاخبار الطوال ص۲۱۴۔ نہج البلاغہ ج ۱ ص۶۷ (۲) ارشاد ص۱۴۲۔ نہج البلاغہ ج ۱ ص۲۰۵ (۳) ارشاد ص۱۴۸ نہج البلاغہ ج ۱ ص۷۲ (۴) ارشاد ص۱۴۴۔ نہج البلاغہ ج ۱ ص۲۰۵

سے اور زیادہ بھاگو گے[1]

یہی وہ جماعت تھی کہ جس سے اب امام حسنؑ کو سابقہ پڑا تھا۔ آپ ان لوگوں کی حالتوں سے اچھی طرح واقف تھے اور یقیناً امیر شام کو بھی اپنے جاسوسوں کے ذریعہ سے یہاں کے حالات کا علم ہو گیا ہوگا اور وہ یہ بھی سمجھتے ہوں گے کہ امیر المومنین حضرت علیؑ کی جو ہیبت تمام عرب کے قلوب پر چھائی ہوئی تھی وہ بالکل اسی درجہ پر حضرت حسنؑ کے لیے ابھی حاصل نہیں ہوسکتی اس لیے انھیں ہمت ہوئی کہ وہ یکایک عراق پر حملہ کر دیں۔ چنانچہ وہ اپنی فوجوں کو لے کر جسر منبج تک پہنچ گئے۔ اب امام حسنؑ نے بھی مدافعت کے انتظامات شروع کیے اور حجر بن عدی کو بھیجا کہ وہ دورہ کر کے تمام مقامات کے عاملوں کو صورتِ حال کا مقابلہ کرنے پر آمادہ کریں اور لوگوں کو جہاد کے لیے تیار کریں۔ مگر اندازہ کے بالکل مطابق یہ افسوسناک صورت سامنے آئی کہ لوگوں نے حجر بن عدی کی کوشش کا گرمجوشی کے ساتھ استقبال نہیں کیا۔ عام طور پر جمود اور سرد مہری سے کام لیا گیا۔ کچھ تھوڑی سی جمعیت مقابلہ کے لیے تیار ہوئی تھی تو اس میں کچھ حصہ خوارج کا تھا جو کسی نہ کسی حیلہ سے معاویہ سے جنگ کرنا ہی چاہتے تھے۔ کچھ شورش پسند اور مالِ غنیمت کے طلبگار اور کچھ لوگ صرف اپنے سرداران قبائل کے دباؤ سے بادلِ ناخواستہ ساتھ ہو گئے تھے جنھیں فرض کے احساس سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ تھوڑے لوگ وہ ہوں گے جو واقعی حضرت علیؑ اور امام حسنؑ کے شیعہ سمجھے جا سکتے ہیں[2] بہرحال حضرت امام حسنؑ نے قیس بن سعد بن عبادہ انصاری کو بیس ہزار کی فوج کے ساتھ آگے روانہ کیا اور خود مقام دیرِ کعب کے قریب ساباط میں جا کے قیام کیا۔ یہاں پہنچ کر نمایاں طور سے آپ کو اپنے ساتھیوں کی سرد مہری کا مشاہدہ ہوا۔ آپ نے ان لوگوں کو جمع کر کے خطبہ ارشاد فرمایا جس کا مضمون یہ تھا کہ "دیکھو میں تمام خلق سے زیادہ خلقِ خدا کا بہی خواہ ہوں اور مجھے کسی مسلمان سے کینہ نہیں۔ آگاہ ہونا چاہیے کہ اتفاق و اتحاد چاہے تمھیں ناپسند ہو اختلاف و افتراق سے بہتر ہے چاہے وہ تمھیں کتنا ہی پسند ہو

[1] ... ۱۵۱ نہج البلاغہ ج ۱ ص۷۷ [2] ارشاد ص۱۹۳

یاد رکھو کہ میں تمھارے فائدے کے لیے تم سے بہتر سوچنے کا حق رکھتا ہوں۔ تم کو لازم ہے کہ میری رائے سے انحراف اور میرے حکم کی مخالفت نہ کرو۔ آپ کی تقریر کا ختم ہونا تھا کہ مجمع میں بدنظمی پیدا ہو گئی اور خوارج نے پکار پکار کر کہنا شروع کیا کہ یہ کافر ہو گئے۔ کچھ لوگوں نے آپ پر حملہ کر کے آپ کے قدموں کے نیچے سے مصلّا کھینچ لیا اور دوشِ مبارک پر سے چادر بھی اتار لی۔ آپ فوراً گھوڑے پر سوار ہو گئے اور آوازِ بلند سے پکارا کہ کہاں ہیں ربیعہ اور ہمدان۔ یہ دونوں قبیلے اِدھر اُدھر سے دوڑ پڑے اور شورش پسندوں کو آپ سے دور کیا[1]

ابن جریر کی روایت یہ ہے کہ کسی نے خبر اڑا دی کہ قیس بن سعد قتل ہو گئے۔ بس اس پر یہ غدر مچ گیا اور وہ خیمہ جس میں امام حسنؑ کا قیام تھا لوٹ لیا گیا۔ یہاں تک کہ جس بچھونے پر آپ تھے اسے آپ کے نیچے سے کھینچ لیا گیا[2]

اس کے بعد آپ مدائن کی طرف روانہ ہو گئے مگر وہاں پہنچنے پر جراح بن قبیصہ اسدی نے جو انہی خوارج میں سے تھا کمینگاہ میں چھپ کر خنجر سے حملہ کر دیا جس سے آپ زخمی ہو گئے۔ عرصہ تک مدائن میں علاج کے بعد آپ اچھے ہوئے اور پھر معاویہ سے مقابلہ کی تیاری کی۔

معاویہ نے آپ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ جن شرائط پر چاہیں میں صلح کرنے پر تیار ہوں اور اس کے ساتھ آپ کی فوج کے ان سرداروں کے خطوط بھی روانہ کر دیے جنھوں نے خفیہ طریقہ پر معاویہ سے سازباز کرنا چاہی تھی اور دعوت دی تھی کہ آپ آیئے تو ہم حسنؑ کو گرفتار کر کے آپ کے سپرد کر دیں گے یا ان کو قتل کر ڈالیں گے[3]

امام حسنؑ پہلے ہی اپنے ساتھیوں کی غداری سے واقف تھے اور اس لیے جنگ کو مناسب وقت خیال نہیں کرتے تھے لیکن یہ ضرور چاہتے تھے کہ کوئی صورت ایسی پیدا ہو کہ باطل کی حمایت کا دھبّا بھی میرے دامن پر نہ آنے پائے۔ اس خاندان کے لوگوں کو حکومت و اقتدار کی تو ہوس کبھی رہی نہیں، انھیں تو مطلب اس سے تھا کہ مخلوقِ خدا کی بہتری ہو اور حدود و حقوقِ الٰہی کا

[1] ارشاد ص۱۹۴ [2] طبری ج ۶ ص۹۲ [3] صحیح بخاری ج ۲ ص۱، ارشاد ص۱۹۵

اجرا ہو۔ اب معاویہ نے جو آپ سے منہ مانگے شرائط پر صلح کرنے کی آمادگی ظاہر کی تو آپ نے
اپنے نانا اور باپ کی دیکھی ہوئی سیرت کے مطابق مصالحت کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو ناکام واپس
نہیں کیا۔ آپ نے صلح کے شرائط مرتب کرکے معاویہ کے پاس روانہ کیے۔ وہ تمام شرائط جن
سے قانونی طور پر آئین و شریعت کا تحفظ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ صلح کی دستاویز مکمل ہوئی اور
جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ حضرت امام حسینؑ اپنے باپ کی وفات کے بعد اپنے بڑے بھائی حضرت امام
حسنؑ کے ساتھ ان سرد و گرم حالات کا برابر مطالعہ کر رہے تھے۔ انھوں نے ان واقعات پر
کبھی ایک غیر متعلق انسان کی طرح نظر نہیں ڈالی بلکہ وہ اس کو اپنی سرگزشت سمجھتے تھے اور جانتے
تھے کہ ہمیں اسی حال پر مستقبل کی عمارت کو بلند کرنا ہے۔ اس وقت کے واقعات کا یہ پہلو بہت اہم تھا
کہ ساتھیوں کی کثرت اور جمعیت پر اعتماد کا خیال کلیتہً دور ازکار ہے۔ حسینؑ اپنے والد بزرگوار کے
ساتھ ایک دفعہ ان ساتھیوں کے عمل کو دیکھ چکے تھے کہ وہ ان کے سامنے تلواریں کھینچ کر آ گئے
اور اب اپنے بڑے بھائی کے ساتھ ساتھیوں کے طرزِ عمل کو دیکھ لیا کہ خود اپنی فوج کے ہاتھوں
کس طرح ان کے بھائی کی جان خطرہ میں پڑ گئی تھی۔ ممکن ہے کسی وجہ سے اس وقت حسین اپنے
بڑے بھائی کے پاس موجود نہ ہوں اور ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس سخت اور ناگوار
موقع پر کوئی تذکرہ امام حسین علیہ السلام کا نظر نہیں آتا مگر انھوں نے یقیناً ان حالات کو
دردمندانہ طریقہ پر سنا اور اس زخم کو دیکھا ہوگا جو اُن کے بھائی کے جسم پر خود اپنے ساتھ
والوں میں سے کسی کے ہاتھ سے آ گیا تھا اور اس کا اثر ان کے حساس دل پر جتنا بھی ہوا ہو وہ کم ہے۔
اس کے علاوہ آپ نے اپنے بزرگوں کی سیرت میں ایک دفعہ یہ نمونہ اور دیکھ لیا کہ امن عالم
کے لیے نقطۂ اوّل صلح و سلامتی ہے۔ جنگ کا درجہ صلح کے بعد ہے اور صلح کے امکانات
پیدا ہونے تک ہے اس لیے صلح کے خیال کو جنگ کے پہلے اور جنگ کے دوران میں ہمیشہ
پیش نظر رکھنا چاہیے۔ دشمن سے صلح کی گفتگو کو کبھی اپنی خود داری کے خلاف نہ سمجھو چاہے
[illegible] معترض بھی ہوں اور چاہے اس کے لیے تمھیں اپنے جاہ و اقتدار

راحت و آرام یا کسی دوسرے شخصی مفاد کی قربانی بھی کر دینا پڑے مگر یہ خیال ضروری ہے کہ
اس صلح کے اندر کوئی ایسا اصول پامال نہ ہونے پائے جس کا محفوظ رکھنا بہرحال اپنا مقدس فریضہ
ہے۔ یہی نمونہ حسینؑ نے اپنے نانا سے دیکھا تھا، یہی ان کو اپنے باپ کے ہاں نظر آیا اور یہی
اب ان کو اپنے واجب الاطاعت بھائی امام حسنؑ کی جانب سے پیش نظر تھا۔

ایک بات ضمنی طور پر اور دوبارہ سامنے آ گئی۔ وہ یہ کہ سچائی کے راستہ میں اگر اتمام حجت کی
ضرورت ہو تو دوست نہیں بلکہ دشمن کے بھی اقرار پر بھروسا کر لینا چاہیے۔

اس صلحنامہ کے مکمل شرائط جو علامہ ابن حجر مکی نے درج کیے ہیں حسب ذیل ہیں[۱]:۔

۱۔ یہ کہ معاویہ حکومتِ اسلام میں کتابِ خدا اور سنتِ رسولؐ اور صحیح راستے پر چلنے والے
خلفائے راشدین کے طریقہ پر عمل کریں گے[۲]۔

۲۔ یہ کہ معاویہ کو اپنے بعد کسی خلیفہ کے نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا۔

۳۔ یہ کہ شام و عراق و حجاز و یمن سب جگہ کے لوگوں کے لیے امان رہے گی۔

۴۔ یہ کہ حضرت علیؑ کے اصحاب اور شیعہ جہاں بھی رہیں ان کے جان و مال اور ناموس و
اولاد محفوظ رہیں گے[۳]۔

۵۔ یہ کہ معاویہ حسنؑ بن علیؑ اور ان کے بھائی حسینؑ اور کسی کو بھی خاندانِ رسولؐ میں کوئی
نقصان پہنچانے یا ان کی جان لینے کی کوشش نہ کریں گے۔ نہ خفیہ طور پر اور نہ علانیہ اور
ان میں سے کسی کو کسی جگہ دھمکایا، ڈرایا اور دہشت میں مبتلا نہیں کیا جائیگا۔

یہ معاہدہ ربیع الاول یا جمادی الاولیٰ ۴۱ھ کو عمل میں آیا۔

اگر غور کیا جائے تو اس صلح کے ذریعہ سے حضرت امام حسنؑ نے وہ مقصد حاصل کر لیا تھا
جس کے لیے ان کی اپنے فریق مخالف سے منازعت تھی۔

---

[۱] صواعق محرقہ ص۸۱ [۲] شیعہ ماخذوں میں اس شرط کے آخری جزء کا ذکر نہیں ہے۔
[۳] اس شرط کے ثبوت کے لیے ملاحظہ ہو طبری ج ۶ ص۹۲۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ حضرات ذاتی اغراض کے لیے کسی سے مخاصمت نہیں رکھتے تھے۔ انکی لڑائی جو کچھ بھی وہ اصولِ شریعت و مذہب کے لیے۔ حضرت امام حسنؑ نے صلحنامہ کی پہلی شرط کے لحاظ سے امیرِ شام کو پابند بنا دیا کہ وہ کتاب و سنت کے مطابق عمل کریں۔ اس سے آپ نے ایک طرف تو یہ بات ہمیشہ کے لیے مسلّم بنا دی کہ اصولِ شریعت اور ہے آئینِ حکومت اور ہے۔ یہ وہ بڑی چیز تھی جس کے لیے آلِ محمدؐ برابر کوشاں رہے تھے یعنی کبھی ایسا نہ ہو کہ حکّامِ اسلام کا طرزِ عمل عینِ شریعت سمجھ لیا جائے۔ دوسرا امر یہ بھی آپ نے ثابت کر دیا بلکہ فریقِ مخالف سے تسلیم کرا لیا کہ اب تک جو کچھ حکومتِ شام کا رویہ رہا ہے وہ کتاب اور سنت کے مطابق نہیں ہے کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ صلحنامہ کی بنیادی چیزیں وہی ہوتی ہیں جو دو فریقوں میں بنائے مخاصمت ہوں۔ اگر حکومتِ شام کا سابقہ طرزِ عمل اب تک برابر کتاب و سنت کے مطابق ہوتا تو اس شرط کی ضرورت کیا تھی۔ اس کے بعد دوسری اہم شرط یہ قرار دی کہ ان کو اپنے بعد کسی کو نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا۔ اس طرح آپ نے مستقبل کا تحفظ کیا کیونکہ یہ ممکن تھا کہ معاویہ اپنی زندگی بھر کتاب اور سنت کے مطابق عمل کرتے لیکن بعد میں کوئی ایسا آتا جو اس کے خلاف کرتا۔ اس لیے آپ نے آیندہ کے لیے جانشین بنانے کے حق کو سلب کر لیا۔

بہرحال صلح ہو گئی۔ فوجیں واپس چلی گئیں اور معاویہ کی گرفت تمام ممالکِ اسلامیہ پر مضبوط ہو گئی اور اب شام و مصر کے ساتھ عراق و حجاز، یمن اور ایران وغیرہ بھی ان کے تصرف میں آ گئے۔ حضرت امام حسنؑ کو اس صلح کے بعد اپنے ساتھ کے بہت سے لوگوں کی طرف سے انتہائی دلخراش اور توہین آمیز الفاظ سننا پڑے جن کا برداشت کرنا انہی کا کام تھا۔ بعض لوگ ایسے جو کل تک "امیرالمومنین" کہہ کے تسلیم بجا لاتے تھے آج "مذلّ المومنین" یعنی "مومنین کی جماعت کو ذلیل کرنے والے" کے الفاظ سے سلام کرتے تھے مگر امام حسنؑ نے صبر و استقلال اور نفس کی بلندی کے ساتھ ان تمام ناگوار حالات کو برداشت کیا اور معاہدہ پر سختی کے ساتھ قائم رہے لیکن معاویہ نے جنگ کے ختم اور سیاسی اقتدار کے قائم ہوتے ہی عراق میں داخل ہو کر نخیلہ پر جسے کوفہ کی سرحد سمجھنا چاہیے قیام کیا

اور جمعہ کے خطبہ کے بعد یہ اعلان کر دیا کہ میرا مقصد جنگ سے یہ نہ تھا کہ تم لوگ نماز پڑھنے لگو۔ روزے رکھنے لگو، حج کرو یا زکوٰۃ ادا کرو۔ یہ سب تو تم کرتے ہی ہو۔ میرا تو مقصد جنگ سے فقط یہ تھا کہ میری حکومت تم پر مسلّم ہو جائے۔ وہ حسنؑ کے اس معاہدہ کے بعد مکمل ہو گئی اور باوجود تم لوگوں کی ناگواری کے خدا نے مجھے اس مطلب میں کامیاب کر دیا۔ رہ گئے وہ شرائط جو میں نے حسنؑ کے ساتھ کیے ہیں وہ سب میرے پیروں کے نیچے ہیں اور ان کا پورا کرنا یا نہ کرنا میرے ہاتھ کی بات ہے۔[1] مجمع میں ایک سناٹا چھایا ہوا تھا مگر اب کس میں دم تھا کہ وہ اس کے خلاف زبان کشائی کرتا۔

اقتدارِ شاہی کی جرأت اس نقطہ تک پہنچی کہ کوفہ میں امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی موجودگی میں معاویہ نے حضرت امیرؑ اور امام حسنؑ کی شان میں نامناسب کلمات استعمال کیے۔ اس پر سکوت کرنا اعتراف و اقرار کا مرادف سمجھا جا سکتا تھا۔ اس لیے فوراً امام حسینؑ جواب دینے کے لیے کھڑے ہو گئے مگر حضرت امام حسنؑ نے آپ کو بٹھا دیا اور خود کھڑے ہو کر نہایت مختصر اور جامع الفاظ میں امیرِ شام کی تقریر کا جواب دیا۔[2] حسینؑ جانتے تو پہلے ہی تھے مگر اس وقت سے محسوس کر لیا تھا کہ حالات کی رفتار کیا ہے اور ہم کو اس کا آخری مقابلہ کس طرح کرنا ہوگا۔ مگر وہ جلد باز انسان نہ تھے، نہ وہ ذمہ داریوں کے محل سے ناواقف تھے۔ انھیں صبر آزما انتظار کے ساتھ حالات کی تدریجی رفتار کے دوش بدوش اپنے کردار کی منزل کو آگے بڑھانا تھا اور اس کے پہلے ایک فرض شناس انسان کی طرح اپنے بھائی کے ساتھ وقت کی موجودہ آئین گر پُراضطراب خاموشی میں غرق رہنا تھا۔

حضرت امام حسنؑ نے امورِ سلطنت سے کنارہ کشی اختیار کرنے کے بعد کوفہ کا قیام ترک کر کے پھر سے مدینہ میں جا کر سکونت اختیار فرمائی تو حسینؑ نے بھی بھائی کا ساتھ دیا اور مدینہ میں جا کر قیام فرمایا۔ مگر اس اتحادِ عمل کے باوجود بھی بنی امیہ نے یہ غلط شہرت دی کہ اس صلح کے بارے میں حضرت امام حسنؑ اور امام حسینؑ دونوں بھائیوں کی یک جہتی میں واقعی کوئی

[1] ارشاد ص ۱۹۶ [2] ارشاد ص ۱۹۶

فرق آہباے نگران کے تمام توقعات بالکل غلط ثابت ہوئے۔

حسینؓ قول، عمل اور مسلک میں اپنے بھائی امام حسنؓ کے ساتھ بالکل متحد تھے اور ہمیشہ رہے۔ آپ کو معلوم تھا کہ امام حسنؓ نے اگرچہ اتمام حجت کے لیے خاموشی اور گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے مگر خیال ان کا بھی یہی ہے کہ آخر میں پھر تلوار درمیان میں آئے گی اور آخری فیصلہ بغیر ایک سخت اور مشکل اقدام کے نہ ہو سکے گا اور وہ اس کے لیے تیار بھی ہیں بشرطیکہ حالات کی تدریجی رفتار انہی کے دورِ حیات میں اس آخری نقطہ تک پہنچ جائے۔ جو اس آخری اقدام کے لیے ضروری ہے۔

امام حسنؓ اکثر یہ اشعار بطور تمثیل پڑھا کرتے تھے ؎

من عاذ بالسیف لاقی فرصة عجبا ۔۔۔ موتا علی عجل او عاش منتصما

لا ترکبوا السّھل ان السّھل مفسدة ۔۔۔ لن تدرکوا المجد حتّی ترکبوا عنفا

"جو تلوار کو اپنا پشت پناہ بنائے وہ عجیب سکون و اطمینان حاصل کر لیگا یا دنیا سے جلد ہی گزر جائے اور یا زندگی ایسی جو دادرسی کے ساتھ ہو۔ کبھی سہولت پسندی سے کام نہ لو۔ سہولت پسندی بڑی خرابی کی بات ہے۔ عزت حاصل کر ہی نہیں سکتے جب تک کہ دشوار گزار منزل کو طے نہ کرو۔" [1]

رہ گئے موجودہ حالات، ان کے لحاظ سے امام حسینؓ بھی اس صلح سے متفق تھے چنانچہ بروایت دینوری جب حجر بن عدی اور عبیدہ بن عمرو جو صلح کے معاملہ میں اختلاف رکھتے تھے امام حسینؓ کے پاس آئے اور کہا، آپ لوگوں نے عزت کے بدلے میں ذلّت کو خرید لیا۔ کم حقوق حاصل کر کے بہت سے حقوق سے دست کشی کر لی۔ اچھا اب آپ بذاتِ خود آج ہماری ایک بات مان لیجئے پھر کبھی کوئی بات نہ مانیے گا۔ وہ یہ ہے کہ آپ حضرت امام حسنؓ کو تو اس صلح کے راستے پر جو انھوں نے اختیار کیا ہے چھوڑ دیجیے لیکن آپ اپنے ساتھیوں کو جو کوفہ میں ہیں یا کوفہ کے باہر ہیں جمع کیجیے اور ہم دونوں کو مقدمۃ الجیش کا افسر بنا دیجیے۔ پھر دیکھیے گا کہ معاویہ کو خبر بھی نہ ہوگی اور ہم اچانک تلواریں مارتے ہوئے نظر آئیں گے۔ حضرت امام حسینؓ نے فرمایا، یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم عہد کر چکے اور

[1] کتاب البلدان لابن الفقیہ الھمدانی طبع لیدن ص۵۳

قول و قرار ہو چکا۔ اسی طرح علی بن محمد بن بشیر ہمدانی کا بیان ہے کہ میں سفیان بن ابی لیلیٰ کی معیت میں مدینہ پہنچا اور امام حسنؓ کے پاس ملنے گیا۔ آپ کے پاس اس وقت مسیب بن نجبہ، عبداللہ بن وداک تمیمی اور سراج بن مالک خثعمی موجود تھے۔ میں نے کہا۔ السلام علیك یا مذل المومنین "سلام ہو آپ کو اے مومنین کو ذلیل کرنے والے۔" آپ نے فرمایا وعلیک السلام۔ بیٹھو۔ میں مومنین کی ذلّت کا باعث نہیں ہوں۔ میں نے تو ان کی عزت رکھ لی اور ان کو خونریزی سے بچا لیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اب جنگ کا جوش اور ولولہ باقی نہیں ہے اور کمزوری نمایاں ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اگر جنگ جاری رکھی گئی تب بھی ایک دن یہی ہونا ہے کہ معاویہ کی بادشاہت قائم ہو جائے۔" اب یہ لوگ حضرت کے پاس سے اٹھ کر امام حسینؓ کے پاس گئے اور پوری گفتگو حضرت امام حسنؓ کی بیان کی۔ آپ نے فرمایا سچ کہا ابو محمد (حضرت حسنؓ) نے تمھیں لازم ہے کہ ہر شخص تم میں سے خاموش ہو کر گھر میں بیٹھ جائے اور بیٹھا رہے اس وقت تک کہ جب تک یہ شخص (معاویہ) زندہ ہے۔" [1]

یہ آخری فقرہ درحقیقت بڑا دوررس تھا۔ آپ سمجھتے تھے کہ معاہدہ کی پابندی نہیں ہوگی اور آپ جانتے تھے کہ یہ معاہدہ موت کی آخری ہچکی اس وقت لے گا جب معاویہ دنیا سے جانے لگیں گے اور اپنے بعد جانشین نامزد کر جائیں گے۔ وہ وقت ہوگا جب ہماری جانب سے کوئی دوسرا اقدام کیا جائے۔ آئندہ چل کر دنیا کو حسینؓ کے تدبر کی داد دینا پڑے گی جنھوں نے بیس برس پہلے یعنی ۴۱ھ کے آئینہ میں ۶۰ھ کی تصویر اپنی آنکھ سے دیکھ لی اور حسینؓ کی پیش بینی آئندہ چل کر حرف بحرف پوری ہو کر رہی۔

اس معاہدہ کے بعد اب بنی امیہ کی قوت بہت مستحکم ہو گئی تھی۔ ان کے راستے میں جو ایک خرخشہ تھا وہ بالکل دور ہو گیا تھا۔ اور انھیں اپنی اسکیم کے پورا کرنے کا پورا موقع مل گیا تھا۔ چنانچہ جتنی شرطیں ہوئی تھیں سب کی مخالفت کی گئی اور کسی ایک پر بھی عمل نہ ہوا۔ [2]

[1] الاخبار الطوال ص۲۲۲ [2] طبری ج ۶ ص۹۳

پہلی شرط یہ تھی کہ کتاب خدا اور سنتِ رسولؐ پر عمل ہوگا۔ یہ شرط مسلمانوں کے کسی فرقہ کے نزدیک بھی پوری نہیں ہوئی۔ شیعوں کا عقیدہ تو اس بارے میں ظاہر ہے اور اہلسنت کے نقطۂ نظر سے حضرت رسول اللہؐ کی وفات کے بعد صرف تیس برس تک خلافت راشدہ رہی ہے اور یہ تیس برس کی مدت ختم ہو جاتی ہے حضرت امام حسنؑ کی صلح پر۔ اس کے بعد ملوکیت و جہانبانی اور دنیا داری ہے، خلافتِ راشدہ نہیں ہے۔ اگر یہ شرط پوری ہوئی ہوتی کہ کتابِ خدا اور سنتِ رسولؐ پر عمل ہو تو کوئی وجہ نہ تھی کہ معاویہ کی حکومت خلافتِ راشدہ کے حدود سے خارج ہوتی۔ عمر بن عبدالعزیزؒ تک کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ ان کا زمانہ خلافتِ راشدہ سے ملتا جلتا ہے مگر فاصلہ ہونے کی وجہ سے اس میں محسوب نہیں ہوا۔ مگر معاویہ کے دورِ حکومت کے متعلق کسی نے یہ رائے ظاہر نہیں کی۔ معلوم ہوا کہ تمام مسلمانوں کے نزدیک اس شرط پر عمل نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ واقعات سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی چند مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:-

ان میں سے ایک بات تھی سیاسی مصالح کی بنا پر زیاد بن سمیہ کو اپنے باپ کا ناجائز فرزند بنا کر اپنا بھائی قرار دینا حالانکہ اسلام میں ناجائز فرزند کو نسب میں شریک نہیں کیا گیا ہے۔ تفصیل اس کی یوں ہے کہ زیاد پہلے زیاد بن عبید کہلاتا تھا کیونکہ اس کی ماں سمیہ ایک ثقفی قبیلہ والے شخص کے غلام عبید کی زوجیت میں تھی اور یہ خود حارث بن کلدہ کی کنیز تھی۔ حارث نے اسکو آزاد کر دیا تب اس کے یہاں زیاد پیدا ہوا اور اس لیے زیاد غلامی سے خارج رہا اور بڑھا تو بڑا سمجھدار اور ذہین اور عقلمند اور ادیب دیکھا گیا۔ مغیرہ بن شعبہ جب خلیفۂ دوم کی طرف سے بصرہ کے حاکم ہوئے تو وہ زیاد کو اپنے ساتھ بصرہ لے گئے اور وہاں اسے لکھنا پڑھنا سکھلایا۔ جب حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ خلیفہ ہوئے تو آپ نے زیاد کو سرزمین فارس کا گورنر بنایا۔ آپ کی شہادت کے بعد معاویہ نے زیاد کو ایک تہدید آمیز خط لکھا جس پر زیاد نے مجمع عام میں خطبہ پڑھا اور کہا کہ جگر خوارہ کا لڑکا اور

نفاق کا مرکز اور دشمنانِ اسلام کا سردار مجھے ڈرانا چاہتا ہے؟ حالانکہ میرے اور اس کے درمیان رسول اللہؐ کے چچا زاد بھائی (ابن عباس) اور حسنؑ بن علیؑ نوے ہزار اپنے شیعوں کی فوج لیے ہوئے موجود ہیں۔ خدا کی قسم اگر اس نے ادھر کا رُخ کیا تو وہ دیکھے گا کہ میں تلوار لیے ہوئے سامنے موجود ہوں گا اور بڑی شدید جنگ کروں گا۔ معاویہ کو معلوم ہو گیا کہ اس شخص کو دھمکیوں سے متاثر نہیں کیا جا سکتا۔ جب امام حسنؑ نے صلح فرمائی اور معاویہ کی سلطنت مضبوط ہو گئی تو زیاد اصطخر میں قلعہ بند ہو گیا۔[۱]

معاویہ نے اسے امان نامہ لکھا کہ تم میرے پاس آجاؤ۔ جو کچھ تم کہو گے وہ میں تمھیں دوں گا چنانچہ زیاد، معاویہ کے پاس آیا اور معاویہ کی بارگاہ میں اس کا رسوخ بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ۴۴ھ میں معاویہ نے اسے اپنا بھائی ظاہر کیا۔[۲] ظاہر ہے کہ ایک ایسا شخص جس کے اصلی باپ کا پتہ نہ ہو اور ہو بھی تو وہ ایک غلام کے سوا کوئی نہ ہو وہ ایک دم شہنشاہِ وقت کا بھائی بن جائے اس سے بڑھ کر اس کی عزت کیا ہو سکتی ہے۔ معاویہ نے کہا، یہ میرے باپ ابوسفیان کے نطفہ سے ہے اور اس کی گواہی کس نے دی؟ ابو مریم سلولی نے جو قبل اسلام طائف میں شراب بیچتا تھا۔ اس نے کہا کہ ابوسفیان میرے شرابخانہ میں آیا اور مجھ سے ایک اس قسم کی عورت کو بلا دینے کو کہا جو اس رات اس کی دلچسپی کا باعث ہو۔ میں نے سمیہ کو اس کے پاس بلا دیا اور اس طرح ابوسفیان اور سمیہ میں تعلقات ناجائز پیدا ہوئے اور ان تعلقات سے زیاد کی ولادت ہوئی۔ ایک شخص نے قبیلۂ بنی مصطلق میں سے جس کا نام یزید تھا گواہی دی کہ میں نے ابوسفیان کو یہ کہتے سنا تھا کہ زیاد میرے نطفہ سے ہے۔ حالانکہ پہلے زیاد نے کوفہ میں آکر وہاں کے لوگوں سے یہ خواہش کی تھی کہ تم معاویہ کے ساتھ میری قرابت کے لیے گواہی دے دو۔ ان سب نے انکار کیا کہ ہم جھوٹی گواہی نہ دیں گے۔ یہاں سے مایوس ہو کر وہ بصرہ گیا اور وہاں ایک شخص گواہی دینے کے لیے تیار ہو گیا۔[۳] اس ثبوت کو کافی سمجھا گیا اور زیاد معاویہ کے بھائی

[۱] طبری ج ۶ ص ۹۷ [۲] الوزراء والکتاب ص ۱۷ [۳] طبری ج ۶ ص ۱۲۲

قرار پاگئے۔

اس بات سے مسلمانوں میں اور بالخصوص صحابہ کے طبقہ میں بڑی بے چینی پیدا ہوئی کیونکہ پیغمبرِ اسلامؐ کا یہ ارشاد متواتر طور پر سب کو معلوم تھا کہ الولد للفراش والعاھر الحجر یعنی "بچہ اصلی شوہر کی طرف منسوب ہوگا اور زانی کے لیے بس پتھر ہیں،" مگر اقتدار حکومت کے کان عوام کی چیخ پکار سننے سے بالاتر ہوتے ہیں۔ انھوں نے کوئی پروا نہیں کی۔ ان کے لیے اس سے بڑھ کر ادرکیا ہوسکتا تھا کہ اس ذریعہ سے انھوں نے زیاد اور اسکی اولاد کو ہمیشہ کے لیے خرید لیا۔

چنانچہ جب زیاد کے ذرا سر اٹھانے کا اندیشہ پیدا ہوتا تو یہ احسان یاد دلا کر اس کو سر جھکانے پر مجبور کر دیا جاتا تھا جیسا کہ ایک مرتبہ جب کہ زیاد بہت سے تحائف لے کر معاویہ کے پاس آیا جن میں جواہرات کا ایک نہایت نفیس گلو بند بھی تھا اور معاویہ اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے تو زیاد نے بطور فخر کہنا شروع کیا "حضور دیکھیے میں نے آپ کے لیے کس طرح عراق کو پامال کر دیا ہے اور کس طرح وہاں کے چپے چپے پر آپ کا تسلط قائم کر دیا ہے اور وہاں کی ہر لذت و نعمت آپ کے قدموں پر لاکر ڈال دی ہے۔ یہ سن کر معاویہ ابھی کچھ کہنے نہ پائے تھے کہ یزید بول اٹھا۔ تم نے یہ سب کچھ کیا تو کمال کیا کیا؟ ہم نے جو تم کو قبیلہ ثقیف کی غلامی سے نکال کر قریشی ہونے کی عزت دے دی اور عبید کی فرزندی کے بجائے ابوسفیان کی فرزندی کا شرف عطا کر دیا اور دفتر میں قلم کی گھس گھس سے اونچا کر کے منبروں کی بلندی نصیب کر دی[1]

ظاہر ہے کہ یزید ایسے نوعمر کی زبان سے زیاد ایسے سن رسیدہ کا ان الفاظ کو سن کر برداشت کرلینا احساس کمتری ہی کا نتیجہ تھا جو نسبی اعتبار سے اس میں موجود تھی۔ پھر اس صورت میں زیاد کی نسل اب کبھی معاویہ یا ان کے بعد یزید کے مقابلہ میں سرتابی کرنے کی کہاں ہمت رکھ سکتی تھی۔ یہ دور رس اثر تھا اس سیاسی اقدام کا جو زیاد کو بھائی بنا کر کیا گیا تھا۔ چاہے شریعت اس پر کتنی بھی سرزنش کا مستحق قرار دیتی ہو۔

دوسرا واقعہ: ایک شخص تھے حتات بن زید بن علقمہ تمیمی دارمی۔ حضرت رسول اللہؐ نے ان میں

[1] طبری ج ۶ ص ۱۲۳

اور معاویہ میں مواخات قرار دی تھی، ویسی ہی مواخات جیسی ایک مرتبہ مہاجرین میں اور ایک مرتبہ مہاجرین اور انصار میں کی گئی تھی۔ ہر شخص جانتا تھا کہ اس مواخات سے نسبی احکام جاری نہیں ہوتے اور میراث ایک کی دوسرے کو نہیں ملتی۔ یہی عملدرآمد متفقہ طور پر ثابت تھا کہ ہر ایک کی میراث اس کے نسبی ورثا کو پہنچے۔ اس مذہبی بھائی کو نہیں جو مواخات کے ذریعہ سے بھائی قرار دیا گیا ہے۔ مگر اتفاق کی بات کہ حتات، معاویہ کے پاس آئے ہوئے تھے اور ان کا وہیں انتقال ہوگیا تو معاویہ نے ان کی میراث پر قبضہ کر لیا۔ یہ کہہ کر کہ یہ میرا بھائی ہے۔ اس پر بھی مسلمانوں میں شور ہوا یہاں تک کہ فرزدق نے اس بارے میں شعر بھی کہے ؎

ابوك وعمّی یا معاوی اورثا … تراثا فیحتاز التراث اقاربه
فما بال میراث الحتات اکلته … ومیراث صخر جامد لك ذائبه
فلو کان ھذا الامر فی جاھلیة … علمت من المرء القلیل خلائبه
ولو کان فی دین سوی ذا … لنا حقنا او غصّ بالماء شاربه

(یعنی) "تمھارے باپ نے اور میرے چچا نے اے معاویہ میراث چھوڑی تو اصول یہی رہا کہ میراث قرابتداروں کو دی جائے۔ پھر کیا بات ہے کہ حتات کی میراث تو تم نے نوش جان فرمائی اور ابوسفیان کی میراث تمھاری ہی ملکیت قرار پائی۔ پس یہ معاملہ اگر زمانۂ جاہلیت کی رسم میں داخل ہے تو ہمیں اس کا علم ہونا چاہیے اور اگر یہ اس کے علاوہ کسی اور دین میں ہے جس کی تم نے ایجاد کی ہے تو ہمیں بھی ہمارا حق ملنا چاہیے نہیں تو یہ تمھیں ہضم نہیں ہوسکتا[1]"

مگر تاریخ نہیں بتاتی کہ معاویہ نے اس مال کو کبھی واپس کیا ہو یا حتات کے ورثا کو اس کا معاوضہ دیا گیا ہو۔ اس کے علاوہ اور بہت سی باتیں خلافِ شریعت رواج پا رہی تھیں۔ مثلاً معاویہ نے زکوٰۃ فطرہ کے متعلق کہا، ہماری رائے میں زکوٰۃ فطرہ دو مد سمراء شام ہیں یعنی شام کے گیہوں دو مُد، ابوسعید خدری نے فرمایا یہ معاویہ کی مقرر کردہ مقدار ہے۔ ہم نہ اس پر عمل کرتے

[1] اسد الغابہ ج ۱ ص ۳۷۹

ہیں اور نہ اسے قبول کرتے ہیں۔ ہم عہدِ رسولؐ میں ہر ایک چھوٹے بڑے اور غلام و آزاد کی طرف سے زکوٰۃ فطرہ ایک صاع گندم، ایک صاع پنیر یا جَو یا کھجور یا منقیٰ، اسی طرح نکالتے رہے یہاں تک کہ جب معاویہ حج کے لیے آئے تو انھوں نے کہا ہماری رائے میں دو مد گندم شام زکوٰۃ فطرہ ہے ابوسعید خدری کا قول ہے کہ میں جب تک زندہ ہوں کبھی معاویہ کے اس کہنے کے مطابق عمل نہ کروں گا۔ ابن زبیر نے معاویہ کی اس رائے کو سن کر کہا بئس الاسم الفسوق لعد الایمان - یعنی ”ایمان لانے کے بعد فاسق ہونا بہت بُرا ہے“ مقدار زکوٰۃ فطرہ تو بس صاع ہی ہے [۱]

مقدام بن معدی کرب کی گفتگو جو معاویہ سے ہوئی ہے اس میں انھوں نے کہا تمھیں خدا کی قسم بتاؤ، کیا رسولؐ نے نہیں فرمایا ہے کہ سونا پہننا حرام ہے۔ معاویہ نے کہا صحیح ہے۔ پھر مقدام نے کہا کیا آنحضرتؐ نے درندہ جانوروں کی کھال پر بیٹھنا اور ان کا پہننا ممنوع قرار نہیں دیا تھا؟ معاویہ نے کہا ہاں یہ بھی صحیح ہے۔ مقدام نے کہا، پھر کیا بات ہے کہ میں یہ سب چیزیں تمھارے گھر میں دیکھتا ہوں؟ اس کے علاوہ شریعتِ اسلام کا حکم ہے کہ پیشاب یا پاخانہ کے وقت روبقبلہ یا پشت بقبلہ بیٹھنا جائز نہیں ہے۔ حضرت ابوایوب انصاری جب شام میں پہنچے تو تمام پاخانہ کے مقامات کو روبقبلہ پایا۔ انھوں نے استغفار پڑھ کر منہ پھیر لیا [۲]

عرفہ کے روز حج میں تلبیہ کہنا لبّیك اللّٰھم لبّیك لا شریك لك لبّیك۔ الخ ضروری اور لازمی شعائر حج میں سے ہے۔ رسول کریمؐ اور اصحاب برابر کہتے چلے آئے مگر اس نیک کام کو معاویہ ترک کرتے ہیں اور لوگوں کو اس سے منع کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس نے سعید سے عرفہ کے روز پوچھا کہ کیا وجہ ہے میں لوگوں سے تلبیہ کی آواز نہیں سنتا۔ سعید نے کہا کہ لوگ معاویہ سے ڈرتے ہیں۔ یہ سنکر ابن عباس اپنے خیمہ سے نکلے اور پکارے لبّیك اللّٰھم لبّیك اور کہا۔ اگرچہ یہ معاویہ کے علی الرغم ہو۔ ان لوگوں نے علیؑ کی عداوت سے اس سنت کو ترک کر دیا ہے۔ اس طرح کی تین روایتیں کنز العمال میں درج ہیں، جن میں

[۱] دراسات اللبیب ملا محمد معین ص۲۷۷ [۲] دراسات اللبیب ص۱۳۹

ابن عباس نے بددعا دی ہے اس بات پر کہ عرفہ کے روز تلبیہ کہنے سے اس لیے منع کرتے ہیں کہ علیؑ عرفہ کے روز تلبیہ فرمایا کرتے تھے۔

حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ سے یہ کد اور ضد بہت سے سنن و احکام میں ترمیم کا باعث ہوگئی۔ چنانچہ امام فخرالدین رازی لکھتے ہیں کہ حضرت علیؑ نماز میں بسم اللّٰہ بلند آواز سے کہنے پر زور دیتے تھے۔ اس لیے جب بنی امیہ کو اقتدار حاصل ہوا تو انھوں نے بلند آواز سے بسم اللّٰہ کہنے کی ممانعت پر زور دیا صرف اس کوشش میں کہ حضرت علیؑ کے آثار باقی نہ رہیں [۱]

مدینہ میں معاویہ نے لوگوں کو نماز عشاء باجماعت پڑھائی تو نہ بسم اللّٰہ پڑھی اور نہ بعض تکبیریں کہیں۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو جماعت مہاجرین و انصار نے شور مچایا کہ تم نے نماز میں عمداً چوری کی ہے یا بھول گئے ہو؟ بسم اللّٰہ اور سجدہ میں جاتے ہوئے تکبیریں کہاں گئیں؟ مگر معاویہ نے کوئی اعتنا نہیں کی اور اس نماز کا اعادہ نہیں کیا [۲]

اس کے ساتھ ہی بخاری اور مسلم دونوں کے یہاں یہ روایت موجود ہے کہ عمران بن حصین نے حضرت علیؑ کے ساتھ بصرہ میں نماز پڑھی اور ختم نماز کے بعد کہا کہ انھوں نے ہم کو وہ نماز یاد دلائی جو ہم رسول اللّٰہؐ کے ساتھ پڑھتے تھے۔ پھر ذکر کیا کہ علیؑ جب سجدہ سے اٹھتے تھے اور جب سجدہ میں جاتے تو تکبیر کہتے تھے [۳]

نیز مطرف بن عبداللّٰہ کا بیان ہے کہ میں نے اور عمران بن حصین نے علیؑ بن ابی طالبؑ کے پیچھے نماز پڑھی۔ پس جب علیؑ سجدہ کرتے تھے تو تکبیر کہتے تھے اور جب سجدہ سے سر اٹھاتے تھے تو بھی تکبیر کہتے تھے اور جب دو رکعتوں کے بعد اٹھتے تھے تو تکبیر کہتے تھے۔ پس جب نماز سے فارغ ہوئے تو عمران نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا، بے شک انھوں نے ہم کو حضرت رسولؐ کی نماز یاد دلا دی یا یہ الفاظ کہے کہ انھوں نے ہم کو حضرت محمد مصطفےٰؐ والی نماز پڑھائی [۴] ان ہی باتوں کا نتیجہ تھا کہ اصحابِ رسولؐ روتے تھے اور افسوس کرتے تھے چنانچہ بخاری کی روایت ہے

[۱] تفسیر کبیر ج۱ ص۱۰۷ [۲] کنز العمال [illegible] [۳] [illegible] [۴] [illegible] ص۱۶۹

کرایک روز ابو الدرداء غصہ میں بھرے گھر میں آئے۔ سبب دریافت کیا گیا تو کہنے لگے کہ میں ان لوگوں میں امتِ محمدؐ ہونے کی کوئی نشانی نہیں پاتا سوا اس کے کہ نماز جماعت سے پڑھ لیتے ہیں[1] امام مالک نے روایت کی ہے کہ جو باتیں ہم پہلے پاتے تھے ان میں سے ایک بات بھی اب ہم نہیں دیکھتے۔ بجز اس کے کہ اذان دے لیتے ہیں اور زہری بیان کرتے ہیں کہ میں انسؓ بن مالک کے پاس دمشق گیا تو ان کو روتے پایا۔ سبب پوچھا تو انس نے کہا کہ جو باتیں میں نے عہدِ رسول اللہؐ میں دیکھی تھیں۔ اب ان میں سے سوا اس نماز کے کوئی نظر نہیں آتی اور یہ نماز بھی ضائع کر دی گئی ہے[2]

امیرِ شام کے یہاں گانے والوں کی قدر و منزلت ہوتی تھی چنانچہ سائبؓ خاثر نے جو ایک فاسق و فاجر شخص تھا انھیں گانا سنا کر اپنی تمام حاجتیں جو لے کر آیا تھا پوری کرا لیں[3]

اس آغاز کا انجام اگر یزید کی شراب خواری اور رقص و سرود کے ساتھ فریفتگی کی شکل میں ظاہر ہو تو تاریخ کی طبیعی رفتار کے لحاظ سے قابلِ تعجب نہیں ہے۔

علامہ ابن الفقیہ نے لکھا ہے کہ معاویہ نے سب سے پہلے پولیس چوکی اور پہرہ دار مقرر کیے اور خواجہ سرا بنائے اور اموال خزانہ میں جمع کر کے رکھے[4] انھوں نے سلاطین روزگار کی طرح اپنے عمال کے ذریعہ سے نوروز اور مہرگان (ایرانی تہوار) کے تحائف وصول کیے جن کی مقدار ایک کروڑ درہم سالانہ تک پہنچی[5]

مذکورۂ بالا واقعات میں سے ممکن ہے کہ بعض حیرت میں ڈالنے والے ہوں مگر اس کو کیا کیا جائے کہ تاریخ میں اس سے زیادہ حیرت انگیز باتیں بھی درج ہیں جن کو دیکھ کر ہر انسان یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ ابوسفیان کی اولاد کو بنی ہاشم سے ایک موروثی عداوت جو تھی اس کی بنا پر وہ ان کی ہر سنت، ہر رسم اور ہر طریقہ کو فنا کر دینا چاہتے تھے بلکہ سرے سے اسلام ہی کو نیست و نابود کر دینے کے درپے تھے۔ صرف مجبوری یہ تھی کہ ان کی حکومت اسلام کی بناء پر تھی اس لیے انھیں پیغمبرِ اسلامؐ کی نبوت کا انکار ممکن نہ تھا لیکن وہ پھر بھی حضرت کی عظمت کے احساس

... ۲ بخاری ج ا ص ۶۵ ۳ طبری ج ۶ ص ۱۸۸ ۴ البلدان ص ۱۰۹

اور اس کے اثرات کے قائم رکھنے کا کوئی جوش و ولولہ نہ رکھتے تھے۔ اس کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ معاویہ کو شوق پیدا ہوا ایک بڑے معمّر آدمی سے ملاقات کا جو گزشتہ زمانہ کے حالات بیان کرے۔ لوگوں نے کہا کہ حضرموت میں ایک شخص ہے جس کی تین سو ساٹھ برس کی عمر ہے۔ معاویہ نے اس کے پاس آدمی بھیجے اور اسے بلوایا۔ جب وہ آیا تو پوچھا کہ تمھارا نام کیا ہے؟ اس نے کہا آبد بن آبد۔ معاویہ نے اس سے عبدالمطلب اور امیہ وغیرہ کے حالات پوچھے۔ پھر کہا تم نے محمدؐ کو بھی دیکھا ہے؟ اُسے ایک مسلمان کی زبان سے حضرت کا نام نامی اس طرح سنکر حیرت ہوئی اور اس نے کہا دمن محمد یعنی محمدؐ کون؟ انھوں نے کہا "وہی رسول اللہؐ" اس نے کہا پھر تم نے پہلے ہی ان کا نام اس شان کے ساتھ کیوں نہ لیا؟ جس کا خدا نے انھیں مستحق قرار دیا ہے۔ یہ کیوں نہیں کہا کہ تم نے رسول اللہؐ کو دیکھا ہے[1]؟

اس سے زیادہ اور انتہائی حیرت خیز یہ ہے کہ معاویہ کو رسول اللہؐ کہہ کر سلام کیا گیا اور ان کو سزا تو درکنار معمولی سی تنبیہ بھی نہیں کی گئی۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ عَمرو بن عاص ایک دفعہ اہلِ مصر کی ایک جماعت کے ساتھ معاویہ کے پاس دارالخلافہ شام میں باریابی کے لیے آئے یہ وہ زمانہ تھا کہ عمرو بن عاص، معاویہ سے کچھ برسرِ پرخاش تھے۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں کو سمجھا دیا کہ دیکھو جب تم معاویہ کے دربار میں جانا تو اسے خلیفہ کہہ کر سلام نہ کرنا اور جہاں تک ممکن ہو اس سے حقارت کے ساتھ بات کرنا۔ اس کی وجہ سے تمھاری ہیبت اس کے دل پر قائم ہو جائے گی۔ معاویہ کو جب ان لوگوں کے پہنچنے کی اطلاع ہوئی تو وہ اپنی ذہانت سے عمرو عاص کی سازش کو تاڑ گئے اور درباریوں سے کہا میرا خیال ہے کہ نابغہ کے لڑکے (عمرو عاص) نے ان لوگوں کی نظر میں میری منزلت کو گھٹا دیا ہوگا۔ لہٰذا تم خیال رکھو جب یہ لوگ آئیں تو ان کے ساتھ انتہائی سختی کرنا۔ یہاں تک کہ ہر شخص کو ان میں سے یقین ہو جائے کہ اس کی جان کی خیر نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب سے پہلے جو شخص معاویہ کے سامنے دربار میں حاضر ہوا وہ یوں آداب

[1] کتاب المعمرین ص ۴۸ و اسد الغابہ ج ا ص ۱۱۵

بجا لایا کہ السلامُ علیک یا رسول اللہ۔ بس پھر کیا تھا، سب نے اس کی موافقت کی اور جو آیا اس نے معاویہ کو رسول اللہ کہہ کر سلام کیا[1]

مثل مشہور ہے الناس علیٰ دین ملوکھم "لوگ بادشاہوں کے طریقہ پر چلتے ہیں" جب حکومت کی یہ روش ہو تو عام افراد کی نظر میں رسولؐ اور شریعتِ رسولؐ کی کیا عزت باقی رہ سکتی ہے جب لوگ دیکھ رہے ہوں کہ حکومت کی طرف سے مذہب کا نیلام کرایا جاتا ہے اور تھوڑے سے سکوں کے عوض دین و مذہب کی خریداری ہوتی ہے تو لوگوں کی نگاہ میں مذہب کی کیا وقعت باقی رہ سکتی ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ حتات مجاشعی، جاریہ بن قدامہ، احنف بن قیس اور جون بن قتادہ چاروں آدمی معاویہ کے پاس آئے۔ معاویہ نے ہر ایک کو ایک ایک لاکھ درہم دیے مگر حتات کو ستر ہزار درہم دیے۔ حتات کو جب اس کا علم ہوا تو معاویہ سے آ کر اس کی شکایت کی۔ معاویہ نے کہا کہ ان لوگوں سے میں نے ان کا دین خرید کیا ہے۔ حتات نے پھر کہا، پھر مجھ سے بھی میرا دین خرید لیجیے[2]

اب جو ذرا بھی خدا ترس مسلمان تھے وہ زندگی سے عاجز ہو گئے تھے۔ چنانچہ حکم بن عمرو غفاری نے جو یمن و خراسان کے حاکم بنائے گئے تھے جب ۵۰ھ میں ایک جنگ کے بعد اموالِ غنیمت حاصل کیے اور یہ حکم نامہ پہنچا کہ لوٹ کے مال کو سپاہیوں میں تقسیم کرنے کے بجائے تمام نقد و جنس خزانہ سرکاری میں بھیج دیا جائے تو انھوں نے ہمت کر کے یہ جواب لکھ دیا کہ یہ حکم قرآن کے بالکل خلاف ہے اس لیے میں عمل کرنے سے قاصر ہوں۔ مگر اس کے بعد اتنا خوف ہوا کہ خدا سے دعا کی۔ بارِ الٰہا اب مجھے زندگی درکار نہیں ہے۔ میری روح قبض فرما لے۔ اس کے بعد ان کا انتقال ہو گیا[3]

آثارِ بنی ہاشم کے مٹانے کی سعی تعمیری یادگاروں تک بھی پہنچی۔ چنانچہ جب معاویہ نے حج کیا تو واپسی میں مدینہ بھی گئے اور منبرِ رسولؐ کو اس کی جگہ سے حرکت دی۔ چاہتے تھے کہ اسے شام لے جائیں

۱۔ ... ۱۳۵ - ابن الفدا ص ۱۵۴ ۲۔ طبری ج ۶ ص ۱۳۵ - استیعاب ج ا ص ۱۵۴ - اسد الغابہ ج ا ص ۳۷۹

اسی وقت سورج کو گرہن ہوا۔ جابر بن عبداللہ انصاری نے کہا، معاویہ نے رسول اللہؐ کے شہر اور ان کے دارالہجرت میں بڑا حادثہ رونما کیا۔ ضرور یہ کسی مصیبت میں مبتلا ہوں گے۔ اسی سال معاویہ لقوہ میں مبتلا ہوئے[1]

یہ ۵۰ھ کا واقعہ ہے۔ منبر کو جنبش دیتے ہی سورج میں گرہن لگا ایسا کہ تارے نظر آنے لگے۔ اہلِ مدینہ میں اس سے اتنا ہیجان پیدا ہوا کہ معاویہ کو اپنا ارادہ ترک کرنا پڑا اور کہا کہ میں نے تو منبر ہٹا کر صرف یہ دیکھنا چاہا تھا کہ اسے دیمک تو نہیں لگی ہے[2]

حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ کے ساتھ جو دشمنی تھی وہ بھی آپ کی ذات سے خصومت کی بنا پر نہ تھی بلکہ صرف اس لیے کہ آپ بنی ہاشم کے چشم و چراغ اور اصولِ اسلام کے علمبردار تھے۔ اس لیے سیاست کا تقاضا یہ تھا کہ ملک میں آپ کے خلاف نفرت پیدا کرائی جائے۔ قتلِ عثمان کا الزام بھی فقط اس سیاست کے پورا کرنے کا ایک بہانہ تھا چنانچہ علاّمہ ابن حجر مکّی نے لکھا ہے۔ مروان بن الحکم کی زبانی منقول ہے۔ اس نے کہا کہ کوئی شخص علیؑ سے زیادہ عثمان کی حمایت کرنے والا نہ تھا۔ کسی نے کہا کہ پھر تم لوگ منبروں پر انھیں گالیاں کیوں دیتے ہو؟ اس نے کہا بغیر اسکے ہمارا اقتدار قائم نہیں ہو سکتا۔[3]

پھر جب کہ صلحنامہ کی بنیاد یعنی کتاب اور سنت کی موافقت والی شرط کا یہ انجام ہوا تو دوسری شرطوں کا نتیجہ ظاہر ہے۔ چنانچہ دوسری شرط یہ کہ معاویہ کو اپنے بعد کسی کے نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا، اس کے انجام کا آئندہ ایک مستقل باب میں بیان ہوگا۔

تیسری شرط یہ تھی کہ شام و عراق و حجاز و یمن سب جگہ کے لوگوں کے لیے امان ہوگی۔ اس کا انجام بہت دردناک ہے۔ عراق میں زیاد بن سمیہ کے ہاتھوں جو خونریزیاں ہوئیں وہ صفحۂ تاریخ پر نمایاں حروف میں درج ہیں۔ اس شخص کے خصوصیات میں لکھا ہے کہ وہ جرم کے پہلے سزا دیتا بدگمانی کی بنا پر بلاتحقیق و تفتیش قید کر دیتا اور شبہ پر ایذا رسانی کرتا تھا۔ انسان کی جان کا لینا اس کے نزدیک کوئی بات ہی نہ تھا۔ اس کا ایک عجیب نمونہ اس واقعہ میں ہے کہ اس نے یہ عام حکم

۱؎ کتاب البلدان ص ۲۴ ۲؎ طبری ج ۶ ص ۱۳۳ ۳؎ صواعق محرقہ ص ۳۳

دے دیا تھا کہ جو نصف شب کے قریب گلی کوچہ میں نظر آئے اس کو قتل کر دیا جائے۔ ایک رات ایک دیہاتی عرب کو گرفتار کیا گیا اور اسے زیاد کے پاس لائے۔ اس نے اپنی صفائی پیش کی کہ میں یہاں کا رہنے والا نہیں ہوں۔ دیہات سے آج ہی آیا ہوں اور مجھے آپ کے اس حکم کی اطلاع نہیں تھی۔ زیاد نے کہا کہ واللہ میرے خیال میں تو سچ کہہ رہا ہے اور بے خطا ہے مگر تیرے قتل کر دینے میں عامۂ خلائق کے لیے بہتری ہے چنانچہ فوراً اسے قتل کر دیا گیا۔[۱]

زیاد کی ولایت کوفہ کے بعد بصرہ میں اس کے جانشین سمرہ بن جندب کے مظالم اس سے بھی زیادہ تھے۔ ایک بار چھ مہینہ کی مدت میں آٹھ ہزار آدمی اس نے تہ تیغ کیے۔ ابو سوار عدوی کا بیان ہے کہ سمرہ نے میری قوم میں سے ایک دن میں ۴۷ آدمی قتل کیے جو سب کے سب حافظ قرآن تھے۔

ایک دن سمرہ اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ شہر سے باہر نکلا۔ بنی اسد کے مکانوں کے قریب ایک شخص اس قبیلہ کا کسی ضرورت سے ایک گلی میں سے نکلا لشکر کے آگے آگے کے سواروں میں سے ایک نے اسے دیکھتے ہی اپنے حربہ سے حملہ کر دیا اور وہ گر کر خاک و خون میں تڑپنے لگا۔ سمرہ بن جندب اس کی لاش پر سے گزرا اور واقعہ معلوم ہونے پر کہا کہ جب ہماری سواری گزرا کرے تو ہمارے نیزوں سے بچتے رہا کرو۔[۲]

مسلم عجلی کا بیان ہے کہ ایک شخص سمرہ کے پاس آیا اور اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کی۔ پھر مسجد میں آ کر نماز پڑھنا شروع کی۔ اتنی دیر میں ایک شخص آیا اور اس کی گردن اڑا دی۔ اس طرح کہ مسجد میں ایک طرف اس کا سر کٹ کر جا گرا اور دوسری طرف بدن۔

ایک دوسرے موقع پر مشاہدہ بیان کیا ہے کہ بہت سے آدمی اس طرح قتل کیے گئے کہ ان سے شہادتین کا اقرار لیا جاتا تھا۔ وہ توحید اور رسالت کا اقرار کرتے تھے اور خوارج سے برأت کا اعلان کرتے تھے اور پھر اس کے بعد ان کا سر قلم کر دیا جاتا تھا۔ اور یہ سب کچھ امیرِ شام معاویہ کی مرضی کے مطابق ہوتا تھا۔ چنانچہ جب عرصہ کے بعد معاویہ نے سمرہ کو معزول کیا تو اس نے

[۱] طبری ج ۶ ص ۱۲۶ [۲] طبری ج ۶ ص ۱۳۲۔

کہا، خدا غارت کرے معاویہ کو۔ اگر میں نے اللہ کی اتنی اطاعت کی ہوتی جتنی معاویہ کی اطاعت انجام دی تو وہ کبھی مجھ کو عذاب نہ کرتا۔[۱]

چوتھی شرط یہ تھی کہ حضرت علیؑ کے اصحاب اور شیعوں کے جان و مال و ناموس و اولاد محفوظ رہیں گے۔ اس شرط پر قطعی عمل نہیں ہوا۔

عراق میں شیعیانِ علیؑ پر جتنے مظالم ہوئے ان میں سب سے ہلکی بات یہ تھی کہ ان کو کوفہ سے جلاوطنی پر مجبور کیا جاتا تھا اور ان کی جگہ معاویہ کے طرفداروں کو لا کر بسایا جاتا تھا۔[۲]

کوفہ اور بصرہ دونوں جگہ کے شیعوں کو ملک بدر کر دیا گیا۔ ان میں سے اکثر کو شام کے مقام قنسرین میں جو بالکل غیر آباد تھا لے جا کر فوجی زندگی گزارنے پر مجبور کیا گیا۔[۳]

حجر بن عدی اور ان کے ساتھی شام میں بلوا کر قتل کر دیے گئے، حالانکہ وہ اعلان کر رہے تھے کہ ہم مسلمان ہیں۔ اپنے معاہدہ پر قائم ہیں اور باغی نہیں ہیں[۴] مگر ان کا سب سے بڑا جرم یہی تھا کہ وہ محب اہلبیتؑ تھے اس لیے ان کے واسطے نہ حلم میں گنجائش تھی نہ رحم و کرم ان پر نگاہ ڈالنے کی اجازت دیتا تھا۔ صیفی بن فسیل شیبانی جو انہی میں سے ایک ممتاز فرد تھے۔ زیاد کے پاس لائے گئے تو زیاد نے پوچھا کہ تم علیؑ بن ابیطالبؑ کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہو؟ کہا بہترین رائے جو اللہ کے بندگان مومنین میں سے کسی کے بارے میں رکھی جا سکتی ہے۔ زیاد نے حکم دیا کہ اسے لکڑی سے پیٹو، اتنا کہ زمین سے لگ جائے۔ چنانچہ انھیں اتنی ہی شدت سے زدوکوب کیا گیا۔ زیاد نے کہا بس کرو۔ پھر پوچھا، ہاں اب بتاؤ علیؑ کے باب میں کیا کہتے ہو؟ کہا بخدا اگر استروں اور چھریوں سے میری بوٹیاں کاٹ ڈالو تب بھی وہی کہوں گا جو پہلے سن چکے ہو۔ کہا تجھ کو ان پر لعنت کرنا ہوگی ورنہ تیری گردن اڑا دی جائے گی۔ صیفی نے کہا تو پھر پہلے گردن اڑا ہی کیوں نہ دو! مجھے اس میں کوئی عذر نہیں بلکہ میں اس سے راضی اور مطمئن ہوں۔[۵]

[۱] طبری ج ۶ ص ۱۴۲ [۲] طبری ج ۳ ص ۲۴ [۳] طبری ج ۴ ص ۲۶
[۴] طبری ج ۶ ص ۱۴۸ و ص ۱۵۳ [۵] طبری ج ۶ ص ۱۴۹

زیاد نے بارہ آدمیوں کو پابزنجیر شام کی طرف روانہ کیا۔[1]

حجرؓ بن عدی کندی، ارقمؓ بن عبداللہ کندی، شریکؓ بن شداد حضرمی، صیفیؓ بن فسیل، قبیصہؓ بن ضبیعہ عبسی، کریمؓ بن عفیف خثعمی، عاصمؓ بن عوف بجلی، ورقاءؓ بن سمی بجلی، کدامؓ بن حیان عنزی، عبدالرحمنؓ بن حسان عنزی، محرزؓ بن شہاب تیمی، عبداللہؓ بن حویہ سعدی۔

عتبہ بن اخنس سعدی اور سعد بن نمران ہمدانی، ان دو آدمیوں کو زیاد نے بعد میں بھیجا جس کے بعد ان کی تعداد چودہ ہوگئی۔[2]

ان میں سے سات آدمی مختلف لوگوں کی سفارش پر چھوڑ دیے گئے اور چھ آدمیوں کو مقام مرج عذرا میں تہ تیغ کیا گیا۔[3]

ایک شخص عبدالرحمن بن حسان عنزی کے لیے معاویہ کو خود اپنی بے رحمی ناکافی محسوس ہوئی اور ان کو پھر زیاد کے پاس بھیج دیا۔ اس انتباہ کے ساتھ کہ یہ ان تمام لوگوں میں سب سے زیادہ شیعیت میں سخت ہے۔ تم اس کو بار سے بدتر طریقہ جو اختیار کر سکو اس طرح قتل کرو چنانچہ زیاد کے حکم سے انھیں زندہ زمین میں دفن کر دیا گیا۔[4]

حجر بن عدی ان میں سے تھے جو مرج عذرا میں قتل کیے گئے۔ ان کو عالم اسلام میں کتنی ہر دلعزیزی تھی۔ اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ جب زیاد کی مخبری کی اطلاع ام المومنین عائشہ کو پہنچی تو انھوں نے عبدالرحمن بن حارث بن ہشام کو حسب ذیل پیغام کے ساتھ معاویہ کے پاس روانہ کیا اللہ اللہ فی حجر و اصحابہ یعنی حجر اور ان کے اصحاب کے بارے میں خدا کا خوف کرنا، مگر افسوس ہے کہ عبدالرحمن اس وقت پہنچے جب حجر اپنے ساتھیوں سمیت قتل ہو چکے تھے۔ عبدالرحمن نے معاویہ سے کہا، آپ کے پاس سے کہاں چلا گیا تھا۔ ابوسفیان سے میراث میں ملا ہوا حلم؟ آپ نے اس حلم سے کام کیوں نہ لیا؟ آپ نے ان کو جیل خانہ ہی میں ڈال دیا ہوتا اور وبا و طاعون سے ہلاک ہو جانے دیا ہوتا۔ معاویہ نے طنزیہ طور پر جواب دیا کہ تمھارے ایسا کوئی مشورہ دینے

۱؎ طبری ج ۶ ص ۱۴۴ ۲؎ طبری ج ۶ ص ۱۵۲ ۳؎ طبری ج ۶ ص ۱۵۴ ۴؎ طبری ج ۶ ص ۱۵۵

والا موجود نہ تھا۔ عبدالرحمن نے کہا۔ اب بخدا عرب میں نہ تو آپ کے حلم کا کوئی ذکر ہوگا اور نہ آپ کی اصابت رائے قابل تسلیم رہی۔ آپ نے ایسے آدمیوں کو قتل کیا جن کو قید کر کے آپ کے پاس بھیجا گیا تھا اور وہ مسلمان تھے۔

عائشہ کو اس حادثہ کی اطلاع پہنچی تو انھوں نے کہا۔ اگر معاویہ کو احساس ہوتا کہ اہل کوفہ میں کچھ بھی جرأت و ہمت ہے تو وہ کبھی حجر اور ان کے اصحاب کو گرفتار کرا کے شام بلوانے اور قتل کرنے کی جرأت نہ کرتا، لیکن جگر خوارہ کے لڑکے کو معلوم ہے کہ آدمی فنا ہو چکے ہیں۔ خدا کی قسم یہ لوگ اپنی علمی طاقت اور فقہی قابلیت کے لحاظ سے عرب کے سر اور دماغ سمجھے جاسکتے تھے۔ لبید شاعر نے کیا خوب نظم کیا ہے اپنے دو شعروں میں جن کا مضمون یہ ہے کہ گزر گئے وہ لوگ جن کی پناہ میں زندگی بسر کی جاسکتی تھی اور رہ گیا ہوں میں ایسے پس ماندہ افراد میں جو خارشی اونٹ کی کھال کے مثل ہیں۔ نہ تو ان سے کوئی فائدہ ہے اور نہ ان سے کسی اچھائی کی توقع ہے جب وہ بات کرتے ہیں تو عیوب سے مملو ہوتی ہے چاہے وہ شور و غل برپا نہ کریں۔

جب معاویہ مدینۂ رسولؐ میں آئے اور ام المومنین عائشہ کے پاس سلام کے لیے حاضر ہوئے تو سب سے پہلی بات جو عائشہ نے پیش کی وہ حجر کا معاملہ تھا اور اس گفتگو میں یہاں تک طول ہوا کہ معاویہ نے کہا، اچھا پھر چھوڑ دیجیے، مجھے اور حجر کو، خدا کے یہاں دیکھا جائے گا۔

عبداللہ بن عمر کا واقعہ ہے کہ وہ بازار میں تھے۔ ان کو حجر کے قتل کی خبر ملی تو وہ بے چین ہو گئے، نشست کو قائم نہ رکھ سکے اور کھڑے ہو کر چیخیں مار مار کر رونے لگے۔

حسن بصری کو جب حجر اور ان کے ساتھیوں کے قتل کا حال معلوم ہوا تو پوچھا کہ کیا ان پر نماز جنازہ پڑھی گئی؟ کفن دیا گیا؟ اور دفن کیا گیا اور قبلہ رخ لاش رکھی گئی؟ معلوم ہوا کہ یہ سب کیا گیا۔ حسنؒ نے کہا تو پھر بخدا حجت ان کی تمام ہو گئی۔[1]

مطلب یہ تھا کہ لاشوں کے ساتھ اسلامی احکام پر عمل ان کے مسلمان سمجھے جانے کا ثبوت ہے تو پھر ان کا خون مباح کیونکر ہو سکتا ہے؟

۱؎ طبری ج ۶ ص ۱۵۵

ربیع بن زیاد حارثی نے جو خراسان کے حاکم تھے حجر بن عدی کے قتل ہونے اور مسلمانوں کی بے حسی کا تذکرہ کیا اور پھر جمعہ کے دن مسجد میں آکر حاضرین سے کہا، ایہا الناس میں زندگی سے عاجز ہو چکا ہوں۔ اب میں ایک دعا مانگتا ہوں، تم سب آمین کہنا۔ اس کے بعد ہاتھ اٹھائے اور کہا۔ خداوندا اگر ربیع کے لیے تیرے نزدیک کچھ بہتری ہے تو جلد اس کی روح قبض فرمالے۔
اس کے بعد مسجد سے باہر نکلے، کچھ دور نہ گئے تھے کہ زمین پر گرے اور انتقال کیا۔[۱]

خود معاویہ کو بعد میں حجر کے بے گناہ قتل کرنے کے جرم کا احساس پیدا ہو گیا تھا چنانچہ جب وہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے اور تکلیف زیادہ ہوئی تو ایک روز عبداللہ بن یزید اسدی ان کے پاس آیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ بہت مضطرب ہیں۔ اس نے (خوشامدانہ لب و لہجہ میں) کہا، آپ کو اضطراب کی کیا ضرورت ہے؟ اگر مر گئے تو جنت میں پہنچے اور اگر زندہ رہے تو مسلمانوں کے جہاں پناہ رہے۔ معاویہ نے کہا "خدا رحمت نازل کرے تمھارے والد پر وہ مجھے حجر بن عدی کے قتل سے منع کرتے تھے"۔ محمد بن سیرین کی روایت ہے کہ جب معاویہ کا وقتِ وفات قریب آیا اور انھیں غرغرا لگا تو انھوں نے کہا یومی منك یا حجر یوم طویل (یعنی) "اے حجر تمھارے قتل سے مجھے طویل روز کا سامنا ہوگا"۔[۲] حزن و مشقت کا زمانہ طولانی ہوتا ہے لہٰذا اس سے مقصود یہ ہے کہ مجھے اس قتل کے سبب سے روزِ قیامت بڑی تکلیف و زحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

عمرو بن الحمق الخزاعی ایک بزرگ تھے جن کو حضرت پیغمبرؐ نے سلام کہلوایا تھا اور اس لیے بہت بلند مرتبہ انسان سمجھے جاتے تھے۔ ان کی گرفتاری کا حکم ہوا اور معاویہ کی خصوصی ہدایت کے مطابق ان پر نو وار نیزے کے کیے گئے۔ حالانکہ پہلے یا دوسرے ہی زخم پر وہ جان بحق تسلیم ہو چکے تھے۔[۳]
تاریخ کی تصریح کے مطابق سب سے پہلا سر جو اسلام میں نیزہ کی نوک پر بلند کیا گیا

لہ کہ سرقہ -

ان واقعات سے شیعانِ علیؑ میں تلاطم برپا ہو گیا اور حضرت امام حسینؑ پر بھی سخت اثر ہوا چنانچہ دینوری نے لکھا ہے کہ جب حجر بن عدی اور ان کے اصحاب قتل ہو گئے تو اہلِ کوفہ نے اس کو بڑی ناگوار مصیبت سمجھا اور کچھ لوگ اشرافِ اہلِ کوفہ میں سے حضرت امام حسینؑ کے پاس گئے اور آپ کو اطلاع دی۔ آپ نے کہا اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون اور یہ امر آپ کو بہت شاق ہوا۔[۱] تاہم آپ نے اس واقعہ پر ایک دم کوئی انتہائی قدم اٹھانا مناسب نہیں سمجھا بلکہ آئندہ حالات کا بے چینی کے ساتھ انتظار کرتے رہے۔ بے شک جب معاویہ کو یہ معلوم ہوا کہ لوگ امام حسینؑ کے پاس شکایت لے گئے ہیں اور آپ نے بھی ان کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کیا ہے تو انھیں یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں آپ مخالفت کے لیے کھڑے نہ ہو جائیں۔ اس بناء پر انہوں نے آپ کے نام ایک تہدیدی خط لکھا۔ اس کے جواب میں اب حضرت امام حسینؑ خاموش نہ رہ سکتے تھے۔ آپ نے ایک ایک کر کے امیرِ شام کی جو خلاف ورزیاں معاہدہ کے متعلق تھیں وہ گنوائیں اور خصوصیت کے ساتھ حجر بن عدی وغیرہ کے قتل کو آپ نے موثر الفاظ میں پیش کیا۔ اس پر سخت احتجاج فرمایا جس کا ذکر اس باب کے آخر میں آئے گا۔

پانچویں شرط یہ تھی کہ امام حسنؑ اور امام حسینؑ یا کسی کو بھی خاندانِ رسولؐ میں سے کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کی جائے گی۔ نہ خفیہ نہ علانیہ۔ اس شرط کی بھی صریح خلاف ورزی کی گئی حالانکہ اس صلح کے بعد یہ حضرات ملکی اور سیاسی امور سے بالکل بے تعلق رہے مگر اس کے بعد بھی امام حسنؑ بنی امیہ کی ایذا رسانیوں سے محفوظ نہیں رہے۔ اس کی مختلف صورتیں تھیں۔ پہلے غلط پروپیگنڈے اور بے بنیاد الزامات جن سے ان کی رفعتِ مرتبہ پر عام نگاہوں میں حرف آئے۔ وہ لوگ سمجھتے تھے کہ خاندانِ پیغمبرؐ کے ان مقدس افراد کی زندگی اتنی بے داغ ہے کہ ان کے خلاف ایسا الزام جو کھلا ہوا اصولِ شریعت کے خلاف ہو عائد کرنا کسی طرح مفید نہ ہوگا۔ وہ ہرگز مسلمانوں کی جماعت میں باور نہیں کیا جا سکتا اس لیے اس طرح کے الزامات لگائے

سہ اخبار الطوال ارشاد ص ۲۰۶

جو شرع کے حدود کے اندر تو ہوں مگر عام نگاہوں میں کچھ اچھی حیثیت سے دیکھے نہ جاتے ہوں مثلاً کثرت ازدواج اور کثرتِ طلاق - یہ چیز بجائے خود شرعِ اسلامی میں جائز ہے لیکن بنی امیہ کے پروپیگنڈے نے اس کو حضرت امام حسنؑ کی نسبت ایسے ہولناک طریقہ پر پیش کیا جس سے لوگ حضرت امام حسنؑ کی نسبت کچھ اچھی رائے قائم نہ کریں - اسی طرح دونوں بھائیوں کے اختلاف طبیعت اور اختلاف رائے کا پروپیگنڈا اور ایسی بہت سی چیزیں جو صرف اموی سیاست کی پیداوار تھیں۔

دوسرے عمال بنی امیہ اور ان کے ہوا خواہوں کا حضرت امام حسنؑ سے برا برتاؤ سخت کلامی اور دشنام طرازی جس سے کسی وقت مشتعل ہو کر حضرت امام حسنؑ یا بنی ہاشم میں سے دوسرے لوگ لڑنے مرنے پر تیار ہو جائیں اور اس سے ایک طرف ان پر معاہدہ کی خلاف ورزی کا بے بنیاد الزام عائد کیا جا سکے دوسرے ان کی خونریزی کا ایک بہانہ ہاتھ آئے - اس کا اندازہ امام حسینؑ کے ان الفاظ سے ہوتا ہے جو آپ نے مروان بن الحکم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمائے ہیں - اس وقت کہ جب امام حسنؑ کی وفات کے بعد آپ کے جنازہ پر مروان رو رہا تھا - امام حسینؑ نے کہا "آج تم روتے ہو حالانکہ اس کے پہلے تم ہی ان کو غم و غصہ کے گھونٹ پلایا کرتے تھے" مروان نے کہا "ٹھیک ہے مگر وہ سب میں ایسے انسان کے ساتھ کرتا تھا جو اس پہاڑ سے زیادہ قوتِ برداشت رکھنے والا تھا"

مگر اس انتہائی ضبط اور تحمل کے بعد بھی امام حسنؑ کی زندگی محفوظ نہ رہ سکی - سلطنتِ وقت کو جب کوئی بہانہ ان کے خلاف کھلے ہوئے جور و ستم کا نہ ملا تو پھر وہ خاموش حربہ استعمال کیا گیا جو سلطنتِ بنی امیہ میں اکثر بڑی مہموں کے سر کرنے میں صرف کیا جاتا رہا تھا - امیر شام معاویہ نے اشعث بن قیس کی بیٹی جعدہ کے ساتھ جو حضرت امام حسنؑ کی زوجیت میں تھی سازباز کر کے اس کو ایک لاکھ درہم بھجوائے اور یزید کے ساتھ شادی ہو جانے کا وعدہ کیا اور اس کے ذریعہ سے حضرت کو زہر دلوا دیا جس سے آپ کے کلیجے کے ٹکڑے ہو گئے[1] - جب آپ کی حالت دگرگوں ہوئی تو آپ نے اپنے مختلف البطن بھائی محمد بن الحنفیہ کو بلا کر فرمایا کہ دیکھو کہیں ایسا نہ ہو کہ

میرے بعد حسینؑ سے تم اختلاف کرو - حسینؑ میرے بعد امام ہیں اور ان کی اطاعت لازم ہے - محمد نے نہایت خلوص کے ساتھ اقرار وفاداری کیا اور امام حسینؑ کی اطاعت کا وعدہ کیا[1] - پھر حضرت نے امام حسینؑ کو پاس بلایا اور وصیت کی کہ مجھے غسل و کفن کے بعد میرے جدِّ بزرگوار رسولِ خداؐ کے روضہ پر لے جانا تاکہ ایک مرتبہ زیارتِ رسولؐ کا شرف اور حاصل ہو جائے[2] اور مجھے یقین ہے کہ لوگ یہ خیال کرتے ہوئے کہ مجھے وہاں دفن کیا جائے گا مزاحمت کریں گے، تو خبردار اس بارے میں ایک قطرۂ خون بھی گرنے نہ پائے - تم مجھ کو میری دادی فاطمہ بنت اسد کی قبر کے پاس جنۃ البقیع میں دفن کر دینا[3]

۲۸ صفر ۵۰ھ کو وہ امن و صلح و سلامتی کا شہنشاہ دنیا سے رخصت ہو گیا - امام حسینؑ وصیت کے مطابق اپنے بھائی کو غسل کے بعد تابوت میں لٹا کر روضۂ رسولؐ کی طرف لے چلے - بنی امیہ کو یقین ہوا کہ آپ کو وہاں دفن کریں گے - سب کے سب مروان کے ساتھ ہتھیار باندھ کر نکل آئے اور بیچ میں سدِّ راہ ہوئے - اس وقت بنی ہاشم کو بہت زیادہ اشتعال تھا مگر حسینؑ اپنے بھائی امام حسنؑ کی وصیت اور فرض کے احساس سے مجبور تھے - آپ فرما رہے تھے کہ خدا کی قسم اگر بھائی کی وصیت اور ان کے اصول کا پاس نہ ہوتا تو تم دیکھتے کہ کیسی اس وقت تلوار چلتی ہے[4] - بہرحال حضرت امام حسنؑ کے جنازہ کو روضۂ رسولؐ سے واپس لے گئے، اور جنۃ البقیع میں دفن کر دیا[5] - پھر یہ خبریں بھی معلوم ہوئیں کہ امیر شام نے امام حسنؑ کی وفات پر اظہارِ مسرت کیا اور طعن و تشنیع کے کلمات کہے - اتفاق سے اس وقت ابنِ عباس دمشق میں تھے - انھوں نے یہ الفاظ سنے تو کہا کہ خوش نہ ہو تم بھی حسنؑ کے بعد عرصہ تک زندہ نہ رہو گے[6]

حضرت امام حسنؑ کی وفات بنی ہاشم کے لیے ایک سخت حادثہ تھی - چنانچہ اس سانحۂ عظیم پر بنی ہاشم ایک مہینہ کامل سوگوار رہے[7] - مگر اس کے بعد بھی امام حسینؑ اسی راستے پر قائم رہے جو امام حسنؑ نے قائم کر دیا تھا اور اس طرح یہ خیال بالکل غلط ثابت ہو گیا کہ آپ کو اپنے بھائی سے

---

[1] کافی ج ۱ ص ۱۸۶ [2] کافی ج ۱ ص ۱۸۵ و ۱۸۷ [3] ارشاد ص ۱۹۸ [4] ارشاد ص ۱۹۹
[5] کافی ج ۱ ص ۱۸۸ [illegible]

اصولی اختلاف تھا۔ اور صرف ان کے دباؤ کی وجہ سے آپ اس پر قائم تھے۔ ایسا نہیں بلکہ آپ اسی راستے کو صحیح سمجھتے تھے اور اسی لیے خود صاحب اختیار ہونے کے بعد بھی اسی کو برقرار رکھا۔ حالانکہ اس وقت شیعوں میں ہیجان بھی پیدا ہوا جس کا تذکرہ تاریخ ان الفاظ میں کرتی ہے کہ جب حضرت امام حسنؑ کی وفات ہوئی تو عراق کے شیعوں میں حرکت پیدا ہوئی اور انھوں نے امام حسینؑ کو لکھا کہ ہم لوگ معاویہ کی بیعت توڑ کر آپ سے بیعت کرنے پر تیار ہیں مگر آپ نے فرمایا کہ نہیں! ہم میں اور معاویہ میں معاہدہ ہو چکا ہے۔ اس کا توڑنا میرے لیے صحیح نہیں ہے۔ بیشک جب معاویہ کا انتقال ہوگا تو دیکھا جائے گا[1]

آپ صبر و سکون کے ساتھ تمام شرائط کی خلاف ورزی اور حکومت شام کی چیرہ دستیوں کو دیکھتے اور ان سے متاثر ہوتے رہے اور انھیں آپ نے ایک ایک کر کے اس وقت ظاہر کر دیا جب امیرِ شام نے آپ کو ایک تہدید آمیز خط لکھا ہے۔ آپ نے اس کے جواب میں ایک تاریخی مکتوب تحریر فرمایا جو درجِ ذیل ہے :-

"تمھارا خط ملا جس میں تم نے لکھا ہے کہ تم نے میرے متعلق اپنی مخالفت کے بارے میں کچھ خبریں سنی ہیں جن کی تم کو امید نہ تھی۔ تم کو جو خبریں پہنچی ہیں وہ تمھارے خوشامدی لوگوں اور چغلخوروں کی پہنچائی ہوئی ہیں۔ جو افترا و بہتان کی حیثیت رکھتی ہیں۔ میں اس وقت تم سے مخاصمت اور جنگ کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ اور خاموش ہوں مگر تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں اس خاموشی سے خوش نہیں ہوں اور یقیناً مجھے اپنے اس سکوت سے یہ اندیشہ ہے کہ کہیں خدا اس کی وجہ سے مجھ پر ناراض نہ ہو۔ یہ میری خاموشی تمھارے لیے اور تمھارے ہوا خواہوں کے لیے کبھی کوئی سند نہیں بن سکتی۔ کیوں معاویہ! کیا تم ہی نہیں ہو وہ شخص جس نے حجر کندی کو قتل کیا! کیا تم ہی وہ نہیں ہو جس نے ایسے نماز گزاروں

---

[1] ارشاد ص ۲۰۶

اور پرہیزگاروں کو قتل کیا جو ظلم و بدعت کو پسند نہ کرتے تھے اور دین کے معاملہ میں کسی شخص کی ملامت اور سرزنش کی پروا نہ کرتے تھے۔ حالانکہ تم ان کے ساتھ بڑی قسمیں کھا کر پختہ وعدے کر چکے تھے اور انھوں نے نہ کوئی فتنہ ملک میں پیدا کیا تھا اور نہ تمھاری مخالفت کی تھی مگر تم نے ان کو قتل کیے بغیر نہ چھوڑا۔ کیا تم ہی وہ شخص نہیں ہو کہ جس نے عمر بن الحمق الخزاعی صحابیٔ رسولؐ کو قتل کیا جو ایسا صالح اور عبادت گزار بندہ تھا کہ کثرت عبادت سے اس کا جسم گھل گیا تھا۔ بدن ڈھل گیا تھا۔ قوتیں زائل ہو گئی تھیں اور چہرہ پر زردی چھا گئی تھی۔ تم نے پہلے ان کو امان دے دی تھی اور ایسا مضبوط وعدہ کیا تھا کہ اگر ایسا وعدہ کسی جانور سے بھی کیا جائے تو وہ پہاڑ کی چوٹی سے اتر کر پاس آجائے۔ پھر تم نے بڑی جسارت کے ساتھ اس عہد کو توڑ دیا اور بے جرم و خطا ان کو مار ڈالا۔ کیا تم ہی وہ شخص نہیں ہو جس نے زیاد بن سمیہ کو جو بنی ثقیف کے غلام عبید نامی کا بیٹا تھا اپنا بھائی، اپنے باپ ابوسفیان کا بیٹا قرار دیا۔ حالانکہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ بیٹا اس کا سمجھا جائے گا جو عورت کا اصلی شوہر ہو، اور زناکار کے لیے بس پتھر ہیں اور کچھ نہیں۔ مگر تم نے اپنی مصلحت کی بنا پر رسولؐ کو پس پشت ڈال دیا اور اس کو اپنا بھائی بنا کر عراقین کا حاکم بنا دیا۔ تاکہ وہ مسلمانوں کے ہاتھ پیر قطع کرے اور ان کی آنکھوں کو گرم لوہے کی سلاخوں سے پھوڑے۔ اور درختوں کی شاخوں میں لٹکا کر مارے۔ کیا تم ہی وہ نہیں ہو جسے زیاد بن سمیہ نے لکھا تھا کہ حضرمیین علیؑ کے دین پر ہیں۔ تم نے حکم دیا کہ جو لوگ علیؑ کے دین پر ہیں ان میں سے ایک کو زندہ نہ چھوڑو۔ اس نے سب کو مار ڈالا اور مُثلہ بھی کیا۔ اور جو تم نے مجھے لکھا ہے کہ میں اپنے نفس کا، اپنے دین کا اور امتِ محمدی کا خیال کروں اور ان کو فتنہ میں نہ ڈالوں اور جماعت

کی تفریق سے پرہیز کروں۔ تو میرے خیال میں کوئی فتنہ اس امت میں تمھاری خلافت وحکومت سے بڑھ کر نہیں ہے اور میں اپنے نفس، اپنے دین اور امتِ محمدی کے لیے کسی فائدہ کو اس سے بڑھ کر نہیں سمجھتا کہ میں ان امور میں تمھاری مزاحمت کروں۔ اگر میں ایسا کروں تو بیشک قربتِ الٰہی کا موجب ہوگا اور اگر ترک کروں اور خاموش رہوں تو اس کے لیے خدا سے استغفار کروں گا اور اس سے رشد وصلاحیت کا طالب ہوں گا۔"

اس خط سے امام حسینؑ کے تاثرات کا پورے طور پر اندازہ ہوتا ہے اور یہ کہ آپ کسی اہم اقدام کے لیے اپنی ذمہ داری کو محسوس کر رہے تھے۔ لیکن اس کے بعد بھی آپ نے اس وقت تک بالکل خاموشی اختیار کی جب تک کہ معاہدہ کی آخری سانس بھی قائم سمجھی جا سکتی تھی۔ اس کے بعد کے واقعات آنے والے ابواب میں نذرِ ناظرین ہوں گے۔

دسواں باب

یزید کی ولیعہدی

معاویہ کے لیے ان کی زندگی کا طویل دور کم نہ تھا جس میں انھوں نے مسلمانوں کی قسمت کے مالک بن کر اپنے حوصلے نکال لیے تھے۔ اور دنیا کی جاہ وحشمت اور مال ودولت کے خوب خوب مزے اٹھا چکے تھے، جس کا اعتراف انھوں نے ایک خاص انداز میں خود بھی کیا اور کہا کہ ہم تو دنیا میں غلطاں ہو گئے اور لوٹ لوٹ کے اس میں رہے[1] مگر انھوں نے اس پر اکتفا نہ کی اور یہ چاہا کہ ان کی اولاد بھی اسی طرح بہرہ اندوز ہو۔ حالانکہ وہ معاہدہ میں یہ شرط کر چکے تھے کہ میں اپنے بعد کسی کو خلیفہ نامزد نہ کروں گا۔ پھر بھی انھیں فکر اس کی ہوئی کہ اپنے بیٹے یزید کو اپنا جانشین بنا دیں مگر وہ یزید کے افعال وعادات کی وجہ سے سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کو اس پر تیار کرنا بڑا دشوار گزار مرحلہ ہے۔ اس لیے وہ اس کو زبان پر نہیں لاتے تھے۔ تاہم وہ رفتہ رفتہ اس کے انتظامات مکمل کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک ایسے بااثر افراد کا جو مدعیٔ خلافت بن سکیں ختم کرنا تھا۔ چنانچہ عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید جن کا اثر اس وجہ سے شام میں بڑھ گیا تھا کہ ان کے والد کے کارنامے رومیوں کے مقابلہ میں اہلِ شام کے زبان زد تھے اور اس بنا پر معاویہ کو اندیشہ تھا کہ کہیں اہلِ شام ان کو خلیفہ نہ تسلیم کر لیں لہٰذا ان کا علاج یہ کیا گیا کہ ابن آثال کے ذریعہ سے ان کو زہر دلا دیا جس سے ان کا خاتمہ ہو گیا[2]۔ معاویہ نے ابن آثال کو اس کا معاوضہ یہ دیا کہ ہمیشہ کے لیے ٹیکس سے مستثنیٰ کر دیا اور حمص کے خراج کی وصولیابی کا اسے والی قرار دے دیا[3]۔ مگر اسے اس رشوت سے فائدہ اٹھانے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ اس لیے کہ عبدالرحمٰن کے بھائی مہاجر بن خالد نے مدینہ سے دمشق جا کر اپنی تلوار سے ابن آثال کو قتل کر دیا جس پر معاویہ نے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۸۶ [2] الوزراء والکتاب ص ۱۶ [3] طبری ج ۶ ص ۱۲۸

مہاجر کو قید کی سزا دی اور ایک سال کے بعد رہا کیا۔[۵] دوسرا قول یہ ہے کہ عبدالرحمٰن کے بیٹے خالد بن عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید نے اپنے باپ کے قاتل کو حمص جا کر وہیں تہ تیغ کیا۔ اس پر معاویہ نے اس کو تھوڑے دن تک قید کیا، پھر دیت (خون بہا) لے کر رہا کر دیا۔[۶] یہ ۴۶ھ کا واقعہ ہے۔ ان کے مقربین اور گرد و پیش کے رہنے والے اس کا اندازہ رکھتے تھے کہ معاویہ کی یہ دلی خواہش ہے کہ وہ یزید کو اپنا ولی عہد بنائیں مگر انھیں بھی اس کے بروئے کار آنے کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ سب سے پہلے جس نے اس تعطل اور جمود کو حرکت اور عمل میں تبدیل کیا وہ مغیرہ بن شعبہ والیٔ کوفہ تھا۔ یہ شخص بڑا ہی مدبّر اور عرب کے نہایت چالاک لوگوں میں محسوب تھا۔ واقعہ یہ پیش آیا کہ مغیرہ نے شاید فقط امتحان کے طور پر دمشق جا کر معاویہ کے سامنے حکومتِ کوفہ سے استعفا دینے کا خیال ظاہر کیا۔ وہ سمجھتا ہوگا کہ امیر معاویہ مجھے کسی قیمت پر ہٹانے کے لیے تیار نہ ہوں گے اور اس کے بعد میری خوشامد کریں گے۔ وہاں معاملہ برعکس ہوا اور معاویہ نے ایک دوسرے شخص کو کوفہ کی حکومت کے لیے تجویز کیا۔ جب یہ صورت پیش آئی تو مغیرہ نے حکومتِ کوفہ پر برقرار رہنے کے لیے تدبیر کی کہ وہ یزید کے پاس گیا اور اسے یہ پٹی پڑھائی کہ تم اپنے باپ سے ولیعہدی کا اعلان کیوں نہیں کرتے؟[۷] کون کہہ سکتا ہے کہ یزید خود ہی اس کے واسطے دل ہی دل میں بےچین نہ ہوگا اور اگر اسے شراب و کباب کے مشغلوں میں اب تک اس پر غور کرنے کا موقع نہ بھی ملا ہو تب بھی مغیرہ کا یہ کہنا اس کی دیوانہ طبیعت کے لیے "ہوئے بس است" سے کم نہ تھا۔ وہ معاویہ کے پاس گیا اور ایک لاڈ پیار سے پلے ہوئے بے باک بیٹے کی طرح اپنے باپ سے بضد ہو کر اپنی ولیعہدی کے لیے خواہش کی اور مغیرہ بن شعبہ کے خیالات کو جو اس بارے میں تھے بیان کیا۔ معاویہ کو تو کبھی اس کی توقع ہوتی ہی نہ تھی کہ کوئی سنجیدہ انسان اس منصب کے لیے یزید کا نام پیش کرے گا۔ انھوں نے جو مغیرہ کی گفتگو سنی تو سمجھے کہ سوکھے دھانوں پانی پڑا۔ انھوں نے مغیرہ کو بلوایا اور اس سے اس بارے میں تبادلۂ خیالات کیا۔ مغیرہ نے بڑے اعتماد

کے ساتھ بتلایا کہ اس مہم کا پورا ہونا کوئی مشکل نہیں ہے۔ کوفہ میں یزید کی موافقت پر لوگوں کو ہموار کرنے کے لیے میں کافی ہوں۔ بصرہ میں زیاد اس کام کو انجام دے گا۔ ان دو مقامات کے بعد پھر تیسری جگہ کوئی ایسی ہے نہیں جو یزید کی مخالفت کی جرأت کر سکے۔ معاویہ نے مغیرہ کی ان باتوں کو بڑی توجہ کے ساتھ سنا اور اس کو کوفہ کی گورنری پر بحال کر دیا۔ مغیرہ فوراً کوفہ پہنچا اور اس مقصد کی تکمیل میں مصروف ہو گیا۔ اسے اپنی کارگزاری کا نتیجہ جلدی سے معاویہ کی خدمت میں پیش کر کے صلہ حاصل کرنا اور اپنی وفاداری کا سکّہ جمانا تھا۔ اس لیے اس نے سب سے پہلے جو خاص بنی امیہ کے ہوا خواہ تھے ان کو بلا کر اپنے مقصد کا تذکرہ کیا اور بتایا کہ "خلیفۃ المسلمین" اس امر کے متعلق مطمئن نہیں ہیں کہ کوفہ کے لوگ اس ولیعہدی کو تسلیم کریں گے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ یہاں سے ایک وفد ان کی خدمت میں جائے اور یہ التجا پیش کرے کہ وہ یزید کو اپنا ولیعہد قرار دیں۔ پھر بھی ایسے لوگ کم ملتے تھے جو اس وفد میں شریک ہونا پسند کریں۔ اس کے لیے مغیرہ کو اپنی جیب خاص یا خزانۂ سرکاری سے ۳۰ ہزار درہم رشوت میں صرف کرنا پڑے۔ اس طرح کوفیوں کا ایک وفد مرتب کر کے اپنے بیٹے موسیٰ کی قیادت میں معاویہ سے یزید کی نامزدگی کے لیے درخواست پیش کی۔ معاویہ اس التجا کی حقیقت کو خوب سمجھتے تھے چنانچہ انھوں نے وفد کو مناسب جواب دینے کے بعد علیحدگی میں موسیٰ بن مغیرہ سے پوچھا کہ سچ بتاؤ کتنے پر تمھارے باپ نے ان لوگوں کے دین و ایمان کو خریدا کیا؟ موسیٰ نے کہا تیس ہزار درہم میں۔[۱]

معاویہ کو اس معاملہ میں مسلمانوں کی رائے عامہ کے متعلق اب بھی اطمینان نہ تھا۔ انھیں جمہور کی نفرت و بیزاری کا خوف دامن گیر تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ مغیرہ کے اس وفد کو رائے عامہ کا ترجمان نہیں سمجھا جا سکتا۔ اب انھوں نے زیاد بن ابیہ کو جسے وہ سیاسی طور پر اپنا بھائی بنا چکے تھے۔ اس معاملہ میں مشورہ لینے کے طور پر خط لکھا۔ زیاد

[۱] کامل ابن اثیر

اب اس خط سے اس خواہش کا اظہار
کو معاویہ کی اس خواہش کا اندازہ بہت عرصہ سے ہوگا۔ بھی ہوگیا اور یہ ظاہر ہے کہ ایک وفادار گورنر کی حیثیت سے اس کا کیا فرض ہونا چاہیے تھا خصوصاً جبکہ معاملہ اس کے "بھتیجے" کا تھا۔ مگر معاملہ کی نزاکت اور اس کے تمام پہلو زیاد کو لرزہ براندام بنا رہے تھے چنانچہ اس نے اپنے خاص محرم راز عبید بن کعب نمیری کو بلا کر کہا، کہ "خلیفۃ المسلمین نے مجھے خط لکھا ہے کہ انھوں نے یزید کی بیعت لینے کا ارادہ کیا ہے مگر انھیں لوگوں کی نفرت و بیزاری کا خوف ہے اور چاہتے ہیں کہ کسی طرح جمہور مسلمین متفق کیے جا سکیں اور اس بارے میں مجھ سے مشورہ کیا ہے۔ اسلامی ذمہ داری کا احساس بہت اہم ہے اور یزید ایک آوارہ اور مطلق العنان شخص ہے اور شکار کا بڑا دلدادہ ہے۔ تم میری طرف سے سرکار کے پاس جا کر یزید کے افعال و حالات کا تذکرہ کرو اور کہو کہ ذرا سوچ سمجھ کر اس کام کو کریں تھوڑے دن کی تاخیر کر لینا اس سے بہتر ہے کہ جلد بازی سے کام لیا جائے جس کا نتیجہ ناکامی کی صورت میں ظاہر ہو۔ عبید نے اس میں اتنی ترمیم کی کہ معاویہ کو اسطرح دو ٹوک جواب نہ دیا جائے بلکہ یزید سے مل کر اس سے کہا جائے کہ اگر آپ کو رائے عامہ اپنے موافق بنانا ہے تو ان افعال کو ترک کیجیے جنھیں مسلمان عموماً ناپسند کرتے ہیں۔ زیاد نے معاویہ کو صرف اتنا لکھا کہ اس بارے میں ذرا تاخیر سے کام لیجیے۔ تعجیل مناسب نہیں ہے[1] کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد یزید نے اپنی بہت سی بداعمالیوں کو ترک کر دیا[2] مگر بعد کے حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کینہ یزید کے دل میں زیاد کی طرف سے پیدا ہوگیا بلکہ شاید ہم سنی کی رقابت سے اس کو یہ خیال ہوا کہ زیاد نے یہ مخالفت اپنے بیٹے عبیداللہ کے اشارے سے کی ہے اس لیے وہ عبیداللہ بن زیاد سے بھی ایک عرصہ تک اس کے بعد بدظن رہا۔

۴۹ھ یا ۵۰ھ میں ستر برس کی عمر میں مغیرہ کا انتقال ہوگیا[3] اب کوفہ میں زیاد کی حکومت ہوگئی۔ وہ ۴۵ھ میں معاویہ کی طرف سے بصرہ، خراسان اور سجستان کا حاکم

[1] طبری ج ۶ ص ۱۷۰ [2] [illegible] [3] طبری ج ۶ ص ۱۳۱

بنایا گیا تھا۔ پھر بحرین اور عمان بھی اس کی حکومت میں شامل کر دیے گئے[1] اب مغیرہ کے مرنے کے بعد کوفہ بھی اس کی حکومت میں شامل کر دیا گیا۔ چونکہ اس تمام قلمرو میں بصرہ اور کوفہ دو اہم مقام تھے لٰہذا اب وہ سال میں چھ مہینہ بصرہ میں رہتا تھا اور چھ مہینہ کوفہ میں اور اس مدت میں بصرہ کی حکومت پر سمرہ بن جندب کو اپنا قائم مقام بنا جاتا تھا[2] تین یا چار سال کی مدت گزرنے پر ۴ ماہ رمضان ۵۳ھ کو زیاد کی بھی وفات ہوگئی[3] اب شاید اس اندیشہ میں کہ رہے سہے خاص خاص خیر خواہ بھی کہیں راہیٔ ملک عدم نہ ہو جائیں۔ معاویہ نے ایک تحریری فرمان یزید کی ولیعہدی کا لکھ کر مجمع عام میں اس کا اعلان کر دیا اور رعایا سے اس کا اقرار لیا گیا[4]

واقعات بتاتے ہیں کہ مغیرہ بن شعبہ بڑی حد تک کوفہ کی زمین کو ہموار بنانے کا کام کر چکا تھا اور کم از کم ہوا خواہان بنی امیہ کو اس کے لیے تیار کر لیا تھا۔ بصرہ میں بہرحال عبیداللہ بن زیاد کو اس اسکیم کی تکمیل کرنا لازم تھی۔ چاہے اس کی ذاتی رائے اس بارے میں کچھ بھی ہوتی اور وہاں کی خلقت اس کے باپ سے اور خود اس سے اس درجہ مرعوب و خائف تھی کہ وہاں کسی مخالفت کا امکان نہ تھا اور شام تو اپنا ملک ہی تھا۔ لے دے کر وہاں ایک عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید تھے۔ جن سے اندیشہ ہوتا انھیں پہلے ہی ختم کیا جا چکا تھا۔ دوسرے مقتول خلیفہ عثمان کے بیٹے سعید تھے۔ انھوں نے ذرا خلافت یزید پر اظہار ناراضگی کیا اور خود معاویہ کے پاس آ کر کہا کہ آپ نے یزید کو مجھ پر مقدم کیا اور اس کے لیے بیعت لی حالانکہ بخدا آپ جانتے ہیں کہ میرے باپ اس کے باپ سے بہتر اور میری ماں اسکی ماں سے اچھی اور میں خود اس سے بہتر ہوں اور آپ کو جو کچھ ملا ہے یہ میرے باپ کا صدقہ ہے۔ یہ سن کر معاویہ نے کہا کہ تم نے جو اپنے باپ کے احسان کا مجھ پر ذکر کیا تو مجھے اس کا انکار نہیں مگر میں نے اس کا عوض یہ کر دیا کہ ان کے خون کا مطالبہ کیا اور قاتلوں سے ان کے بدلہ لیا اور تمھارے باپ کی فضیلت اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ مجھ سے بہتر تھے اور انھیں رسولِ خدا سے قرابت مجھ سے زیادہ حاصل

[1] طبری ج ۶ [2] طبری ج ۶ ص ۱۳۱ [3] الوزراء والکتاب ص ۱۶ [4] طبری ج ۶ ص ۱۷۰

تھی۔ اسی طرح تمھاری ماں کی فضیلت۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کیونکہ قرشیہ کی بزرگی کلبیہ پہ ظاہر ہے لیکن یہ بات کہ تم یزید سے بہتر ہو تو معلوم ہونا چاہیے کہ میرے نزدیک اگر تم ایسوں سے سیر اگھر بھرا ہو وہ سب مل کر بھی یزید کے برابر نہ ہوں گے۔

وہ تو یہ جواب سنکر اپنا سامنہ لے کر رہ گئے ہوں گے مگر پھر کہا جاتا ہے کہ یزید نے اپنے باپ سے سفارش کہ سعید میری وجہ سے کبیدہ خاطر ہو گئے ہیں تو آپ انھیں کسی صورت سے خوش کر دیجیے۔ اس پر معاویہ نے انھیں خراسان کا حاکم بنا دیا۔[1] اس طرح یہ خدشہ بھی دور ہو گیا۔ شام اور عراق کو ہموار کرنے کے لبعد معاویہ نے مکّہ اور مدینہ کے متعلق خیال کیا اس زمانہ میں مرؔوان مدینہ کا حاکم تھا۔ معاویہ نے اس کو لکھا کہ ہم نے یزید کو اپنا ولیعہد بنایا ہے اور اس کے لیے ولیعہدی کی بعیت لی جا چکی ہے تم خود بھی یزید سے بعیت کرو اور ہماری طرف سے وہاں مدینہ کے لوگوں سے یزید کے لیے بعیت لو۔ مرؔوان نے جب معاویہ کا حکم پڑھا تو غصہ سے برافروختہ ہو کر گھر میں گیا۔ گھر والوں اور اپنے ماموں زاد قبیلہ بنی کنانہ کے لوگوں پر بھی اپنی اس ناراضگی اور رنج د غضب کا اظہار کیا اور اسی غصہ میں دمشق کی طرف معاویہ سے خود بات چیت کرنے کی غرض سے روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر معاویہ سے ملا اور اس انداز سے چلتا تھا جس طرح دو برابر کے رشتہ دار ہوتے ہیں۔ معاویہ سے غصہ سے بھری ہوئی تیز و تند تقریریں کیں اور کہا یہ آپ کیا کر رہے ہیں چھوکروں کو امیر اور سردار بناتے ہیں۔ اس ارادہ سے باز آئیے۔ یاد رکھیے کہ آپ کی قوم میں ایسے اور بھی موجود ہیں جو آپ کے مشوروں میں شریک اور آپ کے کاموں میں آپ کے وزیر و مددگار رہے ہیں۔ معاویہ نے کہا، مروان خفا نہ ہو۔ تم بیشک خلیفۂ وقت کی نظیر ہو اور ہر مشکل میں اس کے پشت پناہ اور مددگار رہو۔ اس لیے یزید کے لبعد تم کو ہی یزید کا ولیعہد ہم نے قرار دیا ہے۔ یہ تھا وہ سیاسی منتر جس نے مروان کے غصہ کو ختم کر دیا اور مروان بخیال خود مطمئن ہو کر مدینہ واپس ہوا۔ مدینہ میں مروان نے ایک جلسہ منعقد کیا اور اس میں یزید کی تخت نشینی

[1] طبری ج ۶ ص ۱۷۱

کے متعلق ذکر کیا اور کہا معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کی بعیت کا اسی طرح حکم دیا ہے جس طرح ابوبکر نے عمر کے لیے بعیت لی تھی۔ یہ سننا تھا کہ عبدالرحمٰن بن ابی بکر بگڑ گئے اور کہا ابوبکر نے اپنے بیٹے کی بعیت نہیں لی تھی۔ یہ تو کسریٰ و قیصر کا طریقہ ہے۔ ہم ہرگز اس شرابی و زانی کی بعیت نہ کریں گے۔ عبدالرحمٰن کے خیالات کی تائید حضرت امام حسینؑ، عبداللہ بن زبیر اور عبداللہ بن عمر نے کی۔ جو واقعہ پیش آیا اس کی اطلاع مروان نے معاویہ کو کر دی۔ معاویہ نے کچھ دن تامل کیا۔ پھر یزید کو لے کر حج کے بہانے سے روانہ ہوئے۔ معاویہ کو خوب احساس تھا کہ ان لوگوں کو جنھوں نے خلافتِ یزید پر اعتراض کیا ہے دنیائے اسلام میں کیا اہمیت حاصل ہے۔ یہ یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ مسلمانوں کے ہر فرقہ کے نقطۂ نظر سے جن جن افراد کو اسلامی معاملات سے دلچسپی کا ورثہ پہنچتا تھا وہ سب ہی یزید سے اختلاف رکھنے میں متفق تھے۔ چنانچہ ایک طرف ان میں حضرت حسینؑ بن علیؑ تھے تو دوسری طرف

عبدالرحمٰن، ابن ابی بکر

عائشہ، بنتِ ابی بکر

عبداللہ، ابن عمر

عبداللہ، ابن عباس اور

عبداللہ، ابن زبیر بھی تھے

ان ناموں کے دیکھنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں میں جو فرقہ بندی آج قائم ہے اس کا کوئی اثر یزید کی ولیعہدی کے جواز پر نہیں پڑتا۔ اصولاً یزید کی ولی عہدی سے اختلاف میں تمام وہ افراد متفق تھے جو کسی فرقہ کے نقطۂ نظر سے بھی مذہبی نمائندگی کر سکتے تھے۔ اب یہ اپنا اپنا ثباتِ قدم اور استقلال ہے کہ کوئی تمام مشکلات کے باوجود آخر وقت تک اپنی اس بات پر قائم رہے اور کوئی پھر حالات سے مجبور ہو جائے لیکن اصول اور آئین کے اعتبار سے ان سب کا متفق ہونا خود ایک بڑی وزنی حقیقت ہے۔

معاویہ نے ان لوگوں کو خوف دلا کر بھی دبانا چاہا اور لالچ دلا کر بھی مائل کرنا چاہا۔ چنانچہ سب سے پہلے جب وہ مدینہ کے قریب پہنچے تو امام حسینؑ سے ملاقات ہوئی۔ آپ کو دیکھ کر معاویہ نے کہا نہ تمھارے لیے خوشی ہو اور نہ برکت۔ تم ایک قربانی کا دنبہ ہو جس کا خون جوش کھا رہا ہے۔ خدا کی قسم یہ خون ضرور گرایا جائے گا۔ امام حسینؑ نے فرمایا چپ رہو۔ ہم ایسے کلام کے اہل نہیں ہیں۔ معاویہ نے کہا۔ اس سے بھی بدتر کلام کے مستحق ہو۔ پھر اس کے بعد ابن زبیر سے ملے تو ان سے کہا کہ تو ایک چھپے ہوئے مکار سوسمار (گوہ) کے مانند ہے جو سر کو اپنے سوراخ میں ڈال کر دُم ہلاتا ہے۔ قسم ہے خدا کی عنقریب اس کی دم پکڑ لی جائے گی۔ دور کر دو اس کو، اور پھر ان کے خچر پر چابک مارا اور ہٹا دیا۔ پھر اس کے بعد عبدالرحمٰن بن ابی بکر ملے۔ ان کو کہا کہ یہ بڈھا بھی سٹھیا گیا ہے اور اس کی عقل جاتی رہی ہے۔ پھر حکم دیا کہ ان کے سواری کے خچر پر بھی تازیانہ مارو اور ہٹا دو۔ پھر عبداللہ بن عمر سے بھی ایسا ہی سلوک کیا گیا[1]

اس کے بعد مدینہ میں داخل ہو کر بھی خلافتِ یزید کے لیے ان حضرات کو ڈرانے دہلانے اور قتل کی دھمکیاں دینے لگے۔

عائشہ نے جو یہ سنا تو غصہ میں معاویہ کے پاس گئیں اور کہا کہ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ تم پہلے میرے ایک بھائی (محمد بن ابی بکر) کو قتل کر چکے اور تم نے لاش ان کی آگ میں جلائی آج مدینہ میں آکر میرے دوسرے بھائی کو تکلیف پہنچاتے ہو اور ان کے بارے میں سخت الفاظ استعمال کرتے ہو اور فرزندِ رسولؐ اور عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر کو بھی ڈراتے دھمکاتے ہو۔ تم ان لوگوں میں سے ہو جنھیں رسولؐ نے رحم کھا کر فتح مکہ میں قتل سے آزاد کر دیا تھا۔ تم کو ایسی حرکتیں ہرگز زیب نہیں دیتیں۔

طبری نے معاویہ کا مکالمہ جو عبدالرحمٰن بن ابی بکر کے ساتھ درج کیا ہے وہ حسبِ ذیل ہے:۔
معاویہ نے کہا، اے عبدالرحمٰن کیسے ہاتھ پیروں کے ساتھ تم میری نافرمانی کرنے کی

[1] کامل ابن اثیر جلد ۳ ص ۲۵۴

جرأت کرتے ہو؟ عبدالرحمٰن نے کہا اس لیے کہ اس امر کے لیے میں اپنے کو زیادہ مستحق سمجھتا ہوں۔ معاویہ نے کہا کہ میں اس صورت میں تمھارے قتل کا ارادہ رکھتا ہوں۔ عبدالرحمٰن نے کہا، اگر تم ایسا کرو گے تو لعنتِ خدا اور سزائے آخرت کے مستحق ہو گے[1]

یہ تو خوف دلانے کی ترکیبیں تھیں۔ جب یہ کامیاب نہیں ہوئیں تو دوسری صورت بھی اختیار کی گئی چنانچہ ایک لاکھ درہم عبدالرحمٰن بن ابی بکر کے پاس بھیجے۔ مگر انھوں نے روپیہ واپس کر دیا اور کہا کہ ہم دین کو دنیا کے عوض فروخت نہیں کریں گے اور مکہ سے ہجرت کر گئے۔ اسی طرح عبداللہ بن عمر کو بھی ایک لاکھ درہم بھیجے گئے، انھوں نے کہا کہ میں بڈھا ہو چکا ہوں اور میرا دین ایک لاکھ درہم سے زیادہ قیمتی ہے۔ یہ کہہ کر روپیہ واپس کر دیا۔ اور امام حسینؑ کو بھی بہت کچھ تحائف اور زر و مال پیش کیا گیا تھا مگر آپ نے قبول نہ فرمایا اور واپس کر دیا۔

ازواجِ رسولؐ میں سے عائشہ نے اس مخالفت میں زیادہ حصہ لیا چنانچہ حافظ جلال الدین سیوطی نے لکھا ہے کہ معاویہ مدینہ میں منبرِ رسولؐ پر بیٹھے یزید کی بیعت لے رہے تھے کہ عائشہ نے اپنے حجرہ سے پکار کر کہا کہ خاموش ہو جاؤ، کیا کر رہے ہو؟ کیا تم سے پہلے شیخین نے اپنے بیٹوں کے لیے کبھی بیعت لی تھی؟ معاویہ نے کہا کہ نہیں۔ تو عائشہ نے کہا پھر تم کس کی پیروی کرتے ہو؟ معاویہ یہ سنکر شرمندہ ہوئے اور منبر سے اُتر آئے۔

اس سے ظاہر ہے کہ یزید کی ولیعہدی سب کے نزدیک اصولِ شریعت اور آئینِ اسلام کے خلاف تھی۔ اس کے علاوہ حضرت امام حسنؑ کے ساتھ شرائطِ صلح میں یہ بات طے پا چکی تھی کہ معاویہ کو اپنے بعد کسی جانشین کے نامزد کرنے کا حق نہ ہو گا۔ اس کے بعد معاویہ کو اپنے بیٹے کا خود نامزد کرنا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔

یہ سب اس صورت میں بھی تھا کہ جب یزید اپنے کردار کے لحاظ سے اچھا ہی آدمی ہوتا چہ جائیکہ یزید کے اخلاق و عادات وہ تھے جو کسی شائستہ انسان اور ایک معمولی

[1] طبری ج ۶ ص ۱۷۱

مسلمان کے بھی شایانِ شان نہیں چہ جائیکہ خلافت کے لیے جو بہرحال ایک مذہبی عہدہ سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر وحید مرزا صاحب لکھتے ہیں۔ "اسلام کے شروع سے حاکمِ اسلام دین اور دنیا دونوں کا مقتدا سمجھا جاتا تھا۔ مذہب اور سیاست کا یہ اجتماع عقلمندانہ اصول پر مبنی تھا یا نہیں، یہ ایک مختلف فیہ بات ہے جس کے متعلق میں اپنی رائے کا اظہار ضروری نہیں سمجھتا لیکن یہ اصول عام طور پر تسلیم کرلیا گیا تھا اور اس لیے یہ ضروری سمجھا جاتا تھا کہ خلیفہ اسلام میں علاوہ سیاسی قابلیت کے مذہبی اور دینی صفات بھی بدرجۂ اتم موجود ہوں۔ اور یہ سب کو معلوم تھا کہ یزید اس لحاظ سے کسی طرح بھی مستحق خلافت نہیں تھا۔" اسی لیے جتنے سمجھدار انسان تھے سب ہی اس اقدام کو نازیبا سمجھ رہے تھے اور اسے ایک مہلک اقدام کی حیثیت سے دیکھتے تھے۔

حسن بصری کا قول تھا کہ معاویہ نے چار باتیں ایسی کیں جن میں سے ایک بھی ہو تو وہی ہلاکت کے لیے کافی ہے۔ اوّل جاہلوں کی مدد سے بغیر امت کے مشورہ کے انھوں نے خلافت پر قبضہ کرلیا۔ حالانکہ اس وقت اصحاب رسولؐ اور صاحبانِ فضیلت موجود تھے۔ دوسرے اپنے بیٹے کو جو شراب خوار نشہ باز تھا اور ریشم پہنتا اور طنبورہ بجایا کرتا تھا اپنا جانشین بنایا تیسرے زیاد کو اپنے باپ ابوسفیان کا بیٹا قرار دیا حالانکہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ بیٹا اسی کا قرار دیا جاسکتا ہے جو اصلی شوہر ہو اور زناکار کے لیے بس پتھر ہے۔ چوتھے حجر اور اصحاب حجر کا قتل کرنا[1]

دوسرا قول ان کا یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کی تباہی کے ذمہ دار دو شخص ہیں۔ ایک عمرو بن العاص جس نے معاویہ کو قرآن نیزوں پر بلند کرنے کی رائے دی تھی۔ چنانچہ وہ بلند کیے گئے اور دوسرے مغیرہ جس نے معاویہ کو یزید کی بیعت لینے کا مشورہ دیا۔ اگر مغیرہ کی یہ رائے نہ ہوتی تو قیامت تک انتخاب کا اصول قائم رہتا۔ معاویہ کے بعد جو

[1] کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۲۴۵۔ ابوالفداء ج ۱ ص ۱۹۶۔ طبری ج ۶ ص ۱۵۷

تخت نشین ہوئے وہ سب کے سب معاویہ کی مثال کے مطابق اپنے بیٹوں کی بیعت کراتے رہے۔

مسلمانوں کی اس رائے عامہ کی نمائندگی وہ چند اشخاص کر رہے تھے جن کے نام تاریخ میں درج ہیں۔

معاویہ پر یہ امر چھپا ہوا نہیں تھا کہ اس جماعت میں سب سے نمایاں ہستی حسینؑ کی ہے اور اس بناء پر انھوں نے مدینہ میں آکر سب سے پہلا کام جو کیا وہ یہ کہ حسینؑ بن علیؑ کو بلوا کر کہا کہ اس معاملہ میں تمام لوگ ہموار ہو چکے ہیں۔ سوا پانچ آدمیوں کے قریش میں سے جن کی سرکردگی آپ کر رہے ہیں۔ حضرت نے متعجبانہ انداز سے کہا۔ "میں ان کی سرکردگی کرتا ہوں؟" معاویہ نے کہا "بے شک آپ ہی ان کے سرغنہ ہیں۔" یہ سنکر حضرت نے فرمایا تو اس کی تدبیر یہ ہے کہ آپ دوسرے لوگوں کو بلوا کر ان سے بیعت کا مطالبہ کیجیے۔ اگر ان سب نے بیعت کرلی تو تنہا مجھ سے آپ کو کسی اندیشہ کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ دفع الوقتی کامیاب ہوئی اور نتیجہ میں معاویہ کی یہ کوشش بےسود ثابت ہوئی اور وہ ناامیدی کے ساتھ شام واپس گئے۔ امام حسینؑ کا بیعت سے انکار سلطنت کے اقتدار کیلئے بڑی سخت ٹھوکر تھی جسے معاویہ کی قوت سیاست دانی سمجھتی تھی مگر اسے حسینؑ بن علیؑ کا ایک بڑا تدبر سمجھنا چاہیے کہ آپ نے اپنے عمل کو سلبی حدود تک محدود رکھا یعنی صرف بیعت نہ کرنا اور سکوت اختیار کرنا۔ آپ جانتے تھے کہ فریق مخالف ایک وقت میں اس سکوت کو توڑنے کے لیے تشدد سے کام لے گا جس کے لیے آپ تیار تھے مگر آپ یہ نہ چاہتے تھے کہ آپ کی طرف کسی جارحانہ اقدام کا الزام عائد کیا جاسکے۔ دوسری طرف معاویہ نے بمقتضائے سیاست اس وقت کسی عملی اقدام کو مناسب نہیں سمجھا مگر اس کے بعد نہ معاویہ تدبیروں سے غافل تھے اور نہ حسینؑ مستقبل سے بے خبر تھے۔ اصل میں حسینؑ چاہتے تھے کہ میں خاموش رہوں اور حریف تشدد سے کام لے اور معاویہ کا مطلب یہ تھا کہ ہم اپنی طرف سے عملی طور پر تشدد کی پہل نہ کریں اور حسینؑ جوش میں آکر کوئی ایسا اقدام کر بیٹھیں جو امن عام کو صدمہ پہنچانے کی ذمہ داری ان پر عائد کردے۔

درحقیقت کربلا کی جنگ، اپنے قریبی اسباب کے لحاظ سے شروع یہیں سے ہوگئی مگر یہ اس وقت ایک صبر آزما نفسیاتی کشمکش تھی جو نہ معلوم کب تک جاری رہتی۔ اگر معاویہ کا رشتۂ عمر قطع نہ ہوتا اور نو عمر، ناتجربہ کار، غرورِ سلطنت سے بدمست یزید تختِ سلطنت پر نہ بیٹھتا۔

گیارھواں باب

معاویہ کی وفات اور یزید کی تخت نشینی

۶۰ھ میں امیرِ شام معاویہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے۔ انھیں اپنی بیماری کے عالم میں اور خصوصاً اس وقت جبکہ صحت سے مایوسی ہوگئی تھی شدید احساس تھا کہ انھوں نے یزید کی خلافت تسلیم کرانے میں کتنی محنت و مشقت برداشت کی ہے اور کس درجہ اپنے راحت و آرام اور مال و دولت اور سب سے بڑھ کر ضمیر کی قربانی کی ہے جو روحانی تکلیف کا باعث ہوتی ہے جس کا اظہار انھوں نے بصیغۂ راز مروان سے کیا۔ ملاحظہ ہو ابنِ حجر مکی کی کتاب "تطہیر الجنان و اللسان" جو انھوں نے معاویہ کے مناقب و فضائل میں تصنیف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک روز معاویہ رونے لگے۔ مروان نے سبب دریافت کیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ دنیا میں کون سی راحت تھی جو میں نے نہ اٹھائی ہو۔ اب سن زیادہ ہوگیا اور ہڈیاں گھُل گئیں اور جسم کمزور ہوگیا لیکن اگر مجھ پر یزید کی محبت کا غلبہ نہ ہوتا تو میں اپنے لیے راہ راست کو حاصل کرلیتا۔[1]

علامہ ابن حجر نے اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان الفاظ میں معاویہ نے پورے طور پر اقرار کرلیا ہے کہ یزید کی محبت نے ان کو ہدایت کے راستوں سے اندھا بنا دیا ہے اور اسی فرطِ محبت نے مسلمانوں کو ان کے بعد ایسے فاسق و فاجر کے ہاتھوں میں مبتلا کردیا جس نے ان کو تباہ کردیا۔[2]

پھر یہ فطری بات ہے کہ جتنا زیادہ کسی نے ایک مقصد کے لیے ایثار اور کد و کاوش کی ہو اتنی ہی اسے اپنے اس مقصد کی کامیابی کی فکر ہوتی ہے اور اس میں کسی خلل

---

[1] حاشیہ صواعق محرقہ ص۵۶ [2] حاشیہ صواعق محرقہ ص۵۸

کے واقع ہونے کا قلق ہوتا ہے۔ معاویہ نے یزید کے لیے کیا کچھ کیا اور اس میں ان کے نزدیک خلل کیا باقی رہ گیا، اس کا تذکرہ انھوں نے خود یزید سے کیا۔ اپنے مرض الموت کی ابتدا میں جبکہ انھوں نے اسے بلا کر کہا۔ بیٹے میں نے تم کو کوچ و در مقام کی زحمتوں سے بچا دیا اور تمھارے لیے تمام انتظامات مکمل کر دیے اور تمام دشمنوں کے سر تمھارے لیے خم کرا دیے اور تمام قوم عرب کی گردن کو تمھارے واسطے جھکا دیا اور سب کو تم پر مجتمع کر دیا ہے مگر مجھے اس خلافت کے مسئلہ میں جو تمھارے لیے مکمل ہو چکا ہے۔ بس قریش کے چار آدمیوں سے کھٹکا ہے حسینؑ بن علیؑ عبداللہ بن عمر عبداللہ بن زبیر اور عبدالرحمٰن بن ابی بکر[1]

ظاہر ہے کہ ان آنکھوں کی سوئیوں کے رہ جانے کا معاویہ کو کتنا خیال اور صدمہ ہو گا اور یہ صدمہ اتنا اُتنا بڑھتا جاتا تھا جتنا جتنا ان کی موت کا وقت قریب آتا جاتا تھا۔

لیکن وہ یزید جس کے لیے انھوں نے یہ سب کچھ کیا تھا اپنے بوڑھے باپ کے آخر وقت پاس موجود بھی نہ تھا[2] اور دمشق کے باہر مقام حوآرین پر رنگ رلیوں میں مصروف تھا[3] معاویہ نے اپنی حالت دگرگوں پا کر اس کے پاس بلانے کے لیے آدمی بھیجا مگر اس کے آنے میں تاخیر ہوئی تو انھوں نے اپنے پولیس آفیسر ضحاک بن قیس فہری اور اپنے پہرہ داروں کے سردار مسلم بن عقبہ کو بلا کر کہا کہ جب یزید آئے تو میری وصیت اس تک پہنچا دینا اور اسے بتلانا کہ میرا حکم اس کے لیے یہ ہے کہ وہ اہل حجاز کے ساتھ مراعات سے کام لے جو لوگ وہاں سے دار السلطنت میں آئیں ان کا اکرام و احترام کیا جائے اور جو وہاں کے اشراف اور بزرگ یہاں سے دور ہیں ان کی بھی وقتاً فوقتاً خبر گیری کی جاتی رہے اور اہل شام کو اپنا دست و بازو اور اپنا چشم و گوش بنائے رکھے اور انھیں شام کے صوبہ سے باہر زیادہ عرصہ تک نہ رکھا جائے تاکہ ان میں دوسرے مقامات کے اخلاق و اوصاف سرایت نہ کریں۔ اس کے بعد یہ بتلا دینا کہ مجھے اس کے خلاف صرف

[1] طبری ج ۶ ص ۱۷۹ [2] طبری ج ۶ ص ۱۸۲ [3] طبری ج ۶ ص ۱۸۳

چار آدمیوں سے خوف ہے۔ اول حسینؑ بن علیؑ، دوسرے عبداللہ بن عمر تیسرے عبدالرحمٰن بن ابی بکر اور چوتھے عبداللہ بن زبیر[1]

اس وصیت سے صاف ظاہر ہے کہ معاویہ بستر مرگ پر بھی اپنے دل میں تمام درد یزید کا لیے ہوئے تھے۔ ان کو نہ اپنی بیماری کا کوئی خیال تھا نہ اپنی تکلیف کا کوئی تصور نہ اپنے انجام کے متعلق کوئی فکر۔ انھیں اس وقت بھی خیال تھا، تصور تھا اور فکر تھی تو یزید اور صرف یزید کی۔ اور اس کے ساتھ آخر وقت کی پتھرائی ہوئی نگاہوں میں بھی صورتیں تھیں تو چار، جو یزید کے لیے ان کے نزدیک ایک خطرہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ جن میں سب سے پہلی تصویر تھی حسینؑ کی۔

رجب ۶۰ھ میں معاویہ دنیا سے رحلت کر گئے[2]۔ اڑتیس برس کی عمر میں وہ شام کے گورنر بنے تھے۔ ۵۸ برس کی عمر میں وہ خود مختار خلیفہ ہوئے اور ۷۸ برس کی عمر میں اب ان کی وفات ہوئی[3]

بعض مورخین کے بیان کے مطابق ان کی عمر اس سے کچھ کم ۷۳، یا ۷۵، اور بعض کے نزدیک اس سے زیادہ پچاسی سال کی تھی[3]

یزید کو اس کی شکارگاہ میں اس سانحہ کی اطلاع دی گئی جس کو سن کر وہ دمشق پہنچا۔ ایسے وقت جب معاویہ دفن بھی کیے جا چکے تھے۔ باپ کی بچھائی ہوئی مسند اس کے آنے ہی کی منتظر تھی۔ وہ تخت خلافت پر متمکن ہوا اور تمام اہل شام نے فوراً اس کی بیعت کر لی۔

[1] الاخبار الطوال ص ۲۲۷، طبری ج ۶ ص ۱۸۰ [2] طبری ج ۶ ص ۱۸۰، ارشاد ص ۲۰۶
[3] کتاب البلدان [4] طبری ج ۶ ص ۱۸۱

بارھواں باب

یزید تاریخ کی روشنی میں

یزید کی ماں میسون بنت بجدل بن انیف کلبیہ[1] ایک صحرائی عورت تھی جو شہری زندگی سے نفرت کرتی تھی مگر وہ اپنے حسن و جمال کی بدولت معاویہ کی بہت منظورِ نظر ہوگئی تھی اور انھوں نے اس کے لیے غوطہ کے مقابل ایک قصر تعمیر کرایا تھا۔ جہاں سے اس پُرنزہت جگہ کی سیر دور تک ہوسکتی تھی۔ اور اس قصر میں بڑے آرائش کے سامان اور سونے چاندی کے برتن، اور دیبائے رومی کے زنگارنگ اور منقش فرش مہیا کیے تھے۔ اور بہت سی حسین و جمیل کنیزیں خدمت کے لیے دی تھیں۔ ان شاہانہ انتظامات کے ساتھ میسون کو اس محل میں اتارا گیا تھا مگر یہ سب کچھ اس صحرائی عورت کی نگاہ میں خاک تھا۔ اس لیے کہ اسے تو اپنا جنگل اور اس میں چرتی ہوئی بھیڑ، بکریاں یاد آتی تھیں۔ ایک دن معاویہ کے محل میں آنے کا وقت تھا اور میسون ایک بہترین پوشاک پہن کر اور قیمتی زیورات پہن کر اور خوشبو لگا کر کنیزوں کے جھرمٹ میں اس کھڑکی کے سامنے بیٹھی تھی جو کہ غوطہ کے مرغزار کی طرف تھی۔ اس کو وہاں کے درخت نظر آرہے تھے اور طائروں کے نغموں کی صدا اور پھولوں کی خوشبو آرہی تھی۔ اس وقت اسے اپنا نجد کا بادیہ اور ہمجولیاں اور سہیلیاں یاد آئیں۔ جس کی بنا پر وہ بے ساختہ رونے لگی اور ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگی۔ ایک خواص نے رونے کا سبب دریافت کیا۔ میسون نے ایک لمبی سانس لی اور کچھ اشعار پڑھے جن کا مضمون یہ تھا "یقین سمجھو کہ وہ ڈیرا جس میں جو بائی ہوا کے جھونکے آتے رہتے تھے مجھے اس عالی شان محل سے زیادہ محبوب ہے اور وہ بالوں کی عبا جو میرے

[1] طبری ج ۲ ص ۱۸۳ و ج ۷ ص ۱۵۱

جسم پر ہوتی تھی ان باریک اور صاف پوشاکوں سے زیادہ محبوب تھی اور ایک سوکھی روٹی کا ٹکڑا اپنے جھونپڑے کے کونے میں بیٹھ کر کھانا مجھے ان صاف اور عمدہ روٹیوں سے زیادہ مرغوب تھا اور وہ درّہ ہائے کوہ میں ہواؤں کے تھپیڑے کی صدا میرے لیے طبلوں کی آواز سے زیادہ دلکش تھی اور وہ کتا جو مہمانوں کے آنے کے وقت بھونکتا تھا ان خوبصورت سدھی ہوئی مرغابیوں سے زیادہ محبوب تھا۔ اور وہ سرکش اونٹ جو ہودجوں کو لے کر چلتا تھا مجھے اس زین و لجام سے آراستہ خچر سے زیادہ پسند تھا، اور میرے قوم و قبیلہ کا ایک دُبلا پتلا حقیر آدمی مجھے ایک بدخو مسٹنڈے سے زیادہ محبوب تھا۔

جب معاویہ آئے تو اس خواص نے یہ قصہ معاویہ سے دہرایا یا یہ کہ معاویہ نے میسون کو یہ اشعار پڑھتے خود سن لیا۔ بہرحال ان کو بڑا غصہ آیا اور انھوں نے کہا کہ سب تو سب اس نے مجھ کو سخت بدخُو مسٹنڈا بنایا۔ میں اس کو تین طلاق دیتا ہوں۔ جاؤ اس سے کہو کہ وہ جو کچھ محل میں ساز و سامان ہے سب کچھ لے لے اور چلی جائے چنانچہ اسے نجد میں اس کے عزیزوں کے یہاں بھجوا دیا گیا۔ اس حالت میں کہ یزید اس کے پیٹ میں تھا[1] ۲۲ھ میں یزید کا تولد ہوا[2] دو برس کے بعد جب معاویہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے اس کو وہاں سے بلوا لیا[3] نوجوانی ہی کی عمر سے وہ فسق و فجور اور لہو و لعب میں مبتلا ہوگیا اور سن کے ساتھ ساتھ اس کے ان اوصاف میں بھی ترقی ہوتی گئی چنانچہ مختلف جانوروں کے ساتھ اس کے رکیک حرکات کا تاریخ میں مختلف صورتوں سے چرچا موجود ہے۔

علامہ دمیری نے لغت "مہد" کے تحت میں لکھا ہے کہ سب سے پہلے اس کو گھوڑے پر سوار یزید بن معاویہ نے کیا ہے[4] دوسرے مقام پر لکھا ہے کہ یزید کے ایک بندر کو گدھے پر بیٹھنے کی مشق کرائی گئی تھی اور گھوڑ دوڑیں اس کا بڑے شہسواروں سے مقابلہ کرایا جاتا تھا اور ایک مرتبہ وہ تمام شہسواروں سے سبقت لے گیا تو یزید نے اس بارے

[1] حیوٰۃ الحیوان ج ۲ ص ۲۰۷ [2] طبری ج ۴ ص ۲۵۹ [3] حیوٰۃ الحیوان ج ۲ ص ۲۰۷

میں شعر کہے جن کا مضمون یہ تھا کہ کوئی میری طرف سے کہہ دے اس بندر سے جو ایک گدھی کی پشت پر بیٹھ کر گھوڑوں سے آگے نکل گیا کہ اے ابوقیس جب تو اس پر سوار ہوا کر تو اس سے لپٹا رہا کر کیونکہ اگر تو گر کر مر گیا تو اس گدھی سے کوئی باز پرس بھی نہ ہو سکے گی۔[1]

یزید نے اپنے بندر کی کنیت ابوقیس قرار دی تھی اور اپنے ساغر کی بچی ہوئی شراب اسے پلایا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ یہ بنی اسرائیل کا ایک بزرگ ہے جس نے گناہ کیا تھا تو وہ مسخ ہو گیا اور وہ اس کو ایک گدھی پر سوار کرتا تھا جو اسی مقصد سے سدھائی گئی تھی اور گھوڑ دوڑ کے میدان میں وہ اسے گھوڑوں کے ساتھ چھوڑ دیتا تھا۔ ایک روز وہ گدھی آگے بڑھ گئی تو یزید بہت خوش ہوا اور یہ شعر پڑھے :-

"اے ابوقیس اس کی مہار سے لپٹ رہا کر، اگر تو گر پڑا تو اس پر کوئی ذمہ داری نہ ہو گی۔ اس گدھی نے یہ کارنمایاں کیا ہے کہ وہ تمام گھوڑوں سے آگے نکل گئی ہے۔"[2]

یہ تو اس کے لغو افعال تھے۔ اس کے علاوہ شرابخواری اس کی ضرب المثل تھی۔ چنانچہ عبداللہ بن زبیر نے نام ہی اس کا "سکران" یعنی بدمست رکھ لیا تھا۔[3] وہ کسی موقع پر مصلحتاً بھی اس عادت کو ترک کرنے پر تیار نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ جب ولی عہدی کے دور میں معاویہ کے حکم سے وہ مکہ و مدینہ میں اپنا اثر و رسوخ جمانے کے لیے حج کو گیا تو مدینۂ رسولؐ میں پہنچ کر بھی مصاحبوں کے جھمگٹے میں شراب کا دور ضرور چلایا۔[4]

واقدی نے عبداللہ بن حنظلہ غسیل الملائکہ کی زبانی نقل کیا ہے کہ خدا کی قسم ہم کو یزید کی حکومت میں یہ خوف ہو گیا تھا کہ اب آسمان سے ہم پر پتھر برسیں گے۔ وہ ایسا شخص تھا جو اپنی سوتیلی ماؤں اور اپنی بیٹیوں اور بہنوں تک کو نہ چھوڑتا تھا اور شراب آزادی سے پیتا تھا اور نماز کو ترک کرتا تھا۔[5]

اتنا ہی نہیں کہ وہ عملی حیثیت سے ایک لاابالی اور گنہگار شخص تھا بلکہ اس کے

[1] ... ص ۲۰۱ [2] تاریخ ابن الفوطی [3] الاخبار الطوال ص ۲۶۱

خیالات بھی ایسے ہی تھے۔ وہ اپنے افعال پر منفعل نہیں ہوتا تھا بلکہ ان پر نازاں تھا۔ اس کا مظاہرہ اس کے دیوان کے ان اشعار سے ہوتا ہے جن میں اس نے احکامِ شریعت کا مذاق اڑایا ہے بلکہ قرآن و حدیث کے ساتھ تمسخر کیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اشعار میں اکثر باتیں غیر واقعی بھی نظم ہو جاتی ہیں اور ان کے بیانات اکثر تخیئلی پیرایہ رکھتے ہیں مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ خیالات ویسے ہی دماغ میں آتے ہیں اور اشعار ویسے ہی تراوش کرتے ہیں جیسا انسان کا مذاقِ طبیعت ہوتا ہے۔ ایک دیندار متقی اور پرہیزگار شخص سے ممکن نہیں ہے کہ وہ اشعار میں خدا یا رسولؐ یا ائمہ دین کے ساتھ اس طرح کی جسارتیں کرے جو انتہائی سحقارت آمیز ہوں۔ یزید کے اشعار اسی طرح کے ہیں۔

وہ صرف لذائذ سے متمتع نہیں ہوتا تھا بلکہ نظریہ بھی یہی رکھتا تھا۔ دیکھا جائے تو عمر خیام کا یہ فلسفہ کہ آخر میں فنا ہونا ہے اس لیے جتنا ممکن ہو دنیا میں مزے لوٹ لو خیام سے پہلے یزید کے ذہن میں تشکیل پا چکا تھا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

اقول لصحب ضمت الکاس شملھم ... وداعی صبابات الھوی یترنم

خذوا بنصیبٍ من نعیم ولذۃ ... فکل وان طال المدی یتصرم

"ان ساتھیوں سے جنھیں ساغرِ شراب نے ایک مرکز پر جمع کر دیا ہے اور جن کے سامنے عشق و محبت کے محرکات نغمہ سرائی کرتے ہیں میرا یہ قول ہے کہ جتنا ممکن ہو عیش و لذت سے بہرہ ور ہو لو کیونکہ کتنی ہی مدت طولانی ہو آخر میں تو ختم ہی ہونا ہے۔"[1]

نماز اور شرابخواری کا موازنہ کرتے ہوئے اس نے ایک شعر میں کہا ؎

ماقال ربک ویل للالٰی شربوا ... بل قال ربک ویل للمصلین

یعنی "خدا نے شرابخواروں کو عذاب سے ڈرانے کے لیے "ویل الشاربین" کہیں

[1] صواعق محرقہ ص ۱۳۲

نہیں کہا بلکہ قرآن میں نماز گزاروں کو "ویل للمصلّین" کہا ہے"

ایک جگہ اس نے شراب کے بارے میں اس طرح کہا ہے ؎

فان حرمت یوما علیٰ دین احمد   فخذ ھا علیٰ دین المسیح ابن مریم

یعنی "اگر دینِ احمدؐ میں شراب پینے کو حرام سمجھا گیا ہے تو خیر دینِ مسیح پر ہو کر ہی پی لو"

اس نے آخرت کی نعمتوں کا موازنہ نغمہ و شراب سے کرتے ہوئے یوں کہا ہے ؎

معشر الندمان قوموا   واسمعوا صوت الاغانی

واشربو کأس مدام   واترکوا ذکر المعانی

شغلتنی نغمۃ العیدان   من صوت الاذان

وتعوّضت عن الحو   رعجو زا فی الدّنان

"اے حریفانِ شراب اٹھو اور گانوں کی صدا سنو، ساغرِ شراب پیو اور دوسری باتوں کا ذکر چھوڑ دو۔ مجھ کو ستار اور سارنگی کے نغموں سے اذان کی آواز سننے کی فرصت نہیں اور حوروں کے عوض میں نے شیشہ کی پری کو پسند کر لیا ہے۔"

یوں تو یہ اشعار تفریحِ طبع کا ذریعہ بھی بن سکتے ہیں مگر ان میں حور و قصور کی خبروں کا مضحکہ ضرور مضمر ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس نے حشر و نشر کے انکار کو بالکل صراحت کے ساتھ ظاہر کر دیا ہے۔ اپنے ان اشعار میں ؎

علیّۃ ھاتی واعلنی وترنّمی   بذالک انی لا احب التناجیا

حدیث ابی سفیان قدما سمابھا   الیٰ احد حتی اقام البواکیا

الا ھات سقینی علیٰ ذاک قھوۃ   تخیرھا العنسی کرما شامیا

اذا ما نظرنا فی امور قدیمۃ   وجدنا حلالا شربھا متوالیا

وان مت یا امّ الاحیمر فانکحی   ولا تاملی بعد الفراق تلاقیا

فانّ الذی حدّثت عن یوم بعثنا   احادیث طسم تجعل القلب ساھیا

ولا بدّلی من ان ازور محمّدا   بشمولۃ صفراء تردی عظامیا

"اے نازنین محبوبہ مجھے سنا اور بلند آواز سے سنا اور گا کر پڑھ، مجھے چپکے چپکے گفتگو اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ سنا ابوسفیان کا وہ پرانا قصہ، اُحد میں اسکا کارنامہ جہاں اس نے دشمنوں کے گھر میں ماتم برپا کر دیا تھا۔ ہاں اسی افسانہ کے ساتھ مجھے شراب پلاتی جا، وہ شراب جسے شام کے بہت منتخب انگور سے بنایا گیا ہو۔ ہم جب قدیمی عملدرآمد پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اس کا پینا حلال ہی نظر آتا ہے اور اگر میں مر جاؤں اے نازنین محبوبہ تو تُو کسی اور سے نکاح کر لینا اور یہ امید نہ کرنا کہ اس جدائی کے بعد کبھی پھر ملاقات ہوگی۔ دوسری زندگی کے متعلق تو نے جو قصّے سنے ہوں گے وہ پارینہ قصّے ہیں جو انسان کے دل کو نادانی میں مبتلا کرتے ہیں۔ یہ یقینی ہے کہ میں محمدؐ کا سامنا کروں گا ایسی شراب کے نشہ میں مست رہ کر جس کا اثر میری ہڈیوں تک پہنچ گیا ہو۔"

ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ اس کے دل میں جاہلیت کے خیالات اور بدر و اُحد کا مشرکانہ جذبہ اور حضرت محمد مصطفےٰؐ سے ضد اور کد کا جذبہ موجود تھا۔ ان کے ساتھ آگے چل کر وہ اشعار بھی آئیں گے جو اس نے قتلِ حسینؓ کے بعد اور اہلِ بیتؑ کے شام میں وارد ہونے کے وقت کہے ہیں تو وہ بھی انہی خیالات کے حامل نظر آئیں گے۔ اس سب کے باوجود یہ سیاستِ دنیا کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا تھا کہ ایسا شخص اسلامی خلیفہ اور ایک حیثیت سے جانشینِ رسولؐ اور امیر المومنین بنکر بیٹھ گیا تھا اور مسلمانوں کی اکثریت اس کی اس حیثیت کو تسلیم کر رہی تھی۔ اس کا اثر عام مسلمانوں کے اخلاق پر کیا پڑ سکتا، سوا اسکے کہ ان میں بھی مذہبی بے حسی بلکہ مذہب کو نگاہِ حقارت سے دیکھنے کا جذبہ اور رہی عیش و نشاط کی گرم بازاری پیدا ہو جاتی، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

تیرھواں باب

امام حسینؑ کے بلند اخلاق و کمالات اور گراں قدر مقولات

عرب کے ایک فلسفی شاعر نے کہا ہے۔ ان العظائم کفوٴھا العظماءٓ "بڑے کارناموں کے لیے بڑے ہی نفوس درکار ہوتے ہیں۔" ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے ؎

علیٰ قدر اھل العزم تأتی العزائم ۔۔۔ وتأتی علیٰ قدر الکرام المکارم

ویکبر فی عین الصغیر صغارھا ۔۔۔ ولتصغر فی عین العظیم العظائم

(یعنی) "صاحبانِ ارادہ کی شخصیت کے مطابق ہی ہوتے ہیں ان کے ارادے اور بزرگ مرتبہ نفوس کی مناسبت ہی سے ہوتی ہیں ان کی بزرگیاں، چھوٹے آدمی کی نگاہ میں چھوٹا سا کام بھی بڑا معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے اوّل تو وہ اس کے کرنے کی ہمت نہیں کرتا اور اگر کر بھی لیتا ہے تو اس کو اپنا سب سے بڑا کارنامہ سمجھ کر اس پر نازاں ہوجاتا ہے اور بڑے کی نگاہ میں بڑا کام بھی چھوٹا معلوم ہوتا ہے اس لیے وہ اسے کرگزرتا ہے اور اس پر بھی اس کا دل نہیں بھرتا بلکہ اس سے بھی بڑے کارنامہ کے لیے تیار رہتا ہے۔"

اس نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے تو مجاہدۂ کربلا ایسے عظیم الشان کارنامہ کا حامل ہونا ہی حسینؑ کے نفس بزرگی اور ان کے کردار کی رفعت کے متعلق وہ سب کچھ بتلا دیتا ہے جس کا شاید پورے طور پر اندازہ کرنا اور پھر اسے واضح طور پر الفاظ کے ذریعہ سے پیش کرنا مورخین کے تصور اور تحریر کی طاقتوں سے باہر تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ واقعۂ کربلا کے نادر خصوصیات عالمِ وقوع میں آہی نہ سکتے تھے۔ اگر اس کے انجام دینے کے لیے حسینؑ کے ایسے بلند نفس کا انسان موجود نہ ہوتا اور واقعۂ کربلا میں

عظمت، اہمیت اور نتیجہ کے لحاظ سے یہ تاثیر پیدا ہو ہی نہیں سکتی تھی اگر اس کا تعلق حسینؑ ایسی عظیم المرتبت ذات کے ساتھ نہ ہوتا۔

یوں تو واقعۂ کربلا خود ہی ایسے نادر خصوصیات رکھتا ہے کہ بحیثیت واقعہ اس کی مثال کوئی مل ہی نہیں سکتی لیکن ان خصوصیات سمیت بھی اس کی تاثیر کا بڑا تعلق اس چیز کے ساتھ ہے کہ وہ حسینؑ ایسی بلند ہستی کے ساتھ متعلق ہے۔ کوئی معمولی شخص ایسا کر ہی نہیں سکتا تھا اور بفرضِ محال کرتا بھی تو اس کی یہ تاثیر نہیں ہوسکتی تھی۔ اس لیے واقعۂ کربلا کا وقوع بھی حسینؑ کے نفس کی انتہائی عظمت کا ثبوت ہے اور اسکی وہ تاثیر بھی جو عالمِ اسلام میں پیدا ہوئی حسینؑ کے نفس کی رفعت و بلندی اور آپ کی شخصیت کی برتری کی دلیل ہے۔

مگر یہ نقطہ بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ شخصیت اور کردار کا باہمی تعلق ایک متعاکس نتیجہ رکھتا ہے یعنی کسی خاص عملی کارنامہ میں اہمیت اور تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ شخصیت کی رفعت و شہرت اور سربلندی سے اور پھر اس انسان کی شخصیت و عظمت میں اضافہ ہوجاتا ہے اس کردار سے۔ اس لیے کوئی شبہ نہیں ہے کہ اگرچہ واقعۂ کربلا کا وجود میں آنا اور پھر اس میں یہ تاثیر پیدا ہونا ممکن نہ تھا بغیر امام حسینؑ کے، مگر امام حسینؑ کی شخصیت کی ہمہ گیری اور رہنمایانِ عالم میں آپ کی امتیازی فوقیت کے آفتاب کا بلا تفریق مذہب و ملّت ہر واقف اور منصف شخص کی نگاہ میں خطِ نصف النّہار پر پہنچنا بھی واقعۂ کربلا کے سبب سے تھا، یہی وجہ ہے کہ واقعۂ کربلا سے پہلے کی آپ کی زندگی تاریخ کے صفحات پر اس حد تک محفوظ نہیں ہے جتنے کہ واقعۂ کربلا کے دوران میں آپ کی سیرت کے خط و خال اپنے چھوٹے سے چھوٹے جزئیات کے ساتھ محفوظ ہیں۔ سبب اس کا صاف ظاہر ہے۔ واقعۂ کربلا کے پہلے امام حسینؑ کو مورخین کی نگاہ بس اس حد تک دیکھ سکتی تھی جتنا کہ آپ کے بڑے بھائی حضرت امام حسنؑ یا آپ کی اولاد میں ان اماموں کو وہ دیکھ سکی جن میں سے ہر ایک تقویٰ، عصمت اور پاکبازی کا مجسمہ تھا۔ جیسے ان کے اوصاف و کردار کے متعلق کبھی اجمال اور کبھی کچھ تفصیل کے ساتھ بعض واقعات

سخاوت، عبادت، ریاضت وحلم وغیرہ کا تذکرہ ہے اسی طرح امام حسینؑ کے متعلق بھی جستہ جستہ اس قسم کے مختلف واقعات اور حالات کا تذکرہ صفحاتِ تاریخ پر پایا جاتا ہے۔ اس وقت کے تاریخی واقعات محفوظ کرنے والوں کو سنہ ۶۱ھ کے پہلے تک کیا معلوم تھا کہ آپ ایک ایسا عظیم کارنامہ انجام دینے والے ہیں جس کی مثال تاریخ کے صفحات پر نا پید ہوگی تاکہ وہ ابتدائے عمر سے آپ کی زندگی کے ہر جزئیہ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے اور انھیں سینہ بہ سینہ محفوظ کر کے لب بہ لب منتقل کرتے ہوئے کتابوں کے دامن تک پہنچاتے۔

لیکن ایک طرف تو واقعۂ کربلا کے دوران میں تمہیدی یا ضمنی طور پر تاریخ نے جو مختلف اخلاقی واقعات اور حالات حضرت امام حسینؑ کے بیان کر دیے ہیں وہ آپ کے سیرت و کردار کا ایک آئینہ پیش کرتے ہیں، دوسری طرف آپ کی سابقہ زندگی کے متعلق جن روایات کو تاریخ نے ہم تک پہنچایا ہے ان سے بھی آپ کی عظمت اور اوصاف وکمالات کے متعلق ایک روشن مرقع ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام حسینؑ صرف ایک مظلوم اور ستم رسیدہ، شہید ہونے کے لحاظ ہی سے دنیا کے قلوب کا مرکز نہیں ہیں بلکہ آپ کے ذاتی خصوصیات اور اوصاف وکمالات بھی آپ کو دنیا کا قبلہ بنانے کے لیے کافی تھے جن سے آپ انسانیت کی معراج بلندی میں سب سے زیادہ رفیع درجہ پر نظر آتے ہیں۔ ظاہری حیثیت سے ماہرینِ نفسیات کے نقطۂ نظر سے شخصیتوں کی تشکیل کے اسباب حسب ذیل ہوتے ہیں۔

پہلے خاندانی خصوصیات اور بزرگوں کے قدیم روایات۔ دوسرے ماحول اور تعلیم و تربیت تیسرے زندگی کے اہم تجربات۔ پہلی چیز وہ ہے جو انسان کے خون میں دوڑ کر اس کی صلاحیت اور استعداد اور فطری قابلیتوں کی تشکیل کرتی ہے۔ دوسری چیز ان صلاحیتوں کو فعلیت کے درجہ سے قریب تر پہنچانے کا کام انجام دیتی ہے یا بسا اوقات فعلیت میں لے آتی ہے اور تیسری چیز ان فعلی کمالات میں پختگی پیدا کر کے ملکۂ ذاتی بناتی اور ان میں استحکام پیدا

کرتی ہے۔ حضرت امام حسینؑ میں تینوں باتیں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ آپ کے خاندانی خصوصیات وہ تھے جن کی نظیر دوسرے شخص میں پائی نہ جاتی تھی اور یہ خصوصیت وہ تھی جس کے لحاظ سے آپ کے مخالف گروہ کو اپنی فوقیت ثابت کرنے کے لیے کوئی دلیل نہ ملتی تھی سوا ظلم وجبر اور قہر واستبداد کے۔ انھیں ایک خاص احساس کمتری کے ساتھ آپ کے بلند خصوصیات کو خود اپنی زبان پر لانا پڑتا تھا اور جواب دینے ہی کے ارادہ سے ان کا اعتراف کرنا پڑتا تھا چنانچہ یزید نے بھی اپنے دربار میں اس کا اقرار کیا کہ بے شک ان کی ماں میری ماں سے بہتر اور انکے نانا میرے نانا سے بہتر تھے۔[۱] ان خاندانی خصوصیات کے ساتھ جو ظاہری اسباب کی بنا پر حسنِ فطرت کے ضامن ہیں حسینؑ نے تربیت ایسی بلند پائی تھی جس سے انسان کے اخلاق و اوصاف میں بلندی پیدا ہونا لازمی ہے۔ اس کے علاوہ آپ کو مختلف حالات اور متضاد واقعات کے ایسے دور سے گزرنا پڑا تھا جس میں انسان کو جذباتِ نفس کے خلاف عقل کی طاقت سے کام لینا پڑتا ہے اس لیے نفس میں پختہ کاری، تدبّر اور استقلال پیدا ہونا لازمی ہے۔

ان واقعات سے ایک ایسا شخص بھی جو امام حسینؑ کی بحیثیت ایک معصوم ذات کے معرفت نہ رکھتا ہو، یہ ماننے کے لیے مجبور ہے کہ حسینؑ کوئی جذباتی انسان نہ تھے۔ وہ متحمل اور بردبار تھے اور کبھی غصہ اور جوش میں آکر کوئی کام ایسا نہ کرتے تھے جو نظم و ضبط اور سکون کے خلاف ہو۔ سخت سے سخت مواقع پر خاموشی آپ کا ایک مستقل کردار بن گئی تھی بشرطیکہ اس خاموشی سے اُن مقاصد کو کوئی ضرر نہ پہنچے جن کے وہ خود اور ان کے نانا، باپ اور بھائی محافظ رہے تھے۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایسی صلح کُل متحمل اور امن پسند ذات کسی ایسے اقدام کے لیے تیار نہیں ہو سکتی جس میں وہ اور اس کے تمام ساتھی ایک دم تہ تیغ ہو جائیں۔ جب تک ایسے اہم اور غیر معمولی اسباب پیدا

---

[۱] طبری ج ۶ ص ۲۶۶

نہ ہوجائیں جن کے بعد وہ ایسا کرگزرنا خالق کی طرف سے اپنا فرض سمجھے چنانچہ جب ایسی صورتیں پیدا ہوجاتی ہیں تو وہ ایسا کرگزرتا ہے اور اس سے اُس کے نفس کی ارادی طاقت اور عملی قوت کی پختگی اور اپنے ذاتی جذبات کو فرائض کے مقابلہ میں فنا کردیتے کی وہ بلند منزل ظاہر ہوتی ہے جس پر ہر انسان نہیں پہنچ سکتا۔

نفسانیت کی فنا اور فرض شناسی کا ملکہ ہی وہ ایک جامع اور وسیع مفہوم ہے جس کے تحت میں انسانی کردار کے تمام مظاہرات جزئی و کلی طور پر داخل ہوجاتے ہیں مگر حضرت حسینؑ کے کمالات واوصاف کی تشریح کے لیے جب اہلِ معرفت نے قلم اٹھایا تو اس پر اجمالی تبصرہ کے لیے بھی بلند ترین الفاظ تلاش کرنا پڑے اور تفصیل کے موقع پر بھی زریں روایات سامنے آئے۔

ابن ابی شیبہ مشہور محدث نے امام حسینؑ کا حال درج کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کان عالما بالقرآن عاملا علیہ زاھدا تقیا ورعا جوادا فصیحا بلیغا عارفا باللہ و دلیلا علیٰ ذاتہ تعالیٰ "آپ قرآن کے عالم اور اس پر عامل، زہد و تقویٰ کے جوہر کے حامل، پاکیزہ خصال، پرہیزگار، سخی، شیریں بیان اور شیوا زبان خدا کی معرفت رکھنے والے اور ذاتِ الٰہی کا ایک ثبوت تھے۔"

آخری فقرہ سے ظاہر ہے کہ لکھنے والا پہلے تو اوصاف کے اظہار میں بمجبوری ان الفاظ کو صرف کرتا رہا جو معمولی درجہ کے علماء اور زہاد کے متعلق بھی صرف ہوتے رہتے ہیں پھر اس کا حوصلۂ اظہار ان الفاظ کی کوتاہی سے تنگی کرنے لگا اور اس نے آخری الفاظ میں صفات انسانی کی معراج کمال کا پتہ دے دیا کہ وہ اپنے خالق کے اوصاف کا مظہر بن جائے۔ علامہ ابن عربی نے اسی لیے پہلے ہی کوتاہ دامن الفاظ کے دفتر کو تہ ہی رکھنا مناسب سمجھا اور انھوں نے کہہ دیا کان الحسین السبط آیۃ من آیات اللہ "سبطِ رسولؐ امام حسینؑ خدا کی نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی تھے۔" یہ اختصار بیان اوصاف میں وہ ہوتا ہے جو ہزار تفصیلوں سے بڑھ کر فائدہ دیتا ہے۔

حسینؑ بے شک ذاتِ الٰہی کا ثبوت اور اس کی بڑی نشانی تھے۔ اسی لیے خدا کو نہ ماننے والوں کا بھی حسینؑ کو دیکھ کر دل چاہنے لگتا ہے کہ خدا کو مان لیں یا ماننے لگتے ہیں۔ جیسا کہ جوش ملیح آبادی نے کہا ہے ؎

ہاں وہ حسینؑ جس کا ابد آشنا ثبات — کہتا ہے گاہ گاہ حکیموں سے بھی یہ بات
یعنی درونِ پردۂ صد رنگِ کائنات — اک کارساز ذہن ہے اک ذی شعور ذات
سجدوں سے کھینچتا ہے جو مسجود کی طرف
تنہا جو اک اشارہ ہے معبود کی طرف

عبادت آپ کی یعنی وہ جسے عام طور پر عبادت سمجھا جاتا ہے ورنہ حقیقت کے لحاظ سے تو آپ کا ہر عمل رضائے پروردگار کی غرض سے اور فرض کے احساس کا نتیجہ ہوتا تھا۔ اس لیے کوئی حرکت وسکون بھی آپ کا عبادت سے باہر نہ تھا مگر اس محدود مفہوم کے لحاظ سے بھی جس کے اعتبار سے لوگ انسان کو عابد کہتے ہیں آپ کی عبادت دنیا کے لیے ایک بے مثال نمونہ تھی۔ رات دن کی نماز گزاری اور مسلسل روزہ داری کے علاوہ ۲۵ حج آپ نے پاپیادہ کیے[1]

ان تمام حجوں کے واقعات اور زمانہ کی تعیین سے ہمارے موجودہ معلومات کوتاہ ہیں۔ ایک مرتبہ کے سفرِ حج کا تذکرہ ملتا ہے کہ خلیفۂ ثالث کے زمانہ میں امام حسینؑ اپنے والد بزرگوار جناب امیرؑ کی معیت میں حج کے لیے متوجہ ہوئے مگر آپ سقیا اور عرج کے درمیان تھے کہ بیمار پڑ گئے۔ عبداللہ بن جعفر آپ کو اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ حضرت علیؑ شاید کچھ آگے بڑھ چکے تھے۔ آپ کو بھی خبر دی گئی۔ آپ اسماء بنتِ عمیس کو لے کر تشریف لائے تقریباً بیس دن تک اور ایک روایت کے مطابق چالیس دن تک تیمارداری ہوتی رہی، تب آپ صحت یاب ہوکر مدینہ واپس آئے[2] لیکن یہ واقعہ اگر درست ہو تو اس

[1] تہذیب الاسماء نووی ج ۲ [2] تفسیر جامع البیان طبری ج ۲ ص ۱۲۷

تعداد سے خارج ہوگا۔ ہاں ایک مرتبہ کا یہ تذکرہ ہے کہ آپ اور آپ کے بھائی امام حسنؑ دونوں شاہزادے پیادہ حج کے لیے جا رہے تھے۔ اتفاق سے راستے میں حاجیوں کا قافلہ بھی ان تک پہنچ گیا۔ اب جوان شاہزادوں کو لوگوں نے پیادہ دیکھا تو ہر شخص جس کی نظر پڑتی وہ فوراً ان کے احترام کے لحاظ سے سواری سے اُتر پڑتا۔ کچھ دیر تو لوگ ساتھ ساتھ پیادہ چلتے رہے۔ آخر طاقتِ رفتار نے جواب دیا۔ سب مل کر سعد بن ابی وقاص کے پاس آئے جو اس قافلہ میں سن رسیدہ صحابی تھے۔ ان سے آکر کہا کہ اب تو راستہ چلنا ہم لوگوں پر بہت بار ہے۔ مگر یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ ہم لوگ سوار ہوں اور یہ دونوں شہزادے پیادہ رستہ طے کریں۔ سعد، امام حسنؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ حضور آپ کے ساتھ والوں میں سے بعض پر پیادہ چلنا نہایت شاق ہو رہا ہے۔ مگر لوگ جب آپ دونوں بزرگواروں کو پیادہ چلتے دیکھتے ہیں تو ان کا دل نہیں چاہتا کہ وہ سوار ہو کر راستہ چلیں، اس لیے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ دونوں حضرات سوار ہو جائیں۔ امام حسنؑ نے فرمایا کہ یہ تو نہیں ہو سکتا کیونکہ ہم نے اپنے اوپر فرض یہی قرار دیا ہے کہ ہم خانہ کعبہ کی طرف اپنے پیروں سے چل کر جائیں۔ مگر لوگوں کو تکلیف دینا بھی ہمیں گوارا نہیں ہے اس لیے ہم اس راستے کو چھوڑے دیتے ہیں چنانچہ وہ دونوں بزرگوار شاہراہ سے ہٹ کر دوسرے راستے سے روانہ ہو گئے[۱]۔ ایک مرتبہ کے حج کا یہ تذکرہ ہے کہ آپ کے بھتیجے عبدالرحمٰن بن حسنؑ آپ کے ساتھ تھے اور بحالتِ احرام میں آبواء کے مقام پر ان کی وفات ہو گئی[۲]۔

عبادتِ الٰہی کے ساتھ جو دلی وابستگی تھی اس کا اندازہ آپ کو امام حسینؑ کے ان الفاظ سے بھی ہو سکتا ہے جو ۹ محرم کی سہ پہر کو آپ نے ایک شب کی مہلت طلب کرنے کے موقع پر ارشاد فرمائے تھے۔ آپ نے کہا کہ اس شب کو ہم عبادت و ذکرِ الٰہی میں بسر کر لیں خدا ہی جانتا ہے کہ مجھے اس کی عبادت و ذکر سے کتنی محبت ہے[۳]۔ چنانچہ یہ شب آپ نے اور آپ کے

---

۱ ارشاد ص۔۔۔ ۲ ارشاد ص۔۔۔ ۳ ارشاد ص۲۴۳

ساتھیوں نے اس طرح گزاری کہ لھم دوی کدوی النحل یعنی ان کے تسبیح و تہلیل اور ذکر و مناجات کی آوازیں رات کے تاریک سناٹے میں اس طرح گونج رہی تھی کہ جیسے شہد کی مکھی کے چھتے سے آواز بلند ہوتی ہے۔ اور روزِ عاشورا ایسے سخت وقت میں نماز باجماعت ادا کی جب کہ موت کا بازار گرم تھا۔ کربلا کی زمین پر خون کی بارش الگ تھی۔ تیروں کی بارش الگ تھی اور گرمی سے آگ الگ برس رہی تھی مگر اس موقع پر ظہر کی نماز جماعت کے ساتھ یوں ادا ہوئی کہ دو جان نثاروں کو محافظت کے لیے سامنے کھڑا کیا کہ جو تیر آئے اسے اپنے سینہ پر روکیں ادھر نماز تمام ہوئی اور اُدھر ان میں سے ایک صحابی سعید بن عبداللہ حنفی زخموں سے چُور ہو کر زمین پر گرے۔ اس طرح حسینؑ نے خالق کی عبادت اور فریضۂ نماز کی اہمیت دنیا میں ثابت کی۔

اسی کے ساتھ آپ فیاض تھے۔ اور خلقِ خدا کو فائدہ پہنچانے کی فکر رکھتے تھے۔ اس کے واقعات تاریخ میں بکثرت ملتے ہیں۔

خود رسول اللہؐ نے اپنے اس نواسے کے اندر بچپنے ہی سے اس صفت کو کچھ ایسا نمایاں پایا کہ ارشاد فرمایا۔ امّا الحسن فان لہ ھیبتی و سوددی وامّا الحسین فان لہ جودی و شجاعتی (یعنی) حسنؑ کے لیے میرا رعب و داب اور شانِ سرداری ہے اور حسینؑ میں میری سخاوت اور میری بہادری[۱]۔ یوں تو حسینؑ اوصافِ رسولؐ کے وارث تھے ہی لیکن خصوصیت سے اپنی سخاوت و شجاعت بخشنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت کے یہ اوصاف دیگر اوصاف سے ضرور کچھ امتیاز رکھتے ہیں۔

خدمتِ خلق اور نوعِ انسانی کی ہمدردی کے بہترین جذبہ کے ساتھ ساتھ آپ نے اس کی بھی تلقین فرمائی ہے کہ اس بارے میں حفظِ مراتب کا خیال رکھنا چاہیے۔ یعنی سائل جتنا صفات کے اعتبار سے قابلِ عزت ہو اور علم و معرفت میں بلند درجہ رکھتا ہو اتنا اس کے ساتھ سلوک بہتر کیا جائے۔ اس کا بہترین ثبوت یہ واقعہ ہے کہ ایک اعرابی امام حسینؑ کی خدمت

---

۱ ارشاد ص۱۹۱

میں حاضر ہُوا اور تسلیم بجا لایا اور عرضِ حال کرتے ہوئے کہنے لگا کہ میں نے آپ کے جدِ بزرگوار کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب کوئی حاجت پیش کرنا ہو تو چار قسم کے آدمیوں میں سے کسی ایک کے سامنے پیش کرنا۔ یا تو شریف النّفس عرب یا سخی سردار یا حاملِ قرآن یا وجیہہ و شکیل انسان۔ آپ میں یہ چاروں صفتیں جمع ہیں۔ عرب قوم اس کو تو شرف آپ کے جدِ بزرگوار سے حاصل ہوا۔ اور سخاوت، یہ آپ کا شیوہ اور خصلت ہے۔ اور قرآن، وہ آپ ہی کے گھر میں نازل ہُوا اور خوبصورتی، اس کے متعلق میں نے آپ کے جدِ بزرگوار کو فرماتے ہوئے سنا کہ اگر مجھے دیکھنا ہو تو حسنؑ و حسینؑ کو دیکھ لینا۔ یہ پُرمعرفت تقریر سنکر حضرت نے فرمایا کہ تمھاری حاجت کیا ہے؟ اس نے اپنی حاجت زمین پر لکھ دی۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے اپنے والد بزرگوار کا یہ قول سنا ہے کہ ہر انسان کی قدر و قیمت وہی ہے کہ جو اس میں ہُنر موجود ہے اور میں نے اپنے جدِ بزرگوار کا ارشاد یہ سنا ہے کہ احسان بقدرِ معرفت ہونا چاہیے۔ اس لیے میں تم سے تین سوال دریافت کرتا ہوں۔ اگر تم نے ایک سوال کا جواب ٹھیک دیا تو تم کو میں ایک تہائی مال دے دوں گا۔ اگر دو جواب تم نے ٹھیک دیے تو دو تہائی مال دوں گا اور اگر تم نے تینوں سوالوں کا جواب درست دیا تو جو کچھ میرے پاس موجود ہے وہ سب میں تمھیں دے دوں گا۔ میرے پاس مالِ دنیا سے اس وقت یہ ایک تھیلی ہے، زرِ نقد کی جو عراق سے بھیجی گئی ہے۔ اس نے کہا۔ پوچھیے! اللہ میری مدد کرے گا۔ آپ نے فرمایا۔ بتاؤ کونسا عمل سب میں بہتر ہے؟ اس نے کہا اللہ پر ایمان لانا۔ پوچھا کہ اچھا بندہ کی نجات کا ذریعہ ہلاکت سے کیا ہے؟ اس نے کہا اللہ پر بھروسا رکھنا۔ حضرت نے فرمایا۔ انسان کی زینت کیا ہے؟ اس نے کہا علم جس کے ساتھ عقل موجود ہو۔ فرمایا، اگر یہ نہ ہو؟ اس نے کہا پھر مال ہو جس کے ساتھ سخاوت ہو۔ فرمایا اگر یہ بھی نہ ہو؟ اس نے کہا پھر فقیری ہو جس کے ساتھ صبر موجود ہو۔ حضرت نے فرمایا اور اگر یہ بھی نہ ہو تو؟ اس نے کہا، تو پھر ایک بجلی گرے اور اس شخص کو جلا کر خاکستر کر دے۔ حضرت ہنسنے لگے اور وہ پوری تھیلی اس کی جانب پھینک دی[1]

---

[1] تفسیر کبیر، ج صـ ۲۴۲ - غرائب القرآن ج ۱ صـ ۱۳۶

یہ طرزِ عمل غرباء اور مساکین کو معلومات مذہبی حاصل کرنے کا بہترین محرّک تھا اور اس ذریعہ سے عوام میں علوم و معارف کی اشاعت ہوتی تھی۔ یہ اس لیے تھا کہ آپ خود اپنے تمام صفاتِ جلیلہ کے ساتھ ساتھ عالم تھے۔ ایسے، جن سے لوگ مذہبی مسائل اور اہم مشکلات میں رجوع کرتے تھے۔ عرب کی مثل ہے "النّاس اعداء لما جھلوا" لوگ دشمن ہوتے ہیں اس چیز کے جس کو وہ نہ جانتے ہوں۔" رؤساء اور حکام جو خود علم و ہنر سے بے بہرہ ہُوا کرتے ہیں۔ اپنی اس کمزوری پر پردہ ڈالنے کے لیے عام افراد کی علمی سطح کو پست رکھنے کی فکر کرتے اور لوگوں کی نظر میں علم و ہنر کی قدر و قیمت گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اسلام کے حقیقی رہنما ہمیشہ مسلمانوں کی علمی سطح کے بلند کرنے میں منہمک رہے۔ حضرت علیؑ کی زندگی اسی میں گزری اور آپ کے فرزند اسی راستے پر قائم رہے۔

علاوہ ان خطب اور اشعار کے جو آپ کی زبانی منقول ہیں اور جو علمِ الٰہیات اور معارفِ حقہ کے خزانہ دار ہیں یا ان دعاؤں اور مناجاتوں کے جو آپ کی زبان سے نکلی ہیں اور جن میں سے بعض کا مجموعہ "صحیفۂ حسینیہ" کے نام سے اس وقت بھی موجود ہے اور خالق و مخلوق کے باہمی ربط کی بے نظیر آئینہ دار ہیں اگر جوامع حدیث کی سیر کی جائے تو ان میں مسائلِ فقہیہ کے بارے میں کثیر احادیث آپ سے منقول ملیں گے۔

اس وقت بھی جب آپ اہلِ حرم کو لے کر مکہ معظمہ سے برآمد ہوئے ہیں اور سفرِ غربت اختیار کیا ہے تو راستے میں فرزدق بن غالب شاعر سے ملاقات ہوئی اور اس نے کچھ مسائل آپ سے نذر اور مناسک حج کے متعلق دریافت کیے اور ان کا جواب حاصل کیا[1]

اسی کا نتیجہ ہے کہ کربلا میں آپ کے اصحاب کی فہرست پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عوام نہیں تھے بلکہ اس وقت کی اسلامی جماعت کی پوری روح اور علم و عمل کا مکمل خزانہ تھا جو حسینؑ پر نثار ہو رہا تھا۔ ان میں حافظانِ قرآن بھی تھے، عالمانِ کتاب بھی اور حاملانِ حدیث بھی۔ ان کے جذب اور کشش کا مرکز کوئی ہو ہی نہیں سکتا سوا ایسی ذات کے جو خود

---

[1] ارشاد صـ ۲۲۸

ان صفات میں بلند تر درجہ رکھتی ہو۔ بلکہ جو آپ کے خاندانی مخالف تھے وہ بھی آپ کی بلندئ مرتبہ اور برتریٔ صفات کے قائل تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ مسجدِ نبوی میں ایک مجمع تھا جس میں ابوسعید خدری اور عبداللہ بن عمرو بن العاص بھی موجود تھے۔ ادھر سے حضرت امام حسینؑ کا گزر ہوا اور آپ نے تعلیمِ اسلام کے مطابق مجمع کو سلام کیا۔ سب نے جوابِ سلام دیا۔ اس وقت عمرو بن العاص کے فرزند عبداللہ چپ رہے۔ جب سب جواب دیکر خاموش ہوگئے تو انھوں نے آواز بلند کی اور کہا وعلیک السّلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ پھر مجمع کی طرف مخاطب ہوکر کہا، کیا میں آپ لوگوں کو بتلاؤں کہ اہلِ زمین میں سب سے زیادہ محبوب شخص اہلِ آسمان کا کون ہے؟ سب نے کہا، ضرور بتلائیے۔ انھوں نے کہا 'وہ یہی راستے سے گزرنے والا ہے۔ انھوں نے مجھ سے جنگِ صفین کے بعد سے اب تک بات نہیں کی اور اگر یہ مجھ سے کسی طرح راضی ہوجائیں تو یہ میرے لیے سرخ رنگ کے اونٹوں سے زیادہ محبوب چیز ہوگی۔[1]

یہ عبداللہ خاندان بنوامیہ میں زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت میں مشہور تھے مگر جنگِ صفین میں اپنے باپ عمرو بن العاص کے ساتھ حضرت علیؑ سے جنگ کرنے کے لیے آگئے تھے۔ اس وقت سے حضرت امام حسینؑ نے ان سے بات کرنا چھوڑ دی تھی، مگر اس کے باوجود ان کے دل پر حضرت کے بلند اوصاف کا اس درجہ اثر قائم تھا۔

راست بازی میں داخل ہے۔ اخلاقی جرأت۔ حسینؑ میں اخلاقی جرأت ایسی تھی کہ بچپنے میں خلیفۂ دوم کو منبر پر ٹوک دیا اور فرمایا انزل عن مجلس ابی۔ "اُتر پڑو میرے باپ کی جگہ سے"۔ حضرت عمر نے کہا، سچ کہتے ہو صاحبزادے، تمہارے ہی باپ کا منبر ہے خدا کی قسم میرے باپ کا منبر نہیں۔

راست بازی اور راست کرداری کا کھلا ہوا نمونہ یہ تھا کہ آپ نے معرکۂ کربلا کے پہلے

---

[1] اسد الغابہ ج ۳ ص۲۳۵

مکہ سے روانگی کے بعد اپنی جماعت کی تعداد کو قائم رکھنے کے لیے کبھی آئندہ کے خطرات کو پوشیدہ نہیں کیا بلکہ برابر صورتِ حال سے مطلع کرتے رہے اور بار بار آئندہ کے خطرات کو یقینی بنا کر ساتھ والوں کی حفاظتِ جان و مال کے لیے الگ ہوجانے کا مشورہ دیا اور یہ طریقہ اس وقت تک جاری رکھا جب تک کہ کسی ایک شخص کے بھی غلط فہمی میں مبتلا ہونے کا امکان سمجھا جاسکتا تھا۔

آپ امن پسند بھی ایسے تھے کہ آخر وقت تک دشمن سے صلح کرنے کی خود اپنی طرف سے کوشش جاری رکھی مگر اس کے ساتھ عزم و استقلال اور ہمت ایسی رکھتے تھے کہ جان دے دی مگر جو راستہ پہلے دن صحیح سمجھ کر اختیار کرلیا تھا اس سے ذرہ بھر بھی نہ ہٹے۔

انھوں نے بحیثیت ایک فرزند کے باپ کی اطاعت کی اور چھوٹے بھائی ہوکر بھائی کی اطاعت کی اس طرح کہ ان کی وفادارانہ اطاعت میں کبھی کمزوری نظر نہ آئی اور پھر بحیثیت ایک سردار کے کربلا کے واقعہ میں ایک پوری جماعت کی قیادت کی۔ اس طرح کہ ان کے نظمِ قیادت کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ اس کے ساتھ آپ کی نگاہ نے مردم شناسی کا وہ حیرت انگیز نمونہ پیش کیا کہ اتنے سخت اور دشوار گزار راستے کے لیے جن ساتھیوں کو منتخب کرکے اپنے ساتھ لے لیا تھا ان میں سے ایک نے بھی وفاداری اور جاں نثاری میں کمی نہ کی اور سب یکجان و یک دل ہوکر مقصدِ حق کے لیے کوشاں رہے یہاں تک کہ جانیں قربان کردیں۔

امام حسینؑ کے مقولات

بلند مرتبہ افراد میں بھی بیشتر وہی افراد ہوتے ہیں جن کے اقوال کو ان کے اعمال پر نمایاں فوقیت حاصل ہوتی ہے مگر حسینؑ کا کردار بذاتِ خود اتنا بلند تھا کہ اس نے دنیا کی زبان اور اس کے قلم کی تمام تر توجہ کو اپنے لیے مخصوص کرلیا لہٰذا آپ کے مقولات کو یکجا کرنے کی زیادہ کوشش نہیں کی گئی۔ پھر بھی آپ کے مقولات متفرق طور سے مختلف کتابوں میں کچھ نہ کچھ مل ہی جاتے ہیں اور وہ بڑی حد تک آپ کی زندگی کے مختلف رخوں کی ترجمانی کرتے

نظر آتے ہیں۔ ان میں نظم بھی ہیں اور نثر بھی۔

چنانچہ آپ نے فرمایا ہے کہ:۔

۱۔ من جاد ساد ومن بخل ذل۔ "جس نے دیا لیا اس نے سرداری پائی اور جس نے کنجوسی کی اس نے ذلت اٹھائی۔"

۲۔ اجود الناس من اعطیٰ من لا یرجوہ۔ "سخی وہی ہے جس نے اس کو بھی دیا جو اس سے کوئی توقع وابستہ نہ رکھ سکتا ہو۔"

۳۔ من انعم اللہ منکم فلیتعم علے غیرہ۔ "جس کو خدا نے دیا ہے وہ اوروں کو بھی دے۔"

۴۔ حوائج الناس الیکم من نعم اللہ علیکم۔ "اہلِ حاجت کا تمھارے پاس آنا بھی تم پر خدا کی نعمتوں میں سے ہے۔"

۵۔ اغن عن المخلوق بالخالق   تغن عن الکاذب والصادق
واسترزق الرحمٰن من فضلہ   فلیس غیر اللہ من رازق
من ظن ان الناس یغنونہ   فلیس بالرحمٰن بالواثق
او ظن ان الناس یکنونہ   ذلت بہ النعلان من حالق

"خدا سے لو لگا کر مخلوق سے بے نیاز ہو جاؤ تو پھر کسی جھوٹے سچے کی تمھیں پروا نہ رہے گی۔ مانگنا ہو تو خدا ہی سے مانگو۔ غیر خدا روٹی دینے والا نہیں ہے۔ جس کا خیال ہو کہ لوگ اس کو غنی کر دیں گے اس کو خدا پر اعتماد نہیں اور جو یہ سمجھتا ہو کہ لوگ اس کے لیے کافی ہیں وہ یقیناً بڑی پستی میں گرنے والا ہے۔"

۶۔ کلما زید صاحب المال مالا   زید فی ھمہ وفی الاشغال

"اِدھر تو مال والوں کے مال بڑھتے ہیں اور اُدھر ان کے افکار و اشغال میں اضافہ ہوتا ہے۔"

۷۔ من وصل الی اللہ انقطع عن غیرہ۔ "جو خدا سے متصل ہوا اس کے غیر سے جدا ہو گیا۔"

ابن کثیر نے "بدایۃ النہایۃ" میں اسحٰق بن ابراہیم کی روایت سے نقل کیا ہے کہ امام حسینؑ نے جنۃ البقیع میں قبورِ شہداء کی زیارت کی اور حسب ذیل اشعار پڑھے:۔

نادیت سکان القبور فاسکتوا   فاجابنی من صمتھم ترب الحشا
قالت اتدری ما صنعت بساکنی   مزقت لحمھم وخرقت الکسا
وحشوت اعینھم ترابا بعد ما   کانت تأذی بالیسیر من القذا
اما العظام فاننی مزقتھا   حتی تباینت المفاصل والشویٰ
قطعت ذا من ذا ومن ھذا کذا   فترکتھا مما یطول بھا البلیٰ

"میں نے قبروں کے رہنے والوں کو آواز دی تو وہ خاموش رہے مگر مجھے جواب دیا ان کی خاموشی پر خاکِ مرقد نے، کہ کیا تمھیں معلوم ہے کہ میں نے اپنے رہنے والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟ میں نے ان کے گوشت کو ٹکڑے ٹکڑے اور کھال کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور ان کی آنکھوں کے اندر مٹی بھر دی ہے حالانکہ اس کے پہلے ذرا سا تنکا پڑ جاتا تھا ان کی آنکھ میں تو چین نہ آتا تھا۔ رہ گئیں ہڈیاں، وہ بھی جدا جدا ہو گئیں۔ یہاں تک کہ جوڑ بند صاف ظاہر ہیں۔ میں نے اِس کو اُس سے اور اُس کو اِس سے الگ کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ بوسیدگی و کہنگی کے آثار ان سے ہویدا ہو گئے ہیں۔"

ذھب الذین احبھم   وبقیت فیمن لا احبہ
فیمن اراہ یسبنی   ظھر المغیب ولا اسبہ
یبغی فسادی ما استطاع   وامرہ مما اربہ
حنقا یدب الی الضرا   ء وذاک مما لا ادبہ

ويرىٰ ذباب الشرّ من — حولي يطن ولا يذبه

واذا خبا وغر الصدر — فلا يزال به يشبّه

فلا يعيج بعقله — افلا يثوب اليه لبّه

افلا يرىٰ ان فعله — مما يسور اليه غبّه

حسبي بربّي كافيا — ما اختشي والبغي حبّه

ولقد من يبغي عليه — فما كفاه الله ربّه

"گزر گئے وہ افراد جن کو میں محبوب رکھتا تھا۔ اور اب میں رہ گیا ہوں ایسے لوگوں میں جو مجھے کسی طرح پسند نہیں۔ ان کا کردار یہ ہے کہ میں انھیں ذرا بھی بُرا بھلا نہیں کہتا۔ مگر وہ پیٹھ پیچھے مجھے گالیاں دیتے رہتے ہیں اور جہاں تک ممکن ہوتا ہے وہ میرے نقصان کے درپے رہتے ہیں درانحالیکہ میں ان کو فائدہ پہنچاتا رہتا ہوں۔ وہ گرد و پیش شرارتوں کے مگس اڑتے دیکھتے ہیں مگر اتنا نہیں کرتے کہ انھیں ہٹا دیں بلکہ جب دلوں میں عداوت کی آگ بجھنے لگی ہے تو وہ اسے اور ہوا دے دیتے ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنی سمجھ سے کام لیں؟ کیا ایسا نہ ہوگا کہ ان کی طرف عقل واپس آئے؟ کیا وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ان کا یہ طرزِ عمل نتیجۃً خود اُنہی کے لیے تباہ کن ثابت ہوگا۔ میرے لیے میرا پروردگار کافی ہے جس کے ہوتے ہوئے مجھ کو کوئی اندیشہ نہیں۔ ناممکن ہے کہ کسی پر ظلم و ستم کیا جائے اور خدا اس کی مدد نہ کرے۔"

ابنِ صباغ مالکی نے "فصول مہمہ" میں علی بن عیسیٰ اربلی نے "کشف الغمہ" میں ابن خشاب کی روایت سے حسب ذیل اشعار نقل کیے ہیں:-

اذا ما عضّك الدهر — فلا تجنح الى خلق

ولا تسأل سوى الله — تعالى قاسم الرزق

فلو عشت وطوّفت — من الغرب الى المشرق

لما صادفت من يقدر — ان يسعد او يشقى

"جب زمانہ کے دانت تمھیں زخمی کریں تو خلقِ خدا کی طرف کبھی نہ جھکو اور سوا خدائے برتر کے جو رزق کا تقسیم کرنے والا ہے، کسی سے سوال نہ کرو اس لیے کہ مغرب سے مشرق تک چکر لگانے کے بعد بھی تم کو کوئی شخص ایسا نہ ملے گا جو مقدر کو بنا یا بگاڑ سکتا ہو۔"

وان تكن الدنيا تعد نفيسة — فدار ثواب الله اعلىٰ وانبل

وان تكن الابدان للموت انشأت — فقتل امرئ بالسيف في الله افضل

وان تكن الارزاق قسما مقدّرا — فقلة حرص المرء في الرزق اجمل

وان تكن الاموال للترك جمعها — فما بال متروك به المرء يبخل

"اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ دنیا کوئی اچھی جگہ ہے تب بھی خدا کے اجر و ثواب کا محل زیادہ بلند و برتر ہے اور جب کہ یہ صحیح ہے کہ اجسام پر موت کا طاری ہونا لازم ہے تو انسان کا راہِ خدا میں تہ تیغ کر دیا جانا زیادہ بہتر ہے۔ اور جب کہ یہ حقیقت ہے کہ رزق میں ہر ایک کا حصہ معین ہے تو اس کے بارے میں ہوس سے کام نہ لینا ہی انسان کے لیے مناسب ہے۔ اور جب کہ یہ یقینی ہے کہ اموال جمع ہوتے ہیں بعد میں چھوڑ جانے کے لیے تو کیا یہ حماقت نہ ہوگی کہ ایسی چیز کے بارے میں انسان بخل سے کام لے۔"

ایک شخص نے حضرت کو لکھا کہ مجھے دو جملوں میں موعظہ فرمائیے۔ آپ نے تحریر فرمایا۔ "من حاول امراً بمعصية الله كان افوت لما يرجو واسرع لمجيئ يحذر" "جو شخص اللہ کی نافرمانی کر کے کسی مقصد کو حاصل کرنا چاہے گا اپنے توقعات میں ناکام اور خطرات سے زیادہ نزدیک ثابت ہوگا۔"

مندرجہ بالا مقالات اور اشعار کو نظرِ غائر سے دیکھنے پر حسب ذیل تعلیمات ان میں نمایاں طور پہ موجود پائے جاتے ہیں :-

ذاتِ الٰہی پر توکل - یعنی ہم کو کسی نفع کی امید، کسی ضرر سے تحفظ کی توقع اور کسی خواہش کی تکمیل کا آسرا اللہ کے غیر سے نہ رکھنا چاہیے - یہ وہ دشوار منزل ہے کہ کہنے کو جو بھی چاہے کہہ دے لیکن حقیقتاً عملی حیثیت سے اس راہ میں جو بھی قدم رکھے وہ ماسوی اللہ سے بے نیاز ہو جائے -

انسان سچائی کے راستے سے الگ ہوتا ہے - زیادہ تر طمع مال و زر کی بدولت یا پھر خطرۂ امروز اور اندیشۂ فردا کے سبب سے مگر جب یہ خیال پورے طور پر کسی کے دل و دماغ پر چھا جائے کہ خدا کی مشیت کے خلاف نہ کوئی نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان، تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے راہِ حق سے منحرف نہیں کر سکتی -

ملحوظ رہے کہ اللہ اپنے ماننے والوں کے صحیح عقیدہ کے مطابق وہ پاک و منزّہ ذات ہے جو صرف نیکی کو پسند کرتی ہے اور برائی سے نفرت رکھتی ہے - لہٰذا جب کوئی ایک ایسی بزرگ و برتر ذات کو اپنے تفکرات و احساسات کا مرکز بنا لے گا تو اس کے لیے ناممکن ہے کہ بھول کر بھی وہ برائی یا ظلم کے قریب جائے - چنانچہ امام حسینؑ کی جگہ اگر کوئی ایسا شخص ہوتا جو دنیوی نفع اور نقصان کی پروا کرتا یا کسی مادی طاقت کو قبلۂ حاجات سمجھتا یا اس کے اقتدار سے مرعوب کیا جا سکتا تو بالفرض وہ یزید کی بیعت شروع میں نہ بھی کرتا تو اس وقت تو ضرور کر لیتا کہ جب حکومتِ باطل کا ہزاروں کا لشکر اس کے خلاف صف بستہ ہوتا اور ان کے ظلم و تشدد کی بجلیاں آنکھوں کے سامنے کوندنے لگتیں مگر حضرت امام حسینؑ، آپ تو دنیا کی کسی طاقت اور نعمت کو کچھ سمجھتے ہی نہ تھے اس لیے راہِ حق سے آپ کو کوئی شے ہٹا ہی نہیں سکتی تھی -

۲ - خلقِ خدا کی بہر حال بہی خواہی اور فائدہ رسانی کی فکر ہونا جس کا بلند معیار یہ ہو کہ

اس بارے میں اپنے اور پرائے، دوست اور دشمن کی تفریق کو بھی کام میں نہ لایا جائے -

یہ بات اس صورت میں پیدا ہی نہیں ہو سکتی کہ جب ہمارے تعلقات دوسروں کے ساتھ مادی بنیادوں پر قائم ہوں اس لیے کہ ایسی صورت میں طبعی میلانات و رجحانات کی بنا پر نزدیک و دور اور موافق و مخالف کے امتیازات کا بروئے کار آنا لازمی ہے - البتہ یہ بات اس وقت ہو سکتی ہے کہ جب ہمارا تعلق دوسروں کے ساتھ اس مشترک رشتہ کی بنا پر ہو جو ہم سب کو ایک خالق کے ساتھ وابستہ کر دیتا ہے اور جس کے لحاظ سے تمام افرادِ انسانی ایک سلسلۂ وحدت میں منسلک ہو جاتے ہیں - اس صورت میں ہم اس قابل ہو سکیں گے کہ صحیح معنی میں غرضِ خلقت کو سمجھتے ہوئے عمومی طور پر تمام خلق کو اپنی ذات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کی کوشش کریں اور اس کو اپنے اوپر خدا کا ایک احسان سمجھیں کہ اس نے ہمارے ذریعہ سے دوسروں کو فائدہ پہنچایا - اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایسے لوگوں پر بھی احسان کیا جائے گا جو عام عادات و خصائل کی بنا پر اس سے توقع نہ رکھتے ہوں - مثلاً ایک دشمن اپنے دشمن سے کب اس کی امید کر سکتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک کرے گا مگر بلند معیارِ فیاضی کا یہی ہے کہ اس کو بھی اپنے انعام سے محروم نہ کیا جائے -

۳ - مادی زندگی کے تاریک پہلوؤں پر توجہ، ان کا لحاظ رکھنے سے تمام لذائذ دنیا ہماری نظر میں ہیچ ہو جائیں گے اور ہم اللہ کے ساتھ وابستگی پیدا کر کے نیکی کے راستے پہ قائم رہنے ہی کو اپنی بہترین کامیابی سمجھنے لگیں گے -

مجموعی حیثیت سے مذکورہ بالا تمام تعلیمات میں وزن پیدا ہوا ہے حسینؑ کے عمل اور عملی کردار سے جس نے ان میں سے ہر ہر مقولہ اور تعلیم کو چلتی پھرتی تصویر کی شکل میں آنکھوں کے سامنے پیش کر دیا - اس طرح کہ یہ مقولات صرف آپ کے خیالات ہی کے حامل نہیں رہے بلکہ سچے عملی انسان کی تاریخِ زندگی بن گئے -

امام حسینؑ کے اس طرح کے اقوال آپ کی زندگی کے کسی ہنگامی یا اتفاقی موقع سے

متعلق نہ تھے بلکہ آپ کے روزمرّہ کے نظام زندگی کا ایک جزو تھے چنانچہ روزانہ کی نمازوں میں جومختلف قنوت آپ پڑھا کرتے تھے وہ بھی اسی طرح کے مضامین پرمشتمل ہوتے تھے۔ ان میں سے ایک قنوت کے الفاظ درج ذیل ہیں:-

اللّٰھم منك البدء ولك المشيئة ولك الحول ولك القوة - اللّٰھم وانّی مع ذلك کلما عائذ بك لائذ بحولك وقوتك راض بحکمك الذی سبق الیّ فی علمك جار بحیث اجریتنی قاصد ما اممتنی غیر ضنین بنفسی فیما یرضیك عنّی اذبه قد رضیتنی ولا قاصر بجهدی عما الیه ندبتنی مسارع لما عرفتنی شارع فیما اشرعتنی مستبصر فیما بصرتنی مراع ما ارعیتنی فلا تخلنی من رعایتك ولا تخرجنی من عنایتك لاتقعدنی عن حولك ولا تخرجنی عن مقصد انال به ارادتك واجعل علی البصیرة مدرجتی وعلی الهدایة محجتی وعلی الرشاد مسلکی حتی تنیلنی امنیّتی وتحلّ بی علیٰ ما به اردتنی ولہ خلقتنی والیه أدیت بی -

"خداوندا تیری ہی طرف سے انعام و احسان کی ابتداء ہے اور جو کچھ مشیّت اور طاقت و قوت ہے وہ صرف تیری ہے۔ اس سب کے ہوتے ہوئے میں تیری ہی طرف پناہ لیتا ہوں اور تیری ہی قوت و طاقت کا سہارا ڈھونڈتا ہوں اور تیرے اس فیصلہ پر راضی ہوں جو میرے بارے میں تو پہلے ہی کر چکا ہے۔ میں چلنے والا ہوں اسی راستے پر جس پر کہ مجھے تو نے چلایا ہے اور قصد رکھتا ہوں وہی جو تیری مرضی کے مطابق ہو اور ان امور کے متعلق جو تیری رضامندی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ اپنے نفس کی ذرا بھی رعایت نہیں کرتا۔ نہ میں اپنی طرف سے تیرے

احکام کی تعمیل میں جد و جہد کے سلسلہ میں کوئی کوتاہی ہونے دیتا ہوں، بلکہ تیزی سے چلتا ہوں اسی راستے پر جس کی تو نے مجھے ہدایت کی، اور عہدہ برآ ہوتا ہوں میں ان فرائض سے جن کا تو نے مجھے محافظ قرار دیا ہے۔ اب تو بھی مجھے اپنی حمایت میں رکھ اور اپنی نظر رحمت سے مجھے علیحٰدہ نہ کر اور اپنی طاقت کی امداد سے مجھے محروم نہ کر اور اس مقصد سے الگ نہ کر جس کے ماتحت میں تیری مشیئت کو پورا کرنا چاہتا ہوں اور بصیرت پر قرار دے میری رفتار کو اور ہدایت پر میرے مسلک کو اور صحیح منزل کی سمت میرے راستے کو، یہاں تک کہ مجھے پہنچا تو میری آرزو تک، اور مجھے اتار تو اسی منزل پر جس کا تو نے میرے لیے ارادہ کیا اور جس کے لیے تو نے مجھے پیدا کیا اور جس کی طرف تو نے مجھے متوجہ کیا۔"[1]

کیا اس قنوت کے الفاظ ظاہر لبظاہر آپ کے کسی عزم مستقل کی ترجمانی نہیں کرتے؟ کیا ان سے مجمل طور پر یہ واضح نہیں ہوتا کہ آپ بس کسی خاص مقصد کی خاطر اپنی زندگی کو وقف کیے ہوئے تھے اور یہ کہ آپ کی زندگی کا ہر لمحہ خالق کے اشاروں کا تابع تھا۔

سنہ ٦٠ھ تک یہ الفاظ قول تھے اور سنہ ٦١ھ ہجری میں وہ عمل بن کر آنکھوں کے سامنے آ گئے۔

یہ دعا بھی حضرت امام حسینؑ کی ہے جو آپ قنوت میں پڑھتے تھے:-

اَللّٰھم من اٰوٰی الیٰ مأوی فانت مأوای ومن لجأ الیٰ ملجأ فانت ملجای واحرسنی فی بلوای من افتتان الامتحان ولمّة الشّیطان لعظمتك التی لایشوبھا ولع نفس بتفتین ولا وارد طیف تبظنین ولا یلمّ بها فرح حتّیٰ تقلبنی الیك بارادتك غیر ظنین ولا مظنون ولا مراب ولا مرتاب۔

خداوندا تیرے سوا کسی کی طرف اگر کوئی پناہ لیتا ہے تو لیا کرے۔ میرا پناہ دینے والا

[1] مہج الدعوات ص ٧١

تو مرت تو ہے۔ تو اپنی اس عظمت کے ساتھ جس پر نہ کسی کی نفسانی خواہش اثر انداز ہوسکتی ہے اور نہ بدظنی اور نہ اس میں کسی طرح کی بدگمانی اور کسی وقتی خوش مزاجی کا دخل ہے آزمائش کے موقع پر مجھے محفوظ رکھ فتنہ میں مبتلا ہونے اور شیطانی جماعت سے مرعوب ہوجانے سے۔ یہاں تک کہ تیری طرف میری بازگشت ہو۔ تیرے منشا، کے مطابق۔ اس طرح کہ نہ میرے دل میں بُرے خیالات ہوں اور نہ دوسرے میری نسبت بُرے خیالات قائم کر سکیں۔ نہ دوسروں کے متعلق میں کسی شک میں مبتلا ہوں اور نہ میرے متعلق دوسروں کو شک ہوسکے۔" ؎۱

آپ صبح و شام دونوں وقت حسب ذیل دعا پڑھا کرتے تھے۔

اللّٰهم انّی اسلمت نفسی الیك و وجهت وجهی الیك وفوّضت امری الیك اللّٰهم انك تكفینی من كل احد ولا یكفینی منك احد۔

"خداوندا میں تیرے سپرد کیے ہوئے ہوں اپنے نفس کو اور تیری طرف موڑے ہوئے ہوں اپنے رخ کو اور دیے ہوئے ہوں اپنے کو تیرے ہاتھ میں۔ خداوندا تو ہر دوسرے شخص کے شر سے محفوظ رکھ سکتا ہے مجھ کو لیکن تیرا غیر مجھ کو تیرے قہر سے نہیں بچا سکتا۔" ؎۲

بھلا جس شخص کا مستقل عقیدہ یہ ہو اور جس کی زندگی کا نصب العین یہ ہو جس نے دن اسی کو سوچا ہو اور اسی کو اپنی زبان سے دُہراتا جارہا ہو وہ کہیں ممکن ہے کہ کسی طاغوتی طاقت سے دب جائے اور خدائے قادر و توانا کو بھول کر دُنیوی جبروت کے سامنے سرِ تسلیم خم کردے۔ یزید، حسینؑ سے اسی کا تو طالب تھا کہ "آپ خدا کے راستے سے ہٹ کر شیطان کے راستے پر ساتھ ہوجائیں"۔ مگر حسینؑ نے جو اپنے جان و روح کو کلیتہً خدا کے حوالے کرچکے تھے اس کو ٹھکرا دیا۔

؎۱ نہج الدعوات ص۳۰ ؎۲ نہج الدعوات ص۲۴۱

اس لیے کہ آپ کو یقین کامل تھا کہ یزید میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ جب تلواریں آپ کے جسم اطہر کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہی تھیں اس وقت بھی آپ اپنے اسی یقین پر قائم تھے۔ چنانچہ جب معرکۂ کربلا کے نتائج دنیا کی آنکھوں کے سامنے آگئے تو عالم ظاہر میں سب کو اس کا مشاہدہ ہوگیا کہ حسینؑ کا خیال حرف بحرف صحیح تھا۔ اس لیے کہ کہنے کو خون بہا حسینؑ اور انصارِ حسینؑ کی گردنوں سے، مگر دراصل شہرگ قطع ہوئی یزید کے اقتدار کی۔ حسینؑ زندۂ جاوید ہوگئے اور یزید صحیح معنیٰ میں ہلاک و فنا ہوا، جو نتیجہ تھا محض حسینؑ کی اس قوتِ ارادی کا جس کا مظاہرہ آپ کے اقوال برابر کرتے رہتے تھے۔

لذتِ حیاتِ دنیا سے سرشار تنگ ظرفوں کے نزدیک اپنے مخالف کو دھمکانے کا سب سے بڑا ذریعہ موت کا تصور پیدا کردینا ہے مگر وہ افراد جو راہِ حق میں موت آنے کو مآلِ زندگی سمجھتے ہوں اس دھمکانے سے کب متاثر ہوسکتے ہیں؟

حسینؑ کا فلسفۂ زندگی وہی تھا جس کی امام حسینؑ کو آپ کے والدِ بزرگوار حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کی طرف سے مخصوص وصیت ہوئی تھی کہ اصبر علی الحق وان کان مرّاً "سچائی کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو اس پر قائم رہو اور ہر مشکل کا مقابلہ کرو۔" یہی وصیت حسینؑ نے اپنے فرزند زین العابدینؑ کو کی اور اسی پر وہ خود مکمل طور سے کاربند رہے۔ ؎۱

؎۱ کافی جلد۱ ص۱۲۴

چودھواں باب

یزید کا بیعت پر اصرار اور حسینؑ کا انکار

تختِ خلافت پر بیٹھنے کے بعد یزید کے لیے عیش و آرام کی کمی نہ تھی۔ دنیا تمام زیب و زینت کے ساتھ اس کے سامنے موجود تھی اور تاج و تخت، مال و دولت، حشم و خدم اور عیش پرستی و شہوت رانی کے تمام اسباب پوری فراوانی کے ساتھ مہیا تھے۔ لیکن ایک خیال تھا جو اس کے دل و دماغ کو پریشان کیے ہوئے تھا اور اس کی نظروں میں اس تمام جاہ و حشم کو خاک سیاہ بنائے ہوئے تھا۔ وہ ان چند آدمیوں کا بیعت سے انکار تھا کہ جن میں اوّل درجہ کی شخصیت حسینؑ بن علیؑ کی تھی۔ یزید کے نفسیات اس کے کسی طرح متحمل ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ جوانی کا نشہ اور پھر شراب کی ترنگ، بے محنت و مشقت کے حاصل شدہ سلطنت کا غرور۔ اپنے باپ کی کوششوں کی کامیابی کا گھمنڈ اور تمام عرب کے سرِ اطاعت خم ہو جانے کا غرّہ۔ ناآزمودہ کاری، ناعاقبت اندیشی، سیاسیاتِ حکومت سے ناشناسی اور نظمِ سلطنت سے بےخبری۔ اس کے بعد مرنے والے باپ کا مرتے مرتے اسی بات کی تاکید کرنا اور نفس کے آخری آمد و شد تک اسی فکر و اضطراب کی کشمکش میں مبتلا رہنا۔ یہ وہ باتیں تھیں کہ جن کی وجہ سے یزید کو یہ کد ہو گئی تھی کہ ان انگلیوں پر گنے جانے والے اشخاص سے جلد از جلد بیعت حاصل کر لی جائے۔ کوئی شک نہیں کہ ان سب کی اور بالخصوص امام حسینؑ کی بیعت سے علیحدگی اور خاموشی معاویہ کو بھی اتنی ہی شاق تھی جتنی یزید کو مگر معاویہ کو تشدد کے نتیجہ کا احساس تھا اور یزید کو نہ تھا۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر معاویہ کی زندگی اور طولانی بھی ہوتی تو ان کی طرف سے ایسا فوری طرزِ عمل نہ اختیار کیا جاتا جیسا یزید کی طرف سے اختیار کیا گیا مگر واقعات یہ کہنے پر مجبور کرتے

معاویہ کا رویہ یزید کے آئندہ اقدامات میں ہمت افزائی کا باعث ضرور ہوا۔ مثال کے طور پر معاویہ کا مدینہ پہنچنے کے وقت حضرت امام حسینؑ کو ان الفاظ سے مخاطب کرنا کہ "تم ایک قربانی کا دنبہ ہو جس کا خون جوش کھا رہا ہے۔ قسم ہے خدا کی یہ خون ضرور گرایا جائے گا۔"

یزید اپنی ذہنیت کے مطابق اس سے یہی نتیجہ نکال سکتا تھا کہ میرے باپ کا ارادہ اس دشمنِ سلطنت کے ساتھ اس طرح کا تھا جسے انھوں نے قسم کھا کر ظاہر کیا تھا۔ اور انھیں اس کی تکمیل کا موقع نہیں ملا۔ پھر "اگر پدر نتواند پسر تمام کند" خصوصاً جبکہ آخر وقت تک معاویہ اپنے بعد ہونے والے خلیفہ کو ان ہی چند منکرینِ بیعت کے خطرہ کی طرف بار بار متوجہ بھی کرتے رہے۔ یقینی گزشتہ دھمکی سے جو خیال یزید کے دماغ میں پیدا ہو چکا تھا اس کے ساتھ یہ آخری وقت کی وصیتیں یہی اثر پیدا کر سکتی تھیں کہ یزید اپنا سب سے پہلا نصب العین اور مقصدِ زندگی اپنے باپ کے بعد اسی کو قرار دے لے کہ خطرہ کو کسی طرح دور کیا جائے اور باپ کا جو مقصد تھا اور جس کی تکمیل کا انھیں موقع نہ مل سکا اب اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے۔ چنانچہ یزید نے تختِ سلطنت پر قدم رکھتے ہی سب سے پہلا جو سیاسی کام کیا وہ یہی کہ اپنے چچا زاد بھائی ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کو جو مروان کی معزولی[1] کے بعد اس زمانہ میں مدینہ کا حاکم تھا خط لکھا کہ خلیفۂ وقت یزید کی طرف سے ولید بن عتبہ کو معلوم ہو کہ معاویہ ایک خدا کے بندے تھے جنھیں اس نے عزت دی اور سلطنت عطا کی اور اپنی نعمتوں سے مالا مال کیا۔ وہ جب تک مقدر میں تھا زندہ رہے اور جب عمر پوری ہو گئی تو دنیا سے رخصت ہو گئے۔ خدا ان پر رحمت نازل کرے کہ انھوں نے قابلِ تعریف زندگی گزاری اور پرہیزگاری و نیکوکاری کے ساتھ

---

[1] مروان ایک مرتبہ معاویہ کی طرف سے مدینہ کا حاکم آٹھ برس دو مہینہ تک رہا اور پھر ربیع الاول ۴۹ھ میں معزول کیا گیا اور سعید بن عاص کو حاکم مدینہ مقرر کیا گیا (طبری ج ۶ ص ۱۳۵) دوبارہ ۵۴ھ میں سعید کی معزولی کے بعد مروان کو حاکم مدینہ مقرر کیا گیا (طبری ج ۶ ص ۱۶۲) پھر ۵۷ھ یا ایک قول کے مطابق ۵۸ھ میں اسے معزول کیا گیا اور ولید بن عتبہ کو حاکم مدینہ بنایا گیا (طبری ج ۶ ص ۱۷۲)

عالمِ آخرت کو سدھارے۔ والسلام۔

اس خط میں تو صرف معاویہ کے وفات کی اطلاع ہے۔ ایسے رسمی الفاظ میں جو عموماً خبرِ وفات کے طور پر لکھے جایا کرتے تھے مگر اس کے ساتھ ہی ایک اور چھوٹا سا پرچہ بھی ولید کو بھیجا گیا۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ حسینؑ اور عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر کو بیعت پر سختی سے مجبور کرو اور بغیر بیعت لیے ہوئے انھیں ذرا سا بھی موقع نہ دو۔ والسلام [1]

یہ خط ہے کہ جس میں شروع ہی سے سخت گیری کا عنصر نمایاں ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اب صورتِ حال خاموشی کے حدود پہ باقی نہیں رہ سکتی۔ یعنی حضرت امام حسینؑ کا یہ لائحہ عمل کہ ہم شریکِ ظلم نہ ہوں اور یزید کی خلافت کو تسلیم کر کے اس کے افعال و اعمال کی ذمہ داری اپنے اوپر نہ لیں لیکن اس کے ساتھ ہم اپنی طرف سے کوئی ایسا اقدام بھی نہ کریں کہ ملک کے امن و امان کو صدمہ پہنچے اور شورش و ہنگامہ برپا ہو۔ یہ منفی طرزِ عمل نبھنا ناممکن ہے۔ اب تو عمل کی منزل ہے۔ یا تو مختتم اقرار یا مختتم انکار۔ مگر انکار ایسا جس میں نتائج کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔

یزید کا خط ولید کو پہنچا۔ ولید ابوسفیان کا پوتا اور معاویہ کا بھتیجا سہی لیکن وہ ایک حد تک امام حسینؑ کی عظمت و شخصیت سے متاثر تھا۔ اس میں بظاہر اتنی سفاکی اور ستم کیشی بھی نہ تھی کہ ایک بے گناہ کا خون بہاتے ہوئے اس کو لذت محسوس ہو۔ یزید کے فرمان شاہی نے اس کے باطنی جذبات میں ایک تلاطم پیدا کر دیا اور وہ اس کشمکش و پیچ میں پڑ گیا کہ یزید کے اس حکم کو کس طرح انجام دیا جائے۔ لہٰذا اس نے مروان بن الحکم سے جو اس وقت مدینہ میں موجود تھا مشورہ کیا۔ حالانکہ اس سے پہلے ولید کے مدینہ کی حکومت پہ آنے کے وقت سے اس میں اور مروان میں اس حد تک کشیدگی ہو گئی تھی کہ مروان نے ولید کے یہاں کی آمد و رفت ترک کر دی مگر اس وقت ولید کو ضرورت یہی معلوم ہوئی کہ مروان کو مشورہ میں ضرور شریک کرے شاید اسی لیے کہ کہیں جو طرزِ عمل وہ اختیار کرنا چاہتا ہے اموی سیاست کے خلاف نہ ہو

[1] طبری ج ۶ ص ۱۸۹

اور مروان اس کے خلاف جاسوسی یا چغلخوری کا کام انجام نہ دے۔ مروان نے عہدِ رسول اللہؐ کے زمانہ ہی میں ایسی شرارتیں کر چکا تھا کہ رسول اللہؐ نے اس کو اور اس کے باپ کو مدینہ سے باہر نکال دیا تھا، کہا کہ عبداللہ بن عمر اور عبدالرحمٰن بن ابی بکر کی تم فکر نہ کرو۔ وہ تو طالبِ خلافت ہوں گے نہیں۔ ہاں حسینؑ بن علیؑ اور عبداللہ بن زبیر کو پابند بنانا ضروری ہے۔ لہٰذا تم ابھی ان لوگوں کو بلوا بھیجو اور وفاتِ معاویہ کی خبر پھیلنے کے قبل ہی ان سے بیعتِ یزید کا مطالبہ کرو اور اگر وہ بیعت نہ کریں تو قتل کر دو۔ اس لیے اگر انھیں معاویہ کے انتقال کی خبر ہو گئی پھر ایک ایک طرف کھڑا ہو جائے گا اور علانیہ مخالفت کرنا اور خود اپنی طرف لوگوں کو دعوت دینا شروع کر دے گا۔[1]

ولید محسوس کرتا تھا کہ اس پورے مشورہ پر وہ عمل نہیں کر سکتا تاہم اس نے اسی وقت عبداللہ بن عمر بن عثمان کو جو ایک کمسن لڑکا تھا حضرت امام حسینؑ اور عبداللہ بن زبیر کو بلانے کے لیے بھیجا۔ یہ دونوں آدمی اس وقت مسجد نبوی میں بیٹھے ہوئے تھے اور بوقت واحد دونوں کو یہ پیغام پہنچا کہ امیر نے آپ کو بلایا ہے۔ یہ وقت ایسا تھا کہ اس وقت ولید کبھی باہر نہ بیٹھتا تھا۔ اور لوگوں کی ملاقات نہ ہوتی تھی۔ ان حضرات نے کہا کہ تم چلو ہم آتے ہیں۔ آدمی واپس گیا۔ عبداللہ بن زبیر نے کہا کہ یہ ولید کے بیٹھنے کا وقت نہیں ہے، اس وقت بلانے کا کیا سبب ہو سکتا ہے؟ کچھ آپ کے خیال میں آتا ہے یہ کیا بات ہے؟ امام حسینؑ نے فرمایا۔ میرا خیال ہے کہ ان کا ظلم کا دیوتا دنیا سے اُٹھ گیا ہے اور ہمیں اس وقت صرف بیعت کے لیے بلایا گیا ہے کہ لوگوں میں ابھی خبر پھوٹنے نہ پائے اور ہم لوگ پابند کر لیے جائیں۔ عبداللہ بن زبیر نے کہا خیال تو میرا بھی یہی ہے۔ پھر اب کیا کرنا چاہیے؟ امام نے فرمایا۔ میں تو ابھی اپنے خاندان کے جوانمردوں کو جمع کرتا ہوں اور ان سب کے ساتھ وہاں جاتا ہوں۔ ان لوگوں کو دروازہ پہ کھڑا کر دوں گا اور میں اندر جاؤں گا۔ عبداللہ بن زبیر نے کہا مجھے اس میں آپ کی جان کا اندیشہ ہے۔ کہیں

[1] الاخبار الطوال ص ۲۲۹

آپ قتل نہ کر دیے جائیں۔ آپ نے فرمایا۔ میں جاؤں گا تو کچھ سمجھ کے جاؤں گا۔ اتنا سامان کروں گا کہ مجھے خطرہ نہ باقی رہے۔

امام حسینؑ اپنے مکان پر تشریف لے گئے اور اعزاء اور مخصوصین کو جمع کرکے ان کے ساتھ ولید کے دروازہ پر پہنچے۔ اصحاب سے فرمایا کہ تم دروازے پر ٹھہرو اور میں اندر جاتا ہوں۔ اگر میں تمھیں بلاؤں یا تم سنو کہ ولید کی آواز بلند ہوئی تو سب کے سب اندر چلے آنا اور اگر ایسا نہ ہو تو تم سب ٹھہرے رہنا۔ یہاں تک کہ میں واپس آؤں۔ حضرت اندر تشریف لے گئے۔ ولید اور مروان آج خلافِ معمول پاس پاس بیٹھے ہوئے تھے اور ایک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ امام حسینؑ نے فرمایا "اتفاق و اتحاد بہ نسبت نزاع و اختلاف کے بہتر ہے۔ خدا تم دونوں کے تعلقات کو خوشگوار بنائے۔" اس کا کوئی جواب نہیں ملا اور آپ بیٹھ گئے۔ ولید نے یزید کا خط پڑھ کر سنایا۔ غالباً وہی حصہ جس میں معاویہ کی وفات کا تذکرہ تھا اور اس کے بعد بیعتِ یزید کا مطالبہ کیا۔ امام نے فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون[1] (یہ وہ فقرہ ہے جو ہر مصیبت کے موقع پر کہا جاتا ہے) خدا تم لوگوں کو اس مصیبت میں صبر عطا کرے۔ بیعت کے بارے میں یہ ہے کہ میرے ایسے شخص کی بیعت کو مخفی طور سے تو غالباً تم کافی نہ سمجھو گے جب تک کہ علانیہ بیعت نہ ہو اور عام طور سے لوگوں کو اس کا علم نہ ہو۔ ولید نے کہا، بے شک۔ آپ نے فرمایا۔ تو پھر جب مجمع عام میں وفات معاویہ کا اعلان کرو اور تمام لوگوں سے یزید کی بیعت لو اسی وقت مجھ سے بھی کہنا تاکہ یکسوئی کے ساتھ اس قضیہ کا فیصلہ ہو جائے۔[2] ولید شاید اپنے مقام پر یہ سمجھے ہوئے تھا کہ امام حسینؑ یزید کی بیعت کا سوال سنتے ہی فوراً مخالفت پر تیار ہو جائیں گے اور بہت سختی کے ساتھ [illegible] مجھے یزید کے حکم کی تعمیل کے لیے کیا

[1] [illegible] (سورہ بقرہ آیت ۱۵۶)
[2] طبری ج ۶ ص ۱۹۰، الاخبار الطوال ص ۲۲۹

صورت اختیار کرنا پڑے گی۔ اب اس نے جو آپ سے اس طرح کا ملائم انداز کا جواب سنا تو وہ اسے غنیمت سمجھا اور خوش ہو کر اس نے کہا کہ "بہتر آپ واپس جائیے اور سب کے ساتھ پھر آئیے گا۔" مروان ابھی تک خاموش بیٹھا صورتِ حال کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اب جو اس نے ولید کا یہ نرم طرزِ عمل دیکھا تو بے اختیار بول اٹھا۔ "ولید کیا غضب کرتے ہو۔ اگر حسینؑ اس وقت تمھارے ہاتھ سے نکل گئے اور بیعت نہ کی تو پھر ایسا موقع حاصل نہ ہوگا۔ جب تک کہ بہت سے لوگ طرفین کے قتل نہ ہو لیں۔ بہتر ہے کہ ابھی ان کو گرفتار کر لو اور تمھارے گھر سے جانے نہ پائیں جب تک کہ بیعت نہ کر لیں یا قتل نہ کر دیے جائیں۔"

یہ سنکر امام حسینؑ کو غصہ آ گیا اور یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے کہ کیا مجال ہے تیری یا ولید کی جو مجھے قتل کرے۔ غلط کہا تو نے بخدا اور گنہگار ہوا۔" یہ فرما کر آپ باہر نکل آئے اور اپنے اصحاب کی معیت میں گھر واپس تشریف لے گئے۔[1] مروان نے ولید سے کہا "تم نے میرا کہا نہ مانا۔ اب ایسا موقع ہاتھ نہ آئے گا۔" ولید نے کہا، مروان! یہ کسی اور سے کہو۔ تم نے مجھے وہ صورت بتائی تھی جس میں میرے مذہب کی موت تھی۔ خدا کی قسم مجھے یہ پسند نہیں کہ تمام شرق و غرب کا مال و دولت میرے قبضہ میں دے دیا جائے پھر بھی میں حسینؑ کو قتل کروں، سبحان اللہ! میں حسینؑ کو قتل کروں؟ صرف اتنی بات پر کہ وہ کہتے ہیں میں بیعت نہیں کروں گا۔ خدا کی قسم مجھے یقین ہے کہ جو شخص حسینؑ کے خون کا مجرم ہوگا وہ خدا کے یہاں روزِ قیامت میزانِ عمل میں انتہائی سبک ہوگا۔[2]

مروان نے کہا کہ اچھا یہ عقیدہ تمھارا ہے تو بیشک تم نے بہت اچھا کیا۔[3]

بہت ممکن ہے کہ اس کے بعد مروان نے ولید کی شکایت یزید کو لکھ بھیجی ہو اور اس تمام روداد کی اطلاع دی ہو۔ اور اسی کا نتیجہ ہو کہ اس کے بعد ولید مدینہ کی گورنری سے ہٹا دیا گیا ہو اور عمرو بن سعید الاشدق کو مدینہ کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔

[1] طبری ج ۶ ص ۱۸۹ [2] الاخبار الطوال ص ۲۲۹ [3] طبری ج ۶ ص ۱۹۰

یہ اس کی ایک دلیل ہے کہ خط میں بیعت نہ کرنے کی صورت میں حسینؑ کے قتل کے متعلق ضرور لکھا تھا۔ ظاہری اسباب کی بنا پر بھی کوئی شک نہیں ہو سکتا کہ حضرت امام حسینؑ نے اسی وقت صورتِ حال کی نزاکت کا پورا احساس کر لیا اور یقیناً اس کے بعد جو کچھ طے کیا وہ تمام نتائج سوچ لینے کے بعد، آپ نے یہ طے کر لیا کہ میں یزید کی بیعت ہرگز نہیں کروں گا۔ ابھی تک دنیا نفی کے معنیٰ نہیں سمجھ سکتی تھی کیونکہ وہ انکارِ بیعت کی صورت میں ان تشدد کے درجوں کا اندازہ نہیں کر سکتی تھی جو بعد میں حسینؑ کے سامنے آئے لیکن حسینؑ جس وقت کہہ رہے تھے کہ میں بیعت نہیں کروں گا اس وقت وہ بیعت نہ کرنے کے معاوضہ میں ظلم و تشدد کے تمام امکانات پر غور کر کے اور اپنے نفس کی قوتِ برداشت کا پورا جائزہ لے کر کامل اعتماد کے ساتھ بیعت کی نفی کر رہے تھے اور اسی لیے آپ دیکھیں گے کہ تشدد اپنی آخری حد پہ پہنچ گیا مگر حسینؑ کے صبر و برداشت کی قوت ختم نہ ہو سکی۔ وہ اپنی بات پہ آخر تک قائم رہے۔ اسی عزم و استقلال کے ساتھ جس کو انھوں نے پہلے دن طے کر لیا تھا۔

یہاں پر یہ بحث پورے طور پہ صاف ہو جانی چاہیے کہ آخر یزید کی رسمی بیعت اختیار کر لینا کون سا ایسا ناقابلِ برداشت امر تھا جسے حضرت امام حسینؑ کسی صورت سے گوارا نہیں کرتے تھے۔ اس کے لیے ایک نظر حسینؑ کی ان ذمہ داریوں پر ڈالنا ہو گی جو خاندانِ رسولؐ کے اس وقت سب سے بڑے ذمہ دار رکن ہونے کے اعتبار سے ان پہ عائد تھیں اور ان قدیم روایات کو دیکھنا ہو گا جو اسلام اور حقانیت کی حفاظت کے لیے امام حسینؑ کے آباؤ اجداد کی ذات سے وابستہ رہی تھیں اور جن کے اس وقت حسینؑ ذمہ دار تھے اور پھر یہ دیکھنا ہو گا کہ اس وقت حسینؑ اپنے فرض کی تکمیل کس طرح کر سکتے تھے۔ یہ بھی سمجھنا ہو گا کہ یزید کو حضرت امام حسینؑ سے بیعت لینے کے لیے اس قدر کد و کاوش کی ضرورت کیا تھی؟ جبکہ جمہوریت کے اصول پر اکثر افراد کا کسی حکومت کو قبول کر لینا آئینی طور پر اس کے مسلّم ہو جانے کے لیے کافی اور اقلیت کی رائے ناقابلِ اعتبار ہے۔ اس کے ساتھ یہ کوئی قانون نہیں کہ اقلیت کو جبری طور پر اپنی رائے بدلنے کے لیے مجبور کیا جائے۔

جبکہ اس کی طرف سے عملی طور پہ کوئی شورش انگیزی [کی] جا رہی ہو۔ خلافت کے ہر دور میں کچھ لوگ ایسے رہے جنھوں نے بیعت نہیں کی تھی۔ خود [حض]رت علیؑ بن ابی طالبؑ کے زمانۂ خلافت میں حسان بن ثابت، کعب بن مالک اور زید بن [ثا]بت وغیرہ کئی آدمی ایسے تھے جنھوں نے آپ کی بیعت سے کنارہ کشی کی تھی۔ مگر صرف بیعت [نہ] کرنا کوئی قابلِ سزا جرم نہیں سمجھا گیا۔ یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ معاویہ نے مکّہ اور مدی[نہ م]یں چاہے کتنی ہی بڑی کانفرنس یزید کی بیعت لینے کے لیے منعقد کی ہو لیکن یقیناً مکّہ او[ر م]دینہ کی مردم شماری کے اعتبار سے سیکڑوں ہزاروں آدمی ایسے رہ گئے ہوں گے جو گھروں میں [بیٹھ]ے ہوں گے اور جنھوں نے یزید کی بیعت نہیں کی ہو گی لیکن کسی کے لیے بیعت کی ضد نہیں ک[ی گئ]ی اور سلطنت کو ان سے کاوش پیدا نہیں ہوئی۔ پھر ایک حسینؑ میں کیا بات ایسی تھی کہ آ[پ] سے بیعت حاصل کر لینے کے لیے سلطنت شام کی پوری مشینری حرکت میں آ جائے ا[ور ش]اہی جبروت کی تمام طاقت صرف کر دی جائے۔ ماننا پڑے گا کہ حسینؑ سے بیعت بحیثیت ملک عرب کے ایک فرد کے نہیں طلب کی جا رہی تھی بلکہ اس بنا پر کہ ایک فرد ایک جماعت [یا] قوم بن جاتی ہے۔ نمائندگی کے اعتبار سے۔ حقیقت میں حسینؑ فقط حسینؑ ہی نہ تھے وہ توا[س] وقت خاندانِ رسالت کی بزرگ ترین ہستی ہونے کے لحاظ سے اس ورثہ کے حامل تھے جو دینِ خدا کی صحیح معنی میں حفاظت سے متعلق تھا اور جو پیغمبرِ اسلامؐ کے بعد ان کے اہل بیت میں یکے بعد دیگرے منتقل ہو رہا تھا اور اسی لیے خاندانِ رسولؐ یا خاندانِ علیؑ بن ابی طالبؑ میں محمد بن حنفیہ بھی تو تھے۔ عبداللہ بن جعفر بھی تو تھے۔ حضرت عباس بن علیؑ اور ان کے بھائی بھی تو تھے۔ کوئی شک نہیں کہ ان میں سے کسی نے یزید کی بیعت نہیں کی مگر تاریخ نہیں بتا سکتی کہ ان میں سے کسی سے بھی بیعت طلب کی گئی ہو۔ صرف اس لیے کہ ان می[ں] سے کسی کو حسینؑ کی موجودگی میں وہ ذمہ دارانہ حیثیت حاصل نہ تھی جو حسینؑ کو حاصل تھی۔

یزید کو حسینؑ سے بیعت حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی اگر وہ صرف دُنیوی

قسم کی ایک سلطنت کا دعویدار ہوتا۔ مگر وہ جس قسم کی سلطنت کے مالک ہونے کا مدعی تھا وہ تو خلافتِ اسلامیہ والی حکومت تھی جو رسول اللہؐ کی جانشینی کی مرادف سمجھی جاتی تھی۔ اس کا نصب العین یہ تھا کہ بادشاہ مذہب کے جزء و کُل کا مالک ہو اور مذہبی قوانین بادشاہ کی خواہشوں کے پابند ہوں۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ وہ پیغمبرِ اسلامؐ کے مذہبی وارث سے اپنی حکومت کو تسلیم کرائے اور وہ خوب سمجھتا تھا کہ اس وراثت کی حامل اس وقت صرف حسینؑ کی ذات ہے اس لیے وہ لازم سمجھتا تھا کہ آپ سے اپنی بیعت حاصل کرے۔

حسینؑ سمجھتے تھے کہ اگر اس وقت میرے بھائی حضرت امام حسنؑ زندہ ہوتے تو بیعت کی خواہش ان سے کی جاتی مجھ سے نہ کی جاتی۔ اگر میرے پدر بزرگوار حضرت علیؑ ہوتے تو جھگڑا ان سے کیا جاتا، مجھ سے نہ کیا جاتا اور اگر میرے جدِّ بزرگوار رسول اللہؐ ہوتے تو اپنی حکومت کے جواز کی تصدیق ان سے حاصل کرنے کی کوشش ہوتی مجھ سے نہ ہوتی۔ مگر اب تو وہ دیکھ رہے تھے کہ میرے نانا رسول اللہؐ نہیں ہیں، میرے بابا علی مرتضیٰؑ نہیں ہیں اور میرے بھائی حسنؑ مجتبیٰؑ بھی نہیں ہیں۔ اب تو میں ہوں اس لیے مجھ سے بیعت طلب کی جا رہی ہے۔ اس صورت میں اگر میں نے بیعت کر لی تو وہ ایسا ہے جیسے میرے بھائی حسنؑ ہوتے اور وہ بیعت کر لیتے۔ میرے بابا علیؑ ہوتے اور وہ سرِ تسلیم خم کر دیتے۔ اور میرے نانا رسول اللہؐ ہوتے اور وہ اس حکومت کو جائز تسلیم کر لیتے۔ انھوں نے اس سخت احساسِ ذمہ داری کی بناء پر تمام مشکلات کو برداشت کرنا گوارا کر لیا اور یہ طے کیا کہ میں بیعت نہیں کروں گا۔

یہ عزتِ نفس، شرفِ حق اور وقارِ دینی کا سوال تھا اور پہلے ہی دن آپ نے اس مرحلہ میں آخر تک ثابت قدم رہنے کا عزم کر لیا تھا جس کا آخری نتیجہ بھی معلوم تھا اس کا آپ نے کوئی بلند بانگ اعلان نہیں کیا تب بھی آپ کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ سننے والوں کو اس کا پتہ دے رہے تھے۔ چنانچہ ابوسعید مقبری کا بیان ہے کہ میں نے امام حسینؑ کو مدینہ کی مسجد میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ آپ کے ساتھ اس وقت دو آدمی تھے جن کے

کاندھے پر باری باری ہاتھ رکھ کر چل رہے تھے اور آپ کی زبان پر ابن مفرغ کے یہ اشعار تھے ؎

لا ذعرت السوام فی فلق الصبح   مغیرا ولا دعیت یزیدا
یوم اعطی من المھابۃ ضیما   والمنایا یرصدننی ان احیدا

"ان کا مطلب یہ ہوا کہ خدا وہ دن نہ لائے کہ موت کی طاقتیں کمینگاہوں سے حملہ کر کے مجھے میرے راستے سے ہٹانے کی کوشش کریں اور میں ان کے خوف سے ذلت کو برداشت کر لوں۔"

ابوسعید کا بیان ہے کہ ان اشعار کو سن کر اسی وقت میری سمجھ میں آیا کہ آپ کسی خاص اقدام کا ارادہ رکھتے ہیں۔

دو ہی دن گزرے تھے کہ معلوم ہوا آپ مکہ کی طرف روانہ ہو گئے۔[1]

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۹۱

پندرھواں باب

امام حسنؑ کی خاموشی اور امام حسینؑ کا اقدام

اس مقام پر اکثر یہ سوال پیش کیا جاتا ہے کہ آخر حضرت امام حسنؑ نے بھی تو یزید کے باپ معاویہ سے مصالحت کر لی تھی۔ اسی طرح اگر امام حسینؑ صلح کر لیتے تو کیا حرج تھا؟ بظاہر دونوں بھائیوں کے طرزِ عمل میں اختلاف ہے اور اسی سے سلطنتِ بنی امیہ کے ہوا خواہوں نے دونوں بھائیوں کے اختلافِ رائے کی حکایتیں بھی تصنیف کی ہیں لیکن تاریخی واقعات کی رفتار کا بغور مطالعہ اس اختلافِ طبیعت کے سوال اور اس خیال کی کوئی گنجائش باقی نہیں رکھتا۔

حقیقت یہ ہے کہ حالات مختلف ہوتے ہیں اور ان حالات کے لحاظ سے فرائض کا تقاضا بھی مختلف ہو جاتا ہے۔ ابنائے زمانہ زیادہ تر جذبات کے پابند ہوتے ہیں اور جذبات اکثر افراط و تفریط کی بنا پر حدِ اعتدال سے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں لیکن اخلاقِ انسانی میں کامل اشخاص ہر موقع پر فرض کا اندازہ کرتے ہیں۔ انھیں اس سے بحث نہیں ہوتی کہ وہ ابنائے زمانہ کے جذبات کے مطابق ہے یا مخالف اس لیے ان کا طرزِ عمل اکثر عام افرادِ انسانی کو متضاد نظر آتا ہے اور اکثر ان پر دونوں طرح کے معترض پائے جاتے ہیں۔ کبھی ان پر اقدام پسند طبائع اعتراض کرتے ہیں اور کبھی رجعت پسند طبیعتیں معترض ہوتی ہیں لیکن وہ ان اعتراضات کی کوئی پروا نہیں کرتے اور اپنے مسلک کے پابند رہتے ہیں۔ اس لیے کہ وہی ان کے نزدیک فرض کا تقاضا ہوتا ہے۔

یہی صورت ہم کو پیغمبرِ اسلامؐ کے طرزِ عمل کے متعلق ملتی ہے۔ یہی علی مرتضیٰؑ کی سیرت اور یہی ان کے فرزندان حسنؑ اور حسینؑ کے طرزِ عمل کے متعلق نظر آتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ امام حسن مجتبیٰؑ کی صلح کے واقعات کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ وہی مجاہدۂ کربلا

کی تمہید تھی اس لیے کہ ہر اقدام جو اپنے وقت پر ہو مفید، نتیجہ خیز اور مؤثر ہوتا ہے لیکن اگر وقت سے پہلے عمل میں لایا جائے تو وہ نتیجۃً مفید ہونے کے بجائے مضر ثابت ہوتا ہے بلکہ اپنے مرتکب کو اکثر ہمیشہ کے لیے موردِ الزام بنا دیتا ہے۔

واقعات کی رفتار یکساں حالت پر نہیں رہتی بلکہ تدریجی حیثیت سے ترقی کرتی ہے اور ان کا طریقۂ علاج بھی اسی اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر زخم رسیدہ یا پکے ہوئے جزوِ بدن ہاتھ یا پیر کا علاج کرو، پھاہے لگاؤ، مرہم بدلو، ضرورت ہو تو بار بار نشتر دلواؤ، پھر اگر نہ اچھا ہو اور اس کی سمیت کے جسم میں سرایت کرنے کا خطرہ ہو تو اسے کاٹ کر بھی پھینک دو کسی کو اعتراض کا حق نہ ہوگا۔ لیکن اگر زخم پیدا ہوتے کے ساتھ ہی اور کوئی علاج معالجہ کرنے کے پہلے ہی کاٹ ڈالتے تو ضرور موردِ الزام ہوتے اور عام طور پر بے عقل سمجھے جاتے حالانکہ یہ طریقۂ عمل وہی ہے جو بعد میں اختیار کیے جانے پر صحیح و مستحسن قرار پائیگا۔

دشوار گزار حالات کی اصلاح کے لیے قربانی اور وہ بھی جان کی قربانی کامیاب اور مؤثر ترین حربہ ہے لیکن سب سے آخری۔ جب تمام وسائل اور ذرائع ختم ہو جائیں اور کوئی تدبیر کارگر نہ ہو اسی وقت اس کا درجہ ہے۔ وہ جہاں کا آخری درجہ ہے وہیں تک مؤثر ہے اور اگر اس سے پہلے عمل میں آجائے تو جلد بازی، غیر موقع شناسی اور ناعاقبت اندیشی وغیرہ کا الزام آ جانا ضروری ہے جس کے بعد اس کو حق بجانب نہیں سمجھا سکتا اور اسی کے ساتھ اس کی کامیابی اور تاثیر رخصت۔

حالات کی اصلاح کے لیے احتجاج و استغاثہ، مصالحت اور معاہدۂ مودّت یہ ایسی چیزیں ہیں جن کا اختیار کیا جانا ابتدائی حدود میں ضروری ہے۔ بیشک جب یہ سب ذرائع اختیار کیے جانے پر ناکام ثابت ہوں تو پھر عربی مثل من جرّب المجرّب حلّت به الندامة اور فارسی مثل "آزمودہ را آزمودن جہل است" کے مطابق ان سے ان ذرائع کا مطالبہ نہ ہو سکے گا اور ان کی رفتارِ عمل کو آگے بڑھا کر دوسرے اقدام تک پہنچنے کا حق ہوگا۔ یہی تدریجی رفتارِ اقدام

عمل میں جب تک قائم ہے کامیابی کی توقع ہے ورنہ نہیں۔ ایک بات ہو جانے پر پہلے ہی دن مرنے مارنے پر آمادہ ہوجانے والا مغضوب الغضب کہا جائے گا۔ وہ کسی تعریف کا مستحق نہیں برخلاف اس کے اگر تمام دیگر ذرائع واسباب سے اتمام حجت کے بعد انسان کسی اہم مقصد کے لیے جان دینے پر تیار ہوجائے تو فداکاری وجاں نثاری اور مؤثر قربانی قرار پائے گی۔

ایک انسان اگر اپنے اعمال وافعال میں توازن کو ملحوظ رکھتا ہے اور اپنی کارگزاریوں میں صرف جذبات کا فرمانبردار نہیں بلکہ عقلی غور و تدبّر کا پابند ہے تو اسے اس نظام کا پابند ہونا ضروری ہے۔ شام کی اموی سلطنت کے ہاتھوں بے شک مذہب خطرہ میں تھا اور حق وراستی پامال ہو رہی تھی جس کی اصلاح کے لیے قربانی درکار تھی لیکن اس قربانی کے حق بجانب قرار پانے کے لیے دوسرے پُرامن اور صلح پرور وسائل و ذرائع صرف کیے جانے کی ضرورت تھی۔ اگر امام حسینؑ بغیر کسی قسم کے سابقہ حالات کے اچانک یزید کی بیعت سے کنارہ کشی کر کے باوجود فقدان اعوان وانصار مخالفت پر جس کا لازمی نتیجہ آپ کا قتل ہونا تھا تیار ہوجاتے اور ایسا کرنے تو ان سوالوں کا پیدا ہونا ناگزیر تھا کہ آخر امام نے اتحادِ عمل کے ساتھ حالات کی درستی کی کوشش کیوں نہ کی؟ مخصوص شرائط کے ساتھ صلح کر کے ان مقاصد کو کیوں نہ حاصل کیا؟ کم سے کم امورِ سلطنت سے بے تعلقی اختیار کر کے مدینۂ رسولؐ میں قیام پذیر کیوں نہ رہے اور کربلا آکر اپنے کو معرضِ خطر میں کس لیے ڈالا؟

ان سوالات کے پیدا ہونے کے بعد جن کا کوئی صحیح حل بھی بظاہر موجود نہ ہوتا یقینی آپ کا قتل ہونا صرف جذبات کی کارفرمائی کا نتیجہ قرار پاتا اور اس لیے نہ قابل ستائش ہوتا اور نہ مؤثر د کامیاب مگر یہاں صورت حال یہ تھی کہ امام حسینؑ کا اقدام ایک مکمل نظام کے تحت میں واقع ہو رہا تھا جس کے لیے برسوں کی طویل مدت کے حالات موقع کو قریب لا رہے تھے یہاں تک کہ سنہ ۶۰ھ سے لے کر سنہ ۶۱ھ تک میں اس کا وقت آگیا۔

شروع شروع میں جناب امیرؑ کا اپنے حقوق کی پامالی کے باوجود ۲۵ سال خاموش رہنا اس کے بعد لوگوں کے انتہائی اصرار پر خلافت قبول کرنا اور بنی امیّہ کا آپ کے مقابلہ میں برسرِ پیکار ہوجانا، آپ کا شہید ہونا اور امام حسنؑ کا مسندِ خلافت پر متمکن ہونا لیکن حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے صلح کر لینا اور مخصوص شرائطِ معاہدہ کے ساتھ سلطنت کی ذمہ داریوں سے دستکش ہو کر دس برس خاموشی کی زندگی بسر کرنا اور پھر دس ہی برس تک خود امام حسینؑ کا بھی عملی حیثیت سے خاموش رہ کر حالات کا مطالعہ کرتے ہوئے اکثر زبانی یا مکتوبی احتجاج کرتے رہنا لیکن باوجود اس کے حالات کا رُو باصلاح ہونے کے بدلے بد سے بدتر ہوتے جانا، شرائطِ معاہدہ کو ٹھکرا دیا جانا، صلح نامہ کی دفعات کا پامال ہوجانا، زبانی احتجاج واستغاثہ پر کوئی شنوائی نہ ہونا بلکہ اپنے انسانیت سوز اور اسلام کش افعال پر بیش از بیش اصرار کیا جانا اور اس سلسلہ میں پانی کا سر سے اونچا ہوجانا اور معاملات کا حد سے گزر جانا وہ تھا جس نے امام حسینؑ کے لیے اس عظیم اقدام کا موقع پیدا کر دیا تھا کہ جو انھوں نے کربلا کی سرزمین پر انجام دیا۔

حسینؑ کے سامنے اب صلح کا سوال ہی نہیں سکتا تھا اس لیے کہ صلح کی منزل کو امام حسن طے کر چکے تھے اور اب شرائطِ صلح کی مخالفت ہی وہ صورت حال تھی جو امام حسینؑ کے سامنے تھی حالانکہ معاویہ اپنے اعمال میں بہر حال کچھ نہ کچھ پردہ رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ پھر جب معاویہ کے ساتھ مصالحت نتیجہ میں ناکام رہی تو یزید کے ساتھ مصالحت کے کیا معنی؟

پھر امام حسنؑ نے جو صلح کی اس کی نوعیت تو یہ تھی کہ پہلے حضرت امام حسنؑ مسندِ خلافت پر متمکن تھے۔ صلح کے ذریعہ سے آپ نے حکومتِ ظاہری کو چھوڑ دیا اور مخصوص شرائط کے ساتھ خلافت معاویہ کے سپرد کر دیا مگر اس کے معنی یہ نہیں تھے کہ آپ نے خلافتِ الٰہیہ، امامت یا تعلیمِ اسلامی کے بارے میں اپنے دینی مسلک اور معاشرتی و اجتماعی اصول سے دست برداری اختیار کر لی۔ یہ صلح اس کے بعد سے صرف ایک معاہدۂ عدم تعرض کی حیثیت رکھتی تھی جبکہ روحانیت کا مرکز دنیوی اقتدار کے مرکز سے ایک عرصہ تک کے لیے علیحدہ ہوگیا اور اسی لیے حضرت امام حسنؑ کی زندگی اس معاہدہ کے بعد بھی محفوظ نہیں رہی سلطنتِ شام

امام حسینؑ سے اس عدم تعرض پر اکتفا کرنے والی ہوتی تو طلب بیعت کی ضرورت نہ تھی کیونکہ عدم تعرض تو ان حضرات کی جانب سے قائم ہی تھا۔ دمشق کی سیاست اب اس پر رضامند نہیں تھی کہ روحانیت کا مرکز مادی اقتدار کے مرکز سے الگ دنیا میں موجود رہے۔ معاویہ کا معاہدہ وقتی طور پر ایک مجبوری کا نتیجہ تھا۔ بغیر اس کے حضرت امام حسنؑ کی تسلیم شدہ حیثیت جو مسلمانوں میں باعتبار حکومت حاصل تھی ختم نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے بعد ان کو خود اور ان کے بعد یزید کو شدت کے ساتھ اس کا احساس تھا کہ یہ کانٹا ہمیشہ کے لیے راستے سے نکل جائے۔ تسخیرِ ممالک اور تسخیرِ قلوب مختلف چیزیں ہیں۔ ایک کو دوسرے سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ فاتح ممالک کو فاتح قلوب سے ہر وقت اندیشہ رہتا ہے۔ یہی خطرہ تھا جس کی وجہ سے اہل بیت رسولؐ سلطنتِ دمشق کی نظر میں بہرحال قابلِ مزاحمت تھے خواہ وہ مزاحمت کریں یا نہ کریں۔

ان حالات کے ہوتے ہوئے امام حسینؑ کے لیے اس طرح کی صلح کا کوئی محل نہ تھا جیسی صلح امام حسنؑ کر چکے تھے۔ وہ صلح ایسی تھی کہ اگر اس وقت ذمہ دارانہ حیثیت امام حسینؑ کی ہوتی تب آپ بھی اس صلح کے مسلک کو اختیار کر کے مسلمانوں میں امن قائم کر دیتے آپ کے سامنے تھا بیعت کا سوال۔ اس کے معنی تھے اس روحانی مرکز کی شکست جس کے حسینؑ ذمہ دار تھے۔ اس کے معنی تھے اس تمدن اور نظامِ سیاست کو قبول کر لینا جو سلاطینِ دمشق نے قائم کیا تھا۔ یہ ایسی چیز تھی جو آلِ محمدؐ کے لیے کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہو سکتی تھی خواہ حسینؑ ہوتے یا ان کے بجائے اس وقت امام حسنؑ ہوتے۔

پھر سابق زمانہ میں تو خلفاء اپنے کو کتاب اور سنت کا محافظ ظاہر کیا کرتے تھے اور بیعت بھی اسی پر لی جاتی تھی کہ کتاب و سنت پر عمل ہوگا۔ مگر یزید کے دور میں سلطنت کی مطلق العنانی اور خود سری اس درجہ پر پہنچ گئی تھی کہ بیعت لی جاتی تھی اس بات پر کہ ہم خلیفہ کی ملکیت ہیں۔ وہ ہمارے جان و مال اور اولاد کے ساتھ جو چاہے سلوک کر سکتا ہے۔ مدینہ میں یزید بن عبداللہ بن ربیعہ بن اسود اسی جرم پر قتل کیے گئے کہ وہ کتاب اور سنت پر بیعت کرنے کے لیے تیار تھے۔

مگر مذکورہ الفاظ میں یزید کی غلامی کا اقرار کر[...] کے لیے تیار نہ تھے[1]

ان ہی باتوں کا نتیجہ تھا جیسا کہ بعد میں [...]وم ہوگا کہ امام حسینؑ کو آپ کے اس اقدام کے سلسلہ میں مختلف اوقات میں بہت سے [...]ے دیے گئے۔ یہ کہا گیا کہ مدینہ ہی میں قیام کیجیے۔ یہ کہا گیا کہ مکہ کو مستقر بنائے رکھیے۔ یہ کہا گ[...]طائف یا یمن کی طرف چلے جائیے۔ یہ کہا گیا کہ کوہِ اجا میں چل کر پناہ لیجیے۔ مگر یہ کسی عزیز یا [...]ست نے مشورہ نہیں دیا کہ آپ یزید کی بیعت کر لیجیے کیونکہ یہ ایک تسلیم شدہ بات تھی کہ یز[...]ی بیعت امام حسینؑ کے لیے کسی طرح ممکن نہیں۔ یزید کی بیعت کرنے کے معنی یہ تھے ک[...]ینؑ ہر قسم کے شریفانہ شعور اور مسلمانوں کے ہر قسم کے حقوق کو بیچ ڈالتے۔ حسینؑ کے لیے [...]ل تھا کہ حسینؑ فضیلت اور ضلالت کو ایک درجہ میں رکھتے۔

[...] عبداللہ بن عباس، عبدالرحمٰن بن ابی [...] اور عبداللہ بن زبیر وغیرہ نے بھی یزید کی خلافت کو پسند نہیں کیا۔ ان سب نے معاویہ کے سا[...]ے ہی یہ کہہ دیا تھا کہ ان کا یہ طریق عمل کسی طرح جائز نہیں ہے۔ پھر حسینؑ ہر دوسرے شخص [...] زیادہ اسلام کا درد رکھتے تھے۔ حسینؑ زیادہ حق رکھتے تھے کہ وہ یزید [...]ے مطالبات کو حقارت کی نظر سے دیکھیں اور ہر قسم کی قربانی اسلام کی حمایت میں پیش کریں۔

---

[1] اخبار الطوال صفحہ ۲۱۶

سولھواں باب

حسینی موقف کی تشریح

جب کوئی صورت سمجھوتے اور مصالحت کی تھی نہیں تو پھر اب کیا رہ جاتا ہے؟ جنگ! مگر مادی طور پر جنگ کرنے کا سوال اس وقت پیدا ہی نہیں ہوسکتا تھا۔ تاریخی صورت حال یہ ہے کہ اس وقت حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کی وفات کو بیس برس گزر چکے تھے۔ بنی امیہ کی طاقت جو شام میں تھی حضرت علیؑ ہی کے زمانہ میں اتنی مضبوط ہوگئی تھی کہ حضرت علیؑ کی قوت سے صفین میں گویا برابر کی ٹکر لے سکی اور حضرت امام حسنؑ کو اس سے مقابلہ میں ایک شدید خونریزی کے آثار نظر آئے جس کی وجہ سے آپ نے صلح کرنا بہتر سمجھا حالانکہ اس وقت شیعانِ علیؑ کی جمعیت منظم تھی مگر اب بیس برس کی طولانی مدت گزرنے پر وہ جتھا پراگندہ ہوچکا تھا۔ ہزاروں آدمیوں کے ضمیر خریدے جا چکے تھے۔ بہت سے ثابت قدم لوگوں کے سر قلم کیے جا چکے تھے اور بہت سوں کو جیلوں میں بھرا جاچکا تھا۔ بقیہ لوگ خوف و دہشت اور بد دلی سے ادھر اُدھر پریشان و پاشان ہو گئے تھے۔ ایسی صورت میں دمشق کے شہنشاہی اقتدار کے مقابلہ میں جنگ کا سوال ہی کیا پیدا ہوسکتا تھا؟ اس کے علاوہ آپ کا مقصد جو یزید کے مقابلہ میں تھا وہ مادی جنگ سے حاصل بھی نہیں ہوسکتا تھا اس کی تشریح آیندہ کی جائے گی۔

اس کے بعد حضرت امام حسینؑ بیعت سے انکار کر رہے تھے تو کیا کریں گے؟ ایسے اگر حسینؑ کرکے نہ دکھلاتے تو ہماری ہرگز سمجھ میں نہ آتا۔ حسینؑ نے یہی طے کیا کہ وہ جنگ ... قت کا مقابلہ طاقت سے ہوتا ہے۔ حسینؑ نے سب سے پہلے یہ نمونہ پیش کرنا چاہا کہ آپ طاقت کا مقابلہ کردار سے کریں گے۔ آپ نے یہ طے کیا کہ آپ اقتدار کا مقابلہ بےبسی سے، کثرت کا مقابلہ قلت سے اور ظلم کا مقابلہ مظلومیت کے ساتھ کریں گے اور یہ وہ طریقۂ جنگ تھا جس کا مشاہدہ اس سے پہلے دنیا نے نہیں کیا تھا۔

آپ محسوس کر رہے تھے کہ تعلیماتِ اسلام پر ایسا غلاف چڑھ گیا ہے جس سے آئندہ صدیوں کو اور قیامت تک آنے والی نسلوں کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ حقیقتاً وہ تمدن، وہ آئین معاشرت اور وہ نظامِ زندگی کیا تھا جسے پیغمبرِ اسلامؐ نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔

یہ ظاہر ہے کہ بعد کی آنے والی نسلوں کے لیے سابقہ حالات معلوم کرنے کا ذریعہ اگر کوئی ہوسکتا ہے تو وہ کتب تواریخ۔ یہی تاریخ کی دوربین وہ ہے جس کے ذریعہ سے صدیوں اور ہزاروں برس پہلے کے حالات کا انسان مطالعہ کرتا ہے۔ اسلامی دنیا میں سلاطینِ اسلام کا شاہنشاہی اقتدار اتنا نمایاں تھا کہ اگر اسلامی تمدن و تہذیب کی جانچ کے لیے کوئی طالبِ تحقیق تاریخ کے اوراق پر نظر ڈالتا تو اس کو اسلام کی سرزمین پر دمشق اور بغداد کے اونچے قصر نظر آتے۔ وہ بڑے بڑے پھاٹک دکھائی دیتے جن پر زرتار پردے پڑے ہوئے ہیں وہ ایوان جلوہ دکھاتے جہاں دیواروں پر زر و جواہر کا کام بنا ہوا ہے اور سونے چاندی کے دروازے ہیں اور اگر محل کے اندر باریابی ہو جاتی تو زر و جواہر سے مرصع تخت نظر آتا اور زریں کمر غلام صف باندھے ایستادہ، مہ جبینوں کا جھرمٹ، شراب کے دور، مغنی کی صدا اور ساز و طرب کے نغموں کی گونج۔ "پیشوائے اسلام" کی بارگاہ میں نماز کا وقت آتا ہے تو وہ بھی سلام کرتا ہوا چلا جاتا ہے۔ مؤذن کی صدا آتی ہے مگر نشاط و طرب کے نقارخانہ میں طوطی کی آواز بن کر سنائی نہیں دیتی۔ جب وہ نظارہ دیکھتا تو کیا یہی رائے قائم نہ کرتا کہ اسلام کا تمدن یہی ہے اور یہی وہ تہذیب ہے جس پر مسلمان نازاں ہیں؟ یقیناً ایسا ہی ہوتا کہ وہاں کا آئین و نظام بطور مثال پیش کیا جاتا۔ ان کے افعال مسلمانوں کے افعال بتلائے جاتے اور ان کا کردار

ہی ایک ایسا آئینہ ہوتا ہے جس میں مسلمانوں کی تصویر نظر آتی۔ کہاں نظر آتے محلہ بنی ہاشم کے وہ ٹوٹے پھوٹے کھنڈر جن میں کچھ بوڑھے کچھ جوان اور کچھ بچے اپنے خالق کی یاد میں مصروف ہیں۔ وہ دروازے جہاں غریب، محتاج اور مسکین آتے ہیں تو اپنے سامنے کا کھانا اٹھا کر دے دیا جاتا ہے اور خود فاقہ سے دن گزار لیے جاتے ہیں۔ جہاں غلام اور کنیز سے مساویانہ برتاؤ کیا جاتا ہے، کہاں نظر آتے وہ چہرے جن پر محنت و مشقت برداشت کرنے سے زردی چھائی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ ہونٹ جو ذکر الٰہی سے خشک ہو گئے ہوں۔ وہ افراد جن کا نصب العین یہ ہے کہ کسی غریب کو اٹھاؤ، کمزور کی مدد کرو، کسی محتاج و بے کس کی دستگیری کرو، کسی مظلوم کو ظلم سے نجات دلاؤ اور دنیا کو اپنے اخلاق سے نمونۂ جنت بناؤ۔

بس حسینؑ بن علیؑ کا مقصد یہ تھا اور وہ یزید کی بیعت کا انکار کرتے ہوئے اسی پر کمربستہ ہو گئے تھے کہ تو سہی وہ انسانیت کی نگاہ کو ان اونچے مناظر سے ہٹا دیں۔ ان قصروں اور میناروں سے موڑ دیں اور اسلامی اصول کی برق تجلّی کو عمل کی اس معراج پر آنکھوں کے سامنے لائیں کہ نظر اٹھتے ہی سب سے پہلے اسی پر جا پڑے اور اسی کی چمک دمک میں محو ہو جائے انہوں نے چاہا کہ اپنے کردار کو ایسی بلندی پر لے جائیں جہاں وہ ستارے کی طرح چمک اٹھے سلاطین دنیا کے بڑے بڑے محل اور مینار نظر نہ آئیں بلکہ آپ کا کردار نظر آئے۔ وہ چاہتے تھے کہ انسانیت کے کانوں کو اس نقارہ خانۂ سازو نغمہ سے بہرا بنا دیں اور حقانیتِ اسلام کی اس سریلی اور دلکش آواز سے شناسا کر دیں جو موجودہ فضا میں سنائی نہیں دیتی۔

دوسرے لفظوں میں آپ کا مطلب یہ تھا کہ ایک مرتبہ دنیا کے سامنے اس حقیقت کو پوری شدت و قوت سے پیش کر دیں کہ حکومت و شہنشاہیت اور ہے اور اسلامی تہذیب و تمدن اور اس کے اصول اور ہیں۔

حضرت امام حسینؑ جس مقصد کو لے کر اٹھ رہے تھے وہ اپنی نوعیت و خصوصیت میں کوئی نیا نہ تھا۔ وہ تو وہی تھا جسے تمام انبیاء لے کر آئے تھے اور جس کے لیے تمام مصلحین ہمیشہ کوشش کرتے رہے مگر اس کو جس صورت سے آپ نے حاصل کیا وہ ایک ایسی مثال ہے جو نہ اس سے پہلے نظر آئی اور نہ بعد کو۔

سیاسیاتِ امم کے واقف کار خوب جانتے ہیں کہ ظلم و جور کی طاقت اور شہنشاہیت جس وقت افرادِ انسانی کو اپنے شکنجہ میں قید رکھنا چاہتی ہے تو کچھ ذرائع اختیار کرتی ہے اور ان تمام ذرائع کا اصلی مقصد دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ عوام سے قوتِ احساس کو سلب کیا جائے دوسرے جراتِ اظہار کو ختم کیا جائے۔ شام کی اموی حکومت نے اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے ان ہی دو باتوں پہ پوری طاقت صرف کر دی تھی ورنہ مسلمان جن کو پیغمبرؐ نے محنت و مشقت کے ساتھ اصولِ انسانیت کی تلقین کی ہو اور جنھوں نے دیکھا ہو کہ پیغمبرؐ کس طرح مادی ساز و سامان کو ہیچ سمجھتے تھے جنھوں نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہو کہ پیغمبرؐ کے دروازے پر پھٹا ہوا پردہ پڑا رہتا تھا جنھوں نے دیکھا ہو کہ تین تین دن تک پیغمبرؐ کے گھر سے دھواں نہیں اٹھتا، جتنا روپیہ آتا ہے غریبوں اور مسکینوں کو دے دیا جاتا تھا۔ وہی کیونکر اس کو برداشت کر سکتے کہ بادشاہ کے خزانہ میں غریبوں کا خون چوس کر روپیہ جمع ہو اور اس کو رنگ رلیوں میں صرف کیا جائے۔ خلیفہ کی بارگاہ میں رقص و سرود کی محفلیں ہوں اور شراب و کباب کے مشغلے رہیں مسلمان اس کو صرف خاموشی سے دیکھتے ہی نہ رہیں بلکہ ایسے شخص کو پیشوا تسلیم کریں۔ یہ فطرت کا انقلاب مسلمانوں میں کس طرح پیدا ہو سکتا تھا؟ صرف قوتِ احساس ختم ہونے اور جراَتِ اظہار کے سلب ہونے سے۔

قوتِ احساس ختم کرنے کی صورتیں بہت سی ہیں ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ عوام صاحب رائے نہیں ہوتے۔ ان کے پاس دل ہوتا ہے مگر دماغ نہیں ہوتا۔ دماغ رکھنے والے ممتاز افراد اور لیڈر ہوتے ہیں۔ خاص خاص لیڈروں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا جائے تو جدھر یہ لیڈر لے جانا چاہیں عوام بے خبری کے ساتھ اسی طرف چلے جائیں گے خواہ یہ راستہ کتنا ہی غلط کیوں نہ ہو۔ اسی بنا پر عموماً جمہوریتوں میں ظاہری کثرت رائے حقیقی رائے عامہ کی ترجمان نہیں ہوتی۔ اموی

سیاست نے خواص کو اپنے قبضہ میں کیا۔ اس طرح کہ جس کو ذرا مخالفانہ رجحان رکھتے ہوئے پایا اس کی جیب میں اشرفیوں کی ایک تھیلی پہنچا دی گئی۔ اگر اس نے قبول کر لی تو سمجھ لیجیے کہ جتنا ان اشرفیوں کا وزن تھا اتنا ہی اس کی مخالفت کا سر جھک گیا۔ "پھر چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی"۔ جہاں خیال پیدا ہوا کہ اب کی دفعہ دو توڑے ملے ہیں اس کے بعد بجائے دو کے چار ملیں گے۔ وہیں قوتِ احساس ختم ہو گئی یعنی یہ خیال ہونے لگا کہ دنیا کے لیے چاہے جیسے ہوں یہ حکام ہمارے لیے تو بہت اچھے ہیں۔ اس طرح بہت سے لوگوں کا ضمیر خرید لیا گیا اور بہت سے اصول کے پختہ جن کے سر اٹھے ہی رہے ان کے سر اور جسم میں جدائی پیدا کر دی گئی اور اگر یہ حربہ خطرناک معلوم ہوا تو شہد کا ایسا جام جو لب تک پہنچتے ہی موت کی میٹھی نیند سلا دے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عوام نے یہ سوچنا موقوف کر دیا کہ ہو کیا رہا ہے اور بہت سے لوگوں نے جب کچھ سوچا تو ان لوگوں کے انجام کو دیکھا جو اس کے پہلے کچھ سوچ کر اختلاف کا اظہار کر چکے تھے کہ آج صفحۂ ہستی ان کے نقش وجود سے خالی ہے۔ اس طرح جراتِ اظہار ختم ہوئی۔

یہی دو چیزیں ایسی تھیں جن کو از سرِ نو پیدا کرنے کا بیڑا اٹھا کر حضرت امام حسینؑ میدان میں آئے۔ آپ نے سوچا کہ قوتِ احساس کیونکر پیدا کی جائے؟ اس کے لیے ایک حاذق طبیب کی طرح مرض کے سبب پر غور کرنے کی ضرورت تھی۔ آخر مسلمانوں کی اس بے حسی کا سبب کیا ہے؟ کیا یہ واقعی مسلمان نہیں رہے؟ دیکھا تو اب بھی لوگ اسلام کو مانتے ہیں اور اپنے کو مسلمان کہنا فخر سمجھتے ہیں مگر ان کے احساساتِ اسلامی پر غشی چھا گئی ہے جیسے کوئی آدمی بیہوش ہو جائے تو اس میں نفس کی آمد و شد قائم رہتی ہے جو زندگی کا پتہ دیتی ہے مگر آثارِ زندگی مفقود ہوتے ہیں احساس اور حرکتِ ارادی دونوں چیزیں گم ہوتی ہیں۔ اسی طرح اس وقت جامعۂ اسلامیہ میں کلمۂ توحید کے نفس کی آمد و شد ہے جو ان کے ظاہری طور پر اسلام کی دلیل ہے مگر اسلامی روح کام کچھ نہیں کر رہی ہے اور احساساتِ اسلامی فنا ہو گئے ہیں۔ ہر ایک کو معلوم ہوگا کہ جب کسی کو غش آ جاتا ہے تو اس کے چہرے پر چھینٹا دیا جاتا ہے۔ جتنی گہری بے ہوشی ہو اتنا ہی تیز چھینٹا دیا جائے گا۔ امام حسینؑ

نے بس یہ چاہا کہ مسلمانوں کے بیہوش احساسات پر ایک ایسا تیز چھینٹا دے دیں جس کے بعد وہ پھریری لے کر آنکھ کھول دیں اور گھبرا کر یہ دیکھنے لگیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ یہ بھی قابلِ غور امر تھا کہ اس بیہوشی کا سبب کیا ہے؟ یقیناً اس کا سبب یہ تھا کہ وہ جماعت جو تعلیماتِ اسلامی کو مٹا رہی ہے اگر صاف صاف کوئی غیر مسلم جماعت ہوتی تو مسلمان جلدی سے چونک پڑتے لیکن وہ جماعت جو اس وقت تعلیماتِ اسلام کو برباد کر رہی ہے اپنے چہرہ پر اسمی و رسمی اسلام کی نقاب ڈالے ہوئے تھی اور مسلمانوں کی جماعت میں داخل تھی اس لیے مسلمان بیدار نہیں ہوتے تھے۔ حضرت امام حسینؑ نے یہ ارادہ کر لیا کہ اپنی مقابل جماعت کے چہروں سے اسلام کی اس نقاب کو اتار کر پھینک دیں اور دنیا کو دکھلا دیں کہ اس نقاب کے پیچھے کیسے لوگ چھپے ہوئے ہیں اور یہ کہ ان کو اسلام سے حقیقتاً کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس طرح ایک تو موجودہ مسلمان ان سے بیزار ہو جائیں گے اور ان کے خلاف انقلاب پیدا کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے، دوسرے بعد میں مسلمانوں کے لیے ان کے افعال سند نہ رہیں گے۔ جب مسلمانوں کو ان کے اسلام کی صحیح تصویر معلوم ہو جائے گی تو مسلمان دھوکا کھا کر ان کے دام میں نہ پھنس سکیں گے۔ نیز غیر مسلم دنیا کے سامنے اسلام کی جانب سے صفائی پیش ہو جائے گی۔ اگر بنی امیہ کے اوصاف و اخلاق کو اسلام کے خلاف پیش کیا جائے گا تو مسلمانوں کی گردنیں جھکیں گی نہیں بلکہ حسینؑ بن علیؑ کا کردار مسلمانوں کے سر کو بلند کرے گا کہ اگر یزید کے افعال کو اسلام سے کوئی تعلق ہوتا تو پیغمبرِ اسلامؐ کا نواسا اپنے کو خطرہ میں کیوں ڈال دیتا۔ یہی مقاصد وہ تھے جو تمام و کمال مادی جنگ سے حاصل نہ ہو سکتے تھے۔ مادی جنگ سے جو فتح حاصل ہوتی ہے اس سے افراد و اشخاص قتل ہوتے ہیں مگر ذہنیت قتل نہیں ہوتی۔ سلطنتوں میں انقلاب ہو سکتا ہے مگر افرادِ جامعہ کے احساسات میں انقلاب نہیں ہوتا۔ حسینؑ بن علیؑ اشخاص کو قتل کرنے نہیں اٹھے تھے۔ یزید کو ہلاک کرنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ تو یزیدیت کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ ہو سکتا تھا کہ یزید ختم ہو جاتا اور اس کے تمام عمّال اور فوجی افسر بھی ہلاک ہو جاتے پھر بھی یہ نہیں سمجھا جا سکتا

تھا کہ یزیدیت ختم ہو گئی اور یزیدی مسلک فنا ہو گیا۔ ذہنیت دنیا کی جب ماؤف تھی تو اگر عسکری طاقت لے کر جنگ کرتے تو جو اسکی واقعی حیثیت تھی اس کے سمجھنے والے بہت کم ہوتے، اور یہ سمجھنے والے زیادہ ہوتے کہ حکومت وسلطنت کی غرض سے دو بادشاہوں کی جنگ ہے اور سیاسی حیثیت سے یزید کا پلہ گراں رہتا اس لیے کہ وہ بادشاہ تسلیم کیا جا چکا تھا۔ اس صورت میں اگر آپ کو فتح حاصل بھی ہوتی جو گزشتہ اسباب کی بناء پر بظاہر غیر ممکن تھی تو اس کا اثر ایک وقتی انقلاب سلطنت کی صورت سے ہوتا جس کا نتیجہ دیرپا نہ ہوتا اور بنی امیہ پر جو ظاہری اسلام کا پردہ تھا وہ اسی طرح پڑا رہتا اور اگر کچھ لوگ حسینؑ کو حق پہ سمجھتے بھی ہوتے تو فریق محارب کو خطاء اجتہادی کی سند دے دیتے جیسا کہ اس سے پہلے صفین کی جنگ کے متعلق ہو چکا تھا۔ اس صورت میں بنی امیہ کے باطنی حالات کا اس درجہ انکشاف کہ جو ان سے ہمدردی کا کوئی گوشہ انسانیت کے دل میں باقی نہ رکھے ہرگز نہیں ہو سکتا تھا اور جب تک ان سے نفرت انتہائی درجہ پر پیدا نہ ہوتی اس وقت تک ان امتیازات واقدار کی مکمل شکست نہیں ہو سکتی تھی، جنھیں بنی امیہ نے عملی طور پر قائم کرنا چاہا تھا۔

اگر امام حسینؑ طاقت کے ذریعہ سے یزید کی طاقت کو شکست دیتے تو پھر بھی دنیا اس چیز کو نہ سمجھتی کہ حقانیت اور حکومت دو الگ چیزیں ہیں۔ حسینؑ بن علیؑ کی فتح ویسی فتح سمجھی جاتی جو بادشاہوں کی فتح ہوتی ہے۔ یعنی اگر آپ یزید کو شکست دے کر سلطنت پر قابو حاصل کر لیتے تو آپ کی سلطنت کو دنیا سلطنت ہی سمجھتی اسلام کی حقیقت نہ سمجھتی۔ حالانکہ "تاریخی حالات بتلاتے ہیں کہ اس طرح کی مکمل فتح آپ کو کبھی حاصل ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ بڑی سے بڑی مادی کامیابی بھی آپ کی محدود حیثیت رکھتی، یعنی اس صورت میں کہ جب کوفہ میں حالات سازگار ہوتے اور سب لوگ آپ کی حکومت تسلیم کر لیتے تو زیادہ سے زیادہ وہی ہوتا جو حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کو وقت سے مجبور ہو کر کرنا پڑا تھا یعنی عراق وحجاز وغیرہ کی حکومت امام حسینؑ کے پاس اور شام کی حکومت یزید کے پاس ہوتی۔ دونوں طرف کی

حکومتوں میں مقابلہ ہوتا اور مسلمانوں کی طاقتیں آپس میں لڑ کر پاش پاش ہوتی رہتیں۔ مگر امام حسینؑ ایسی کامیابی حاصل کرنا چاہتے تھے جو نہ باعتبار حدود مملکت محدود ہو اور نہ باعتبار حدود زمانہ محدود۔

ممکن ہے یہ سوال اٹھایا جائے کہ حسینؑ کے واقعۂ شہادت کے بعد بھی تو بہت سے سلاطین انہی افعال کے مرتکب ہوتے رہے جن کا یزید ارتکاب کرتا تھا مگر یاد رکھنا چاہیے کہ حسینی مقاومت نے اسلام کے تمدن واصول کو اتنا نمایاں کر دیا کہ اب اس کے خلاف جو افعال ہوتے ہیں وہ انفرادی اور شخصی جرائم کی حیثیت رکھتے ہیں اور انھیں آئینی اور مذہبی درجہ نہیں حاصل ہوتا یعنی یہ خطرہ اب ہمیشہ کے لیے دور ہو گیا ہے کہ انہی کو اسلام کا مستقل اصول اور طریق معاشرت سمجھ لیا جائے کیونکہ امام حسینؑ نے اسلام کی آئینی عظمت کا نہ مٹنے والا نقش قائم کر دیا ہے۔

گزشتہ بیانات سے صاف ظاہر ہو گیا کہ حسینؑ بن علیؑ کے لیے اپنے مقصد کے حصول کا صرف ایک ہی ذریعہ تھا اور وہی جسے انھوں نے اختیار کیا اور اس کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ نہ تھا۔

آپ اس راستے میں موت کے استقبال پر ہمیشہ سے تیار تھے جو آپ کے الفاظ اور مخاطبات سے ظاہر تھا۔

چنانچہ مکہ سے روانگی کے وقت اپنے خطبہ میں آپ نے ارشاد کیا کہ "موت انسان کی گردن سے اسی طرح وابستہ ہے جیسے گلوبند جوان عورت کی گردن سے،" بادی النظر میں تو آپ کو اس سے صرف اتنا ظاہر کرنا مقصود تھا کہ انسان کے گلے میں موت کا پھندا پڑا ہوا ہے اور بہرحال اس کو ایک نہ ایک دن اس دارِ فانی سے رخصت ہونا ہے مگر آپ نے اس تلخ حقیقت کا کچھ ایسے دلکش انداز سے تذکرہ فرمایا ہے جس سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک موت کوئی ناگوار شے نہیں بلکہ حسین و دیدہ زیب چیز ہے۔ یہ عام قاعدہ ہے کہ انسان کی جیسی ذہنیت ہوتی ہے۔ ویسے ہی الفاظ اس کی زبان پر آتے ہیں۔ چونکہ حسینؑ اس گھرانے کے ایک فرد تھے جس کے افراد عمومی حیثیت سے موت کو کبھی خاطر میں لاتے ہی نہیں تھے اور آپ کے پیش نظر بقائے

حقانیت کا اہم ترین مقصد بھی تھا لہٰذا آپ کے تاثرات اس بارے میں بہت زیادہ قوی تھے۔

چنانچہ مکہ سے روانگی کے بعد پہلی ہی منزل پر جب آپ کی فرزدق شاعر سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے کوفہ کی حالت آپ سے بیان کی کہ "لوگوں کے دل تو آپ کی طرف ضرور ہیں مگر تلواریں ان کی بنی امیہ کے ساتھ ہونگی" تو آپ نے فرمایا۔ "تم سچ کہتے ہو، لیکن ہر بات خدا کے ہاتھ میں ہے اور وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور ہر دن وہ ایک نیا کرشمہ قدرت کا دکھاتا ہے۔ خدا کی تقدیر اگر ہماری خواہش کے مطابق ہوئی تو ہم خدا کی حمد کریں گے اور ادائے شکر کے لیے اسی سے مدد کے طالب ہوں گے اور قضائے الٰہی ہمارے سدِ راہ ہوئی تو انسان کے لیے یہی کیا کم ہے کہ اس کی نیت میں سچائی اور اس کے ضمیر میں پارسائی کا خیال باقی رہے۔" [1]

عراق کے راستے میں حُر کے ساتھ جو آپ کی گفتگو ہوئی تھی وہ بھی آپ کے اسی مستقل نظریہ کے ماتحت تھی یعنی یہ کہ حُر نے کہا کہ میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں آپ اپنے اوپر رحم کریں اس لیے کہ اگر آپ نے جنگ کی تو آپ یقیناً قتل کر دیے جائیں گے اور آپ تباہ ہوں گے۔ تو آپ نے جواب دیا کہ تم مجھے موت سے ڈراتے ہو؟ کیا تم اس سے زیادہ کچھ کر سکتے ہو کہ مجھے قتل کر ڈالو؟

اس کے بعد آپ نے قبیلۂ اوس کے ایک شاعر کا یہ شعر پڑھا کہ ؎

سامضی وما بالموت عار علی الفتیٰ　　اذا ما نوی حقاً وجاھد مسلما

"میں اپنے ارادہ پر قائم رہوں گا اور موت سے دوچار ہونے میں جوانمرد کے لیے کوئی عار و ننگ نہیں ہے جب کہ اسکی نیت میں سچائی ہو اور وہ راہِ حق میں جہاد کر رہا ہو۔" [2]

یہ بظاہر عجیب چیز ہے۔ انسانی نگاہ میں آخری اور انتہائی انجام قتل ہونا ہے لیکن حضرت امام حسینؑ فرماتے ہیں کہ "کیا اس سے زیادہ تم کچھ کر سکتے ہو کہ مجھے قتل کر ڈالو۔" یعنی آپ قتل ہونے کو ایک درمیانی منزل قرار دیکر آخری معیارِ فتح و شکست کا کچھ اور قرار دے رہے ہیں۔

---

[1] ارشاد ص۲۲۸ [2] ارشاد ص۲۳۶-۲۳۷

ذوحسم ہی کے مقام پر جب حُر کا لشکر امام کی مزاحمت کے لیے آچکا ہے تو حضرت نے اپنے اصحاب کے سامنے خطبہ ارشاد کیا جس میں حمد و ثنائے باری کے بعد فرمایا:-

"صورتِ حال جو پیش آئی ہے وہ تم دیکھ رہے ہو اور یقیناً دنیا کا رنگ بدل گیا ہے اور اس کی نیکی رخصت ہو چکی ہے اور اس میں کچھ رہ نہیں گیا ہے سوائے تھوڑے حصّہ کے جو پانی بہنے کے بعد برتن میں بچ رہتا ہے اور ایک پست زندگی مثل زہریلی گھاس کے کیا تم نہیں دیکھتے کہ حق پر عمل نہیں ہوتا اور باطل سے علیحدگی نہیں اختیار کی جاتی اس صورت میں مومن یقیناً خدا کی ملاقات کا آرزومند ہوتا ہے۔ میرے نزدیک تو موت کی صورت میں شہادت کی سی نعمت ہے اور زندہ رہنا ان ظالموں کے ساتھ وبالِ جان ہے۔" [1]

اسی کے ساتھ، آپ نے حکام اور عوام کے حقوق و فرائض کے حدود قائم کر لیے اور بتایا کہ حکومت عوام کی ذہنی و عملی ترقی اور دین کے احکام نافذ کرنے کے لیے ہے اور وہ اس وقت تک قابلِ احترام ہے جب تک عوام کی زندگی کو اس سے فائدہ پہنچ رہا ہو۔ ایک موقع پر آپ نے حاکم کے اوصاف ان الفاظ میں بیان فرمائے۔ "حاکم کے لیے ضروری ہے کہ اسلامی دستور پر چلتا ہو۔ عدل و انصاف سے پیش آتا ہو۔ حق کا پابند ہو اور رضائے الٰہی میں اپنے نفس کو مقیّد کیے ہوئے ہو۔" [2] اور جس حکومت کے خلاف آپ احتجاج کرتے رہے اس کے طرزِ عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے کئی بار اظہارِ خیال کیا۔ حُر کے لشکر کے سامنے آپ نے فرمایا "رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ جو ظالم بادشاہ کو دیکھے کہ وہ عہدِ خدا اور سنتِ رسولؐ کی مخالفت کر رہا ہے اور بندگانِ خدا کے ساتھ ظلم و تعدی سے پیش آتا ہے اور وہ قول یا فعل سے اس ظالم کو نہ روکے تو خدا اسے بھی اس چیرہ دست بادشاہ کے زمرہ میں شمار کرے گا۔ دیکھو موجودہ حکومت شیطان کی حلیف بن گئی ہے اور خدا کی فرماں برداری سے روگردانی کر رہی ہے۔

---

[1] طبری ج ۶ ص۲۲۹ [2] ارشاد ص۲۱

فتنہ وفساد برپا کر رکھا ہے اور حدود و آئین کو بے کار بنا دیا ہے۔ ملک کے سارے سرمایہ کو اپنی ملکیت بنا لیا ہے۔"

عمر سعد کے لشکر سے خطاب کر کے فرمایا۔ تم دیکھتے نہیں کہ حکومت حق پر عمل نہیں کر رہی ہے اور باطل سے باز نہیں آتی۔ یہ وہ وقت ہے کہ مومن کو موت کی تمنا کرنا چاہیے۔ میں تو اس ماحول میں موت کو اپنے لیے آسودگی اور نیک بختی اور ظالموں کے ساتھ زندگی کو سراسر تکلیف سمجھتا ہوں۔"

شبِ عاشور کے خطبہ میں اعوان و انصار کو مخاطب کر کے فرمایا "میں باعزت مر جانے کو زندگی سمجھتا ہوں اور ذلت کی زندگی بسر کرنے کو موت خیال کرتا ہوں۔"

کربلا میں روزِ عاشور کے خطبہ میں آپ نے فرمایا "خدا کی قسم میں ذلت کے ساتھ اپنے کو تمھارے قبضہ میں نہ دوں گا اور نہ غلاموں کی طرح تمھارے سامنے سے بھاگوں گا۔" یہ تھا بہادری اور جانبازی کی موت کا اعلان۔

پھر ارشاد کیا :۔

"میں پناہ مانگتا ہوں ایسے ہر شخص سے جو نخوت و غرور رکھتا ہو اور روزِ قیامت پر ایمان نہ رکھتا ہو[1]۔ موت عزت کے ساتھ بہتر ہے اس زندگی سے جو ذلت کے ساتھ ہو۔" پہلے فقرہ میں جبار و سرکش یزید کے جبروت سلطنت کی تحقیر ہے اور دوسرے فقرہ میں اس کی تشریح ہے کہ مادی طاقت کے آگے بلند مقاصد کے خلاف سر جھکا دینا عزتِ انسانی کے خلاف ہے اور اس زندگی سے جو اس طرح ہو موت بہتر ہے۔

---

[1] ارشاد ص۲۴۵

ستر ھواں باب

حرمِ رسولؐ سے سفر او رمِ خدا میں پناہ

ولید سے گفتگو کے بعد وہ وقت آگیا کہ ب امام نے مدینہ کو ترک کرنا ہی اپنے لیے ضروری سمجھا۔ یہ خیال کرنا کہ آپ مدینہ ہی میں قیام ذ تے تو مدینہ والے آپ کی حفاظت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے، تاریخ کے مسلسل واقعا سے بیخبری یا ان کے نتائج سے غفلت کا مظاہرہ ہوگا۔

وفاتِ رسولِ خداؐ کے بعد ہی سے مد پر کچھ ایسے اثرات چھائے ہوئے نظر آتے ہیں جن کی بنا پر یہ توقعات غلط ثابت ہو ہیں۔

آخر یہ مدینہ ہی تو تھا جہاں وفاتِ رسو خداؐ کے بعد ہی حضرت فاطمہ زہراؑ پر مصائب کی یورش تھی مگر اہلِ مدینہ کی طرف سے ان کے ساتھ ہمدردی کا کوئی مظاہرہ کہیں تاریخ میں نظر نہیں آتا۔

پھر وہ مدینہ ہی تھا جہاں حضرت علیؑ نے ناگوں دلشکن حالات کا پچیس برس تک مقابلہ کیا مگر اہلِ مدینہ نے ان کے ساتھ کسی بھ بت و غم خواری کا ثبوت نہیں دیا۔

اس کے بعد اسی مدینہ میں وہ موقع آنکھ ں کے سامنے آیا کہ حضرت امام حسنؑ کے جنازہ کو روضۂ رسولؐ پر لے جانے میں مزاحمت کی ی مگر مدینہ کے لوگوں نے ذرہ بھر بھی اس پر احتجاج نہیں کیا۔ کیا یہ واقعہ ایسا اہم نہ تھا کہ یہ کے جسم میں اگر روح ہوتی تو اس میں حرکت پیدا ہوتی اور کسی قسم کے احساس کا مظاہرہ کیا جاتا؟

یہ تو کربلا کے پہلے کے کچھ نمونے ہیں اد ود سنہ ۶۱ھ میں حیرت انگیز مگر ناقابلِ انکار صورت

سے اہلِ مدینہ کی خاندانِ رسولؐ کے بارے میں بے حسی کا ثبوت یہ ہے کہ حضرت امام حسینؑ جب شہید ہو گئے اور آپ کے دردناک مصائب و مظالم کا تفصیل اہلِ مدینہ کو حال معلوم ہو گیا تب بھی اہلِ مدینہ نے خونِ حسینؑ کے انتقام کے لیے کسی بے چینی کا مظاہرہ نہیں کیا اور باوجودیکہ عراق میں تلاطم ہو رہا تھا حجاز اس بارے میں بالکل خاموش تھا۔

وہ تو امام حسینؑ کی قربانی کا طبعی اثر تھا کہ یزید کی بداعمالیوں پر نگاہیں متوجہ ہو گئیں اور پھر دوسرے سال یزید کے افعال و اعمال کے تفصیلی حالات معلوم ہونے کے بعد انھوں نے اعلانِ مخالفت کر دیا جس کے نتیجہ میں واقعۂ حرّہ ظہور پذیر ہوا جسکی اجمالی تفصیل اپنے محل پر بعد کو آئے گی مگر خود قتلِ حسینؑ کا جرم ان کو اتنا اہم معلوم نہ ہوا کہ وہ اسکی بنا پر یزید کے مقابلہ کے لیے کھڑے ہو جاتے۔

پھر اس کے بعد واقعات کا ایک طویل سلسلہ ہے جس میں سادات بنی فاطمہ پر بنی امیہ کے آخری دم تک اور پھر بنی عباس کے دورِ حکومت میں کیسے کیسے ہولناک مظالم ہوتے رہے مگر اہلِ مدینہ نے کبھی ان کی کوئی امداد نہیں کی۔ حضرت امام زین العابدینؑ سے لے کر امام علی نقیؑ تک تمام وہ مقدس ہستیاں جو اپنے وقت میں خاندان رسولؐ کی چشم و چراغ اور تعلیماتِ اسلام کی محافظ تھیں اپنے اپنے ابتدائی دورِ حیات میں اسی مدینہ میں مقیم تھیں۔ پھر یہیں کسی کو زہر دیا گیا۔ کسی کو مقید کر کے جلا وطن کیا گیا۔ کسی کو بجبر مدینہ سے بلایا گیا مگر کیا کبھی مدینہ نے ان کی حفاظت کی کوشش تو درکنار اس پر اُف بھی کی؟ کبھی نہیں۔

کیا ان ماقبل اور بعد کے واقعات کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد پھر یہ تصور صحیح ہوگا کہ امام حسینؑ مدینہ میں قیام فرماتے تو مدینہ والے آپ کی حفاظت میں جان لڑا دیتے؟ ہرگز نہیں۔

عام طور سے اہل حجاز کے متعلق [illegible] کی گئی کردہ مشکلات [illegible] [illegible] رہ گئے ہیں۔ چنانچہ سبب مسادیہ نے ابن الزبیر [illegible] سرب مخالف

کے متعلق رائے دریافت کی اور اس میں اہلِ حجاز کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا "فتنہ انگیزی میں سب سے آگے مگر اس کے نتائج کے برداشت کرنے میں بہت کمزور اور مہمات کے سر کرنے میں ناکارہ"[1]

اس صورت میں حالات اور بعد کے واقعات بتلاتے ہیں کہ اگر امام حسینؑ عاقبت اندیشی کر کے مدینۂ رسولؐ کو خالی نہ کر دیتے تو مروان جس نے ولید کو قتلِ حسینؑ کا مشورہ دیا تھا اور ولید کے اس مشورہ پر عمل نہ کرنے سے سخت برہم ہوا تھا وہی ولید کے ملائم طرزِ عمل کی اطلاع یزید کو دیتا اور اس وقت یزید کا عتاب نامہ ولید کے پاس آتا تو یا تو خود ولید ہی کو پھر عمر سعد کی طرح باوجود اپنے ضمیر کی مخالفت کے مال و جاہِ دنیا کی طمع اور سطوتِ حکومت کے خوف سے حسینؑ کے خلاف اقدام کرنا پڑتا یا کوفہ کے نعمان بن بشیر کی طرح اسکو معزول کر کے مروان بن الحکم یا اسی کے مثل کسی دوسرے سفّاک اور سخت ترین دشمنِ اہلِ بیت کو مدینہ کا حاکم مقرر کیا جاتا اور فرزندِ رسولؐ کے خون سے مدینۂ رسولؐ کی زمین کو گلرنگ بنا دیا جاتا۔

یہ خطرہ بالکل یقینی تھا اور اس نے فعلی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اس خط سے جو ولید نے یزید کے نام لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ "خلیفۃ المسلمین یزید کی خدمت میں ولید بن عتبہ کی جانب سے گزارش ہے کہ حسین بن علیؑ آپ کی خلافت کو تسلیم نہیں کرتے اور نہ وہ آپ کی بیعت پر تیار ہیں۔ اب آپ کی جو رائے ہو۔" اس کے جواب میں یزید نے لکھا کہ "اس میرے خط کی تعمیل جلد کرنا کہ تمام ان ممتاز افراد کی جنھوں نے میری بیعت کر لی ہے اور جنھوں نے بیعت نہیں کی ہے مکمل فہرست جلد بھیجو۔ لیکن اس جواب کے ساتھ حسین بن علیؑ کا سر موجود ہو۔" اس حکم کی گرمی کے مقابلہ میں ولید کہاں ٹھہر سکتا تھا؟ وہ تو اتفاق سے اس خط کے آنے سے پہلے ہی حضرت حسینؑ مدینہ سے روانہ ہو چکے تھے اس لیے ولید تعمیلِ حکم سے مجبور رہا۔ مگر اس کے بعد بھی ولید معتوب ہونے سے نہیں بچا اور ماہ رمضان میں اسے معزول کر کے عمرو بن سعید ہی کو جو ابھی تک حاکمِ مکہ تھا مدینہ کا بھی حاکم مقرر کر دیا گیا۔[2]

---

[1] کتاب البلدان صفحہ ۲۵ [2] طبری ج ۶ صفحہ ۱۱ و ۱۲۶

پھر اگر حضرت امام حسینؑ مدینہ میں شہید ہوتے تو کیا آپ کی شہادت اسی نمایاں حیثیت کے ساتھ ہوتی جس طرح کربلا جاکر ہوئی؟ سیاستِ حکومت کا یہ تقاضا ہرگز نہ ہوتا بلکہ اسے طرح طرح کے لباس پہنائے جاتے۔ یا تو امام حسنؑ کی شہادت کی طرح کوئی "جعدہ بنت اشعث" فراہم کی جاتی یا حضرت علیؑ کی طرح کوئی "ابن ملجم" کی طرح کا خارجی جس کے بعد بھی حکومتِ دمشق کا دامن اس الزام سے بری ہی ثابت کیا جاتا۔ اس صورت میں حسینؑ واقعی قتل ہوتے یعنی وہ دنیا سے جاتے بھی اور سلطنت دمشق کے چہرہ پر اسلام و انسانیت کی نقاب پھر بھی پڑی رہتی۔

حضرت امام حسینؑ اس کے لیے ہرگز تیار نہ تھے۔ تدبّر کا اقتضاء تھا کہ مدینہ میں قیام اسی وقت کیا جاتا جب مدینہ میں قیام ممکن ہو اور جب بیعت نہیں کرنا تھی تو اپنے اصول اپنے مقصد اور اپنی قربانی کو اسی افق پر لے جاکر پیش کرنا چاہیے تھا جس پر آپ کربلا کے میدان میں انھیں لے جاسکے۔ بے شک یہ سفر کوئی معمولی سفر نہ تھا۔ وہ کربلا کی منزل کا پہلا مرحلہ یا آخرت کے سفر کا پہلا قدم تھا اس لیے یہ رات حضرت امام حسینؑ نے پوری جاگ کر بسر کی اور اسے اپنے نانا (حضرت رسولِ خدا) ماں (حضرت فاطمہ زہراؑ) اور بھائی (حسن مجتبیٰؑ) کے مقدس مزارات سے رخصت ہونے میں صرف کیا۔

رات ختم نہ ہوئی تھی کہ آپ مدینہ سے روانہ ہوگئے۔ مدینہ کی صبح آج بے رونق تھی۔ اس لیے کہ حقیقی آفتاب اس کا آنکھوں سے اوجھل ہوچکا تھا اور رسولؐ کی قبر بے چراغ تھی۔ اس لیے کہ رسولؐ کا نورِ دیدہ آج صحرائے غربت میں گامزن تھا۔

۶۰ھ ماہ رجب کی اٹھائیس تاریخ تو منگل کی رات تھی جب امام حسینؑ مدینہ سے روانہ ہوئے[1]۔ اس وقت آپ کی زبان پر قرآن کی یہ آیت تھی[2] فخرج منها خائفا يترقب قال رب نجنی من القوم الظالمين[3] اس آیت میں حضرت موسیٰؑ کا ذکر ہے اس وقت کا جب وہ فرعون کے ظلم و تشدد سے بیزار ہوکر مصر سے باہر نکلے ہیں۔ روانگی کے بعد امام حسینؑ شاہراہِ عام سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ حالانکہ ابن زبیر اس کے پہلے شاہراہِ عام

۱؎ طبری ج ۶ ص ۱۹۰ و ۲۱۶۔ ارشاد ص ۲۰۱ ۲؎ طبری ج ۶ ص ۱۹۱ ۳؎ قرآن مجید سورہ قصص آیۃ ۲۱

کو چھوڑ کر غیر معروف راستوں سے مکّہ کی طرف روا[نہ] ہو چکے تھے۔ یہی مشورہ آپ کو بھی دیا گیا مگر آپ اپنی مدینہ سے روانگی کو فرار کی حیثیت دی[نے] پر تیار نہیں تھے۔ آپ نے اس مشورہ پر عمل کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ نہیں، میں تو اسی را[ستہ] سے جاؤں گا۔ پھر خدا کو جو منظور ہو[1]۔ آپ نے اپنے دادا ابوطالب کی تمام اولاد کو ا[پنے] ساتھ لیا جن میں آپ کی دو بہنیں حضرت زینب اور ام کلثوم بھی تھیں۔ اس کے علاوہ سب [...]ی بھتیجے اور متعلقین آپ کے ساتھ تھے۔ سوا محمد بن الحنفیہ کے[2] جو کسی مجبوری یا مصلحت [...]ے مدینہ میں چھوڑ دیے گئے اور ام ہانی بنت ابوطالب پیرانہ سالی کی وجہ سے نہ جا سکی[...]ں۔ بس ان کے علاوہ اولادِ ابوطالب میں سے کوئی بھی حسینؑ سے جدا نہیں ہوا اور [...] ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حسینؑ کے ساتھ بنی ہاشم میں سے سوا اولادِ ابوطالب کے کسی اور س[لس]لہ کا ایک شخص بھی میدانِ کربلا میں نظر نہیں آتا۔

اس طرزِ عمل سے بھی کہ آپ نے صرف اپنے [گھر] والوں کو ساتھ لیا صاف نمایاں تھا کہ آپ جنگ کے ارادہ سے روانہ نہیں ہو رہے ہیں۔ مدینہ [س]ے باہر نکلنے کے بعد امام حسینؑ نے مکہ معظمہ کی طرف رخ کیا۔ اس لیے کہ مکہ میں عرب کے قدیم ر[وا]یات اور نیز اسلام کے مخصوص تعلیمات کی بنا پر کسی جانور تک کا قتل بلکہ گھاس تک کا بھی اک[ھا]ڑنا جائز نہیں[3]۔ امام حسینؑ نے یہاں پہنچ کر اپنے کو ظاہری طور سے ایک محفوظ آغوش کی پناہ میں [...] دیا اور یہاں [...] کہ آپ [...] گوشی کی زندگی گزارنے لگے۔ نہ امورِ سلطنت سے غرض اور نہ مہا[...] ملکی سے کوئی تعلق۔ آپ نے مکہ پہنچ کر بھی نہ کہیں خطوط و رسائل روانہ کیے اور نہ مختلف اطراف [و] جوانب کے لوگوں کو اپنی نصرت کی طرف دعوت دی۔ یہ بھی آپ کے مقصد کے تعیّن کے [...] آپ کے کردار کا ایک اہم جزء ہے۔

آپ کا مکہ میں ورود شب جمعہ ۳ شعبان ۶۰ھ کو ہ[وا][4] اس وقت آپ کی زبان پر قرآن کی یہ آیت تھی[5] ولما توجه تلقاء مدين قال عسى ربي ان يهديني سواء السبيل[6]۔ یہ بھی حضرت موسیٰ کے واقعہ سے متعلق ہے جب انھوں نے مدین میں پناہ لی تھی۔

۱؎ طبری ج ۶ ص ۱۹۶ ۲؎ الاخبار الطوال ص ۲۲۳، طبری ج ۶ ص ۱۹ ۳؎ صحیح بخاری ج ۲ ص ۴۲ صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۳۸ و ۴۳۹ ۴؎ طبری ج ۶ ص ۲۱۵۔ ارشاد ص ۲۰۸ ۵؎ طبری ج ۶ ص ۲۲۲ ۶؎ قرآن مجید سورۂ قصص آیۃ ۲۲

آپ نے مکہ میں پہنچ کر شعبِ علیؑ میں قیام کیا۔ عبداللہ بن زبیر آپ سے دو ایک دن پہلے پہنچ چکے تھے۔ ان کے مکہ میں اچانک پہنچنے کے ساتھ لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے تھے اور انھیں ایک مرکزیت سی حاصل ہوگئی تھی لیکن حضرت امام حسینؑ کے مکہ میں پہنچنے کے ساتھ لوگوں نے عبداللہ بن زبیر کو چھوڑ دیا اور اب وہ حضرت امام حسینؑ کے گرد و پیش رہنے لگے۔ اس بات سے عبداللہ بن زبیر کو کچھ ناگواری پیدا ہوئی اور انھیں اندازہ ہو گیا کہ حسینؑ کی موجودگی میں ان کا کوئی اثر قائم نہیں ہو سکتا۔ مصلحتِ وقت کی بنا پر وہ بھی صبح و شام دونوں وقت امام حسینؑ کے پاس آنے جانے لگے[1]

جب معاویہ کی وفات ہوئی ہے تو مدینہ میں ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کی حکومت تھی اور مکہ میں یحییٰ بن حکیم بن صفوان بن امیہ اور کوفہ میں نعمان بن بشیر انصاری اور بصرہ میں عبیداللہ بن زیاد گورنر تھا[2]

معلوم ہوتا ہے کہ حکومتِ دمشق کو یحییٰ بن حکیم پر اطمینان نہ تھا چنانچہ حضرت امام حسینؑ کے مکہ میں پہنچنے کے بعد یحییٰ بن حکیم کو معزول کیا گیا اور عمرو بن سعید بن عاص بن امیہ کو گورنر مقرر کیا گیا[3] پھر جب ولید کے طرزِ عمل کی اطلاع اور شاید مروان کی طرف سے رپورٹ یزید کو پہنچی تو ولید کی بجائے بھی اسی عمرو بن سعید کو مقرر کیا گیا مگر یہ بعد کی بات ہے۔ بعد میں یہ بھی ظاہر ہوگا کہ کوفہ کے گورنر کی پالیسی بھی حکومتِ دمشق کو ناگوار ثابت ہوئی اور وہاں بھی تبدیلی کی ضرورت پیش آئی۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ امام حسینؑ کے معاملہ میں یزید کا طرزِ عمل اتنا غیر منصفانہ اور جارحانہ تھا کہ اسے اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے آدمی نہ ملتے تھے۔ اور خود اس کے گورنر اس کے احکام کی تعمیل اس کی خواہش کے مطابق نہ کر سکتے تھے۔ صورتِ حال سے ظاہر ہے کہ عمالِ حکومت میں سے جو بھی حسینؑ کے ساتھ ذرا مراعات برتنے کا رجحان ظاہر کرتا تھا وہ فوراً ہٹا دیا جاتا تھا۔ تلاش تھی ایسے لوگوں کی جو اہل بیتِ رسولؐ کے ساتھ کسی مراعات کی جگہ اپنے دل میں نہ رکھتے ہوں۔

[1] الاخبار الطوال ص۲۲۳ [2] [3] الاخبار الطوال ص۲۲۳

اس کے بعد بھی کیا کہا جا سکتا ہے کہ حضرت امام حسینؑ کے ساتھ جو کچھ بھی تشدد ہوا اس کی ذمہ داری یزید پر نہیں بلکہ عمالِ حکومت پر تھی؟

اس وقت امام حسینؑ کا مکہ معظمہ میں قیام ایک پناہ گزین کی حیثیت سے تھا اور یہی مشورہ تھا جو آپ کو مدینہ سے روانگی کے وقت آپ کے بھائی محمد حنفیہ نے دیا تھا جسے آپ نے پسند کیا تھا۔ مکہ میں حالات کے ناسازگار ہونے کی صورت میں کیا ہوگا؟ اس کے متعلق محمد بن حنفیہ کی رائے یہ تھی کہ اگر وہاں حالات آپ کے موافق نہ ہوں تو آپ نکل جایئے گا، ریگستانی صحراؤں میں اور پہاڑوں کے دامنوں میں، اور ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل ہوتے رہیے گا، یہاں تک کہ لوگوں کے حالات کا آخری نتیجہ سامنے آئے اور اس وقت کوئی قطعی رائے قائم کیجیے[1]

آپ کا قیام مکہ میں ظاہری طور پر مستقل حیثیت رکھتا تھا اور کوئی خاص مقصد آپ کے پیشِ نظر نہیں تھا۔ سوا ایک پُرامن زندگی کے جسے "جیو اور جینے دو" ہی کے لفظوں میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ یہاں آپ نے نہ تو اپنی موافقت میں کوئی عسکری طاقت فراہم کی، اور نہ جمہور کو یزید کے خلاف مشتعل کیا۔ تقریراً اور تحریراً کسی حیثیت سے بھی ایسی کوئی کوشش ثابت نہیں کی جا سکتی۔

[1] ارشاد ص۲۰۷-۲۰۸، طبری ج ۶ ص۱۶۱

اٹھارواں باب

دعوتِ اہلِ کوفہ اور سفارتِ مسلم بن عقیل

کوفہ کی داغ بیل فرات اور حیرہ کے بیچ میں اسوقت ہوئی جب ۱۴ھ سے ۱۶ھ تک قادسیہ اور دوسرے محاذوں پر ایرانیوں کے مقابلہ میں فتوحات کے بعد[1] مسلمانوں کی فوج نے عراق میں سکونت اختیار کی اور مدائن کی آب و ہوا ان کو راس نہ آئی اور سعد بن ابی وقاص کی ہدایت کے ماتحت یہ جگہ تلاش کی گئی اور یہاں مسجد اور مسلمانوں کے قیام کے لیے مکانات کی بنیاد ڈالی گئی۔[2]

۱۷ھ میں سعد بن ابی وقاص اپنی فوج کے ساتھ مدائن سے منتقل ہوئے اور اس جگہ آکر مقیم ہوئے۔

کوفہ، عربی زبان میں اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں سنگریزے اور ریگ مخلوط ہوں۔ چونکہ یہ جگہ اسی قسم کی تھی اس لیے اس کا نام کوفہ ہوا۔[3]

دوسری طرف سمندر کے کنارے اس زمین پر جو "ارض الہند" کہلاتی تھی ایک دوسرے شہر کی بنا قائم کی گئی جس کا نام بصرہ ہوا اور اس طرح عراق کے ان دونوں شہروں کوفہ اور بصرہ کی آبادی بالکل ایک ساتھ شروع ہوئی۔[4]

ابتداءً سلیٹوں کے مکان بنائے گئے اور چھپر ڈالے گئے۔ پھر اسی سال دونوں جگہ آتش زدگی واقع ہوئی جس میں یہ مکانات جل گئے تو اینٹوں کے مکانات کی تعمیر ہوئی۔[5]

کوفہ کی آبادی اسی وقت سے کہ جب وہ آباد کیا گیا ایک لاکھ فوجیوں کی تھی۔[6]

---

۱ طبری ج ۴ ص ۱۴۵
۲ طبری ج ۴ ص ۱۴۲
۳ طبری ج ۴ ص ۱۸۹
۴ طبری ج ۴ ص ۱۴۹
۵ طبری ج ۴ ص ۱۹۱
۶ طبری ج ۴ ص ۲۶۲

جب جناب امیرؑ تختِ خلافت پر متمکن ہوئے اور طلحہ و زبیر نے عائشہ کو ساتھ لے کر آپ کے خلاف فوج کشی کی تو انھوں نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز عراق کو قرار دیا اس لیے حضرت امیرؑ کو انکے تدارک کے لیے عراق آنا پڑا اور جنگِ جمل واقع ہوئی۔ اس مقابلہ میں بصرہ والوں نے طلحہ اور زبیر کا ساتھ دیا تھا اور کوفہ کے لوگ حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے ساتھ رہے۔ اس کے بعد حضرت علیؑ نے اسی کو اپنا پایۂ تخت رکھا۔

بارہ رجب ۳۶ھ کو پہلا وہ دن تھا جب آپ کوفہ میں تشریف لائے۔ لوگوں نے کہا کہ قصر میں قیام فرمائیے جہاں اب تک حاکم قیام کیا کرتے تھے۔ آپ نے اسے ناپسند کیا اور مقام رحبہ کے ایک مکان میں سکونت اختیار فرمائی۔[1]

اس کے بعد زیادہ تر اہلِ کوفہ ہی تھے جنھوں نے آپ کے ساتھ صفین اور نہروان میں بھی مخالفین کا مقابلہ کیا۔ اسی لیے وہ "شیعۂ علیؑ" کہلائے۔ حالانکہ مذہبی طور پر ان میں سے اکثر اس معنی میں شیعہ نہ تھے کہ وہ حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کو خلیفۂ بلا فصل جانتے ہوں اور آپ کے قبل دوسرے خلفاء کو تسلیم نہ کرتے ہوں۔ مگر "شیعۂ بنی امیہ" کے مقابلہ میں وہ اپنے کو "شیعۂ علیؑ" کہنا فخر سمجھتے تھے۔

یہ وہ وقت تھا کہ کوفہ ایسے شیعانِ اہل بیتؑ سے چھلک رہا تھا لیکن ادھر معاویہ کا ممالکِ اسلامیہ پر تسلط ہوا اور کوفہ پر زیاد بن ابیہ کی حکومت ہوئی ادھر اہلِ کوفہ پر مظالم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور عراق کی زمین ان کے لیے تنگ ہو گئی۔ جو لوگ محبِ علیؑ سمجھے جا سکتے تھے ان کا ہر نفس آئندہ آنے والے خطرات کی پیشین گوئی کرتا اور ہر دقیقہ و ثانیہ اپنے آخری ہونے کا پیغام دیتا تھا۔

یہ صورتِ حال دو ایک ماہ، دو ایک سال نہیں بلکہ بیس سال تک قائم رہی۔ اس صورت میں ناممکن تھا کہ کوفہ کے اندر شیعۂ علیؑ کے لیے کوئی نمایاں حیثیت حاصل رہتی بلکہ مارے جانے، سولی پانے اور جلا وطن ہونے کے بعد جو بچے کھچے تھوڑے سے اشخاص موجود تھے وہ گوشوں

---

۱ الاخبار الطوال ص ۱۵۲

کے اندر اور پردوں کے پیچھے زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے اور دوستی اہل بیتؑ کا نام بھی زبان پر لانا ان کے استحقاق قتل کی دستاویز خیال کیا جاتا تھا اور اس شکنجہ کے اندر شیعیت ایک مخصوص قلیل التعداد جماعت میں مخفی حیثیت سے مقیّد تھی اور وہ جماعت عراق و حجاز وغیرہ کے مختلف شہروں میں گمنامی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ رؤسائے عشائر اور شیوخ قبائل ذمہ وار و با اعتبار اشخاص سب حکومتِ وقت کے ساختہ و پرداختہ تھے۔ رہ گئی عام خلقت جس پر انقلابات کا دار و مدار ہوتا ہے وہ بلا استثنا ہر ملک میں "ہر کسے سکہ زند خطبہ بنامش خوانند" کے مطابق ہوا کے رخ پر اڑنے والی اور زمانہ کے غیر معمولی حوادث سے تیزی کے ساتھ رنگ بدلنے والی ہوا کرتی ہے۔ ان میں ایک ایسا اچانک واقعہ جس میں جوش پیدا کرنے کی صلاحیت ہو وہ انقلاب پیدا کر سکتا ہے جو برسوں کی دعوت و تبلیغ پیدا نہیں کرتی۔ اس کے نمونے حکومتوں کے تغیّر و تبدّل اور سلاطین کے عزل و نصب کی صورت میں ہمیشہ نظر سے گزرتے رہتے ہیں اور وہ اکثر اسی قسم کی ناگہانی صورتوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

بے شک بیس سال تک صورت حال ایک طرح رہنے کا سبب یہ تھا کہ اس مدت میں کوئی تازہ حادثہ رونما نہیں ہوا جو رجحانات طبعی سے ٹکرا کر ان کو سیلاب کی طرح کسی خاص طرف متوجہ کر سکے۔

سنہ ۶۰ھ کے رجب کا مہینہ تھا جب معاویہ نے انتقال کیا اور ان کا نامزد کردہ جانشین انکا بیٹا یزید ہوا۔ ایسے ہی مواقع وہ ہوتے ہیں جو پرسکون فضا میں تموّج اور مطمئن سطح میں تلاطم پیدا کر دیتے ہیں۔ فطرتاً ہر شخص سابق فرمانروا کے بعد اپنے جدید والئ سلطنت اور قسمت کے مالک کی سابقہ زندگی اور اس کے اخلاق و عادات اور ذاتی خصوصیات کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں لذّت محسوس کرتا ہے اور بیک وقت مختلف حلقوں میں یہی چرچے شروع ہو جاتے ہیں۔

یزید کے اخلاق و عادات، اسکی مے نوشی اور شہوت رانی، اس کی طفلانہ جوانی اور

لہو و لعب میں سرگرمی، احکام شرعیہ سے آزادی اور نفسانی خواہشوں کی پرستاری ایسی نہ تھی جو مخفی حیثیت رکھتی ہو۔

جاننے والوں کو یاد آ گیا اور انجام کا نقشہ آنکھوں میں پھرنے لگا اور نہ جاننے والوں کو پوچھ گچھ میں معلوم ہو گیا کہ ہمارا ہونے والا خلیفہ و مالک سلطنت ان صفات و عادات کا شخص ہے۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ بلا تخصیص فرقہ و مذہب ایک عام بے چینی، اضطراب اور نفرت و بیزاری خلقِ خدا میں پھیل گئی اور اسی کے ساتھ آنکھیں گردش کرنے لگیں کہ کون ہے جو اس سخت وقت پر کام آئے اور وقت کی ذمہ داریوں کو اپنے کاندھے پر اٹھا کر ملتِ اسلامیہ کو اس بدکردار خلیفہ سے چھٹکارا دلائے۔

اسی کے ساتھ یہ خبریں بھی مشتہر ہوئیں کہ حسینؑ بن علیؑ نے یزید کی خلافت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اور وہ اسی لیے مدینہ سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ آ گئے ہیں اور یہ طے کر لیا ہے کہ جو کچھ بھی ہو یزید کی بیعت نہ کریں گے۔ اس وقت دوستان علیؑ کی اس قلیل جماعت کو جو بیس برس کی طویل مدت تک طرح طرح کے صبر آزما مصائب برداشت کرتے کرتے عاجز آ چکی تھی اور ہر آن حضرت احدیت کی جانب سے کشائش کی منتظر تھی اپنی مایوسیوں کی مدت سے چھائی ہوئی تاریک گھٹا میں امید کی شعاعیں نظر آنے لگیں اور ان کے ضمیر نے آواز دی کہ اس موقع سے بہتر کوئی موقع نہ ملے گا اور اس وقت کا سکوت خودکشی کا مرادف ہوگا۔

یہ سوچ کر وہ سب سلیمان بن صرد صحابئ رسولؐ کے گھر میں مجتمع ہوئے۔ سن رسیدہ اور تجربہ کار سلیمان نے جو پیغمبرِ خداؐ کی آنکھیں دیکھے ہوئے اور حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے ساتھ معرکے جھیلے ہوئے تھے مجمع کو ان الفاظ سے مخاطب کیا:-

"آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ معاویہ کا انتقال ہوا اور امام حسینؑ نے یزید کی بیعت سے انکار کیا ہے اور وہ مکہ معظمہ پہنچ گئے ہیں۔ آپ لوگ اُن کے اور

ان کے پدر بزرگوار کے شیعہ ہیں۔ اگر آپ اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ ان کی نصرت و مدد میں اور ان کے دشمنوں سے جنگ میں کوتاہی نہ ہوگی تو بسم اللہ، ان کو خط لکھیے اور اگر سستی و کمزوری کا اندیشہ ہو تو برائے خدا ایک شخص کو فریب دے کر اس کی جان کو خطرہ میں نہ ڈالیے"۔[1]

الفاظ سے ظاہر ہے کہ سلیمان ایک مقرر کی طرح گرجتے برستے الفاظ سے وقتی جوش کو ابھار کر اپنے مقصد کو حاصل کرنا نہیں چاہ رہے ہیں بلکہ وہ خود مجمع سے اس کے موجودہ جوش و ولولہ کی آخری تھاہ اور موقع اقدام پر اس کی انتہائی کارفرمائی کا جائزہ لوانا اور اسی کے ساتھ ان کو موقع کی نزاکت اور آئندہ کے خطرات کا اندازہ کرا دینا چاہتے ہیں مگر یہ امر فطری ہے کہ جذبات کی طغیانی میں انسان کو اپنی طاقت کا اندازہ مشکل سے ہوتا ہے اور وہ اکثر عواقب کی فکر اور سخت مواقع پر اپنے ثبات و استقلال کی تشخیص میں غلطی کر جاتا ہے۔ مجمع کے اندر ان کے بڑھتے ہوئے جوش میں سلیمان کے الفاظ نے وہ کام کیا جو پانی کا چھینٹا بھڑکتے ہوئے آگ کے شعلوں میں۔ ایک مرتبہ سب بول اٹھے، نہیں، نہیں، ہم یقیناً ان کے دشمنوں سے جنگ کریں گے اور اپنے کو حضرت کے قدموں پر نثار کر دیں گے۔[2]

یہ جمعیت کتنی تھی؛ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ کسی میدان یا عالی شان قصر کے وسیع صحن میں نہیں بلکہ عربی ساخت کے مختصر مکانات میں سے جن کے نمونے آج تک عربستان میں نظر آتے ہیں ایک مکان یعنی سلیمان بن صرد کے گھر میں مجتمع ہو گئی تھی۔ پھر ان میں بھی یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ وہ سب سچے اور راسخ العقیدہ حضرت علیؑ کو وصیِ رسولؐ اور امام برحق سمجھنے والے شیعہ ہی تھے۔

مذکورۂ بالا سوال و جواب کے الفاظ میں بے شک سچائی کا جوہر نظر آ رہا ہے اور وہ یقیناً بولنے والوں کے باطنی ضمائر کی مخلصانہ ترجمانی کر رہے ہیں لیکن ان میں سے ہر شخص آنے والے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۹۷۔ ارشاد ص ۲۰۸ [2] طبری ج ۶ ص ۱۹۷

ناگہانی انقلابات کا کہاں تک مقابلہ کر سکے گا؛ اس کا فیصلہ مستقبل ہی کے ہاتھ ہے۔

سلیمان بن صرد کی حجت تمام ہو چکی تھی چنانچہ خط امام حسینؑ کے نام بایں عنوان لکھا گیا:۔

"یہ خط ہے حسینؑ بن علیؑ کی طرف سلیمان بن صرد، مسیب بن نجبہ، رفاعہ بن شداد، حبیب بن مظاہر اور دیگر دوستوں کی طرف سے مومنین و مسلمین اہل کوفہ میں سے" اس کے بعد معاویہ کے انتقال اور یزید کی ولیعہدی پر اپنے خیالات کا اظہار کیا گیا تھا۔ پھر لکھا تھا کہ ہمارے سر پر کوئی امام نہیں ہے۔ لہٰذا آپ تشریف لائیے۔ شاید آپ کی وجہ سے ہم حق کی نصرت پر یک دل ہو سکیں۔ اور دمشق کا گورنر نعمان بن بشیر دار الامارہ میں موجود ہے مگر ہم اس کے ساتھ نماز جمعہ میں شریک نہیں ہوتے۔ نہ عیدگاہ جاتے ہیں۔ اگر ہم کو خبر معلوم ہو جائے گی کہ آپ تشریف لا رہے ہیں تو ہم اس کو یہاں سے نکال کر شام جانے پر مجبور کر دیں گے۔ والسلام

اس خط کو عبد اللہ بن سبیع ہمدانی اور عبد اللہ بن وال کے ہاتھ روانہ کیا گیا اور یہ سب سے پہلا خط تھا جو امام حسینؑ کو مکۂ معظمہ میں دسویں ماہ رمضان کو ملا۔ جمعیت منتشر ہوئی اور اب ان میں سے ہر ایک نے اپنے حلقۂ اثر میں اس تحریک کو پھیلانا شروع کیا اور دو ہی دن کے عرصہ میں ۵۳ عرضداشتیں تیار ہو گئیں جو ایک دو تین چار آدمیوں کے دستخط سے تھیں اور یہ سب خطوط قیس بن مسہر صیداوی اور عبد الرحمٰن بن عبد اللہ بن کدن ارحبی اور عمارہ بن عبید سلولی کے ہاتھ روانہ کیے گئے۔[2] اسی اضطراب اور روحانی تلاطم کے سبب سے جو یزید کی خلافت کے باعث عام طور پر پیدا ہوا تھا اور جس میں کسی مذہب و مسلک کا افتراق نہ تھا۔ ان حضرات کی مذکورۂ بالا تجویز کا ہر طرف سے خیر مقدم کیا گیا اور وہ لوگ جو شیعیت کا جذبہ نہ رکھتے تھے وہ بھی خاص حضرت امام حسینؑ کے ساتھ کسی عقیدت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس خیال سے کہ یزید ایسے شرابخوار و فاسق سے آپ یقیناً بہتر ہیں۔ اس تجویز کے گرمجوشی سے موید نظر آنے لگے جس کو دیکھ کر ان افراد کو جو حقیقتاً اس تجویز کے محرک تھے یہ یقین پیدا ہو گیا

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۹۷۔ ارشاد ص ۲۰۹ [2] طبری ج ۶ ص ۱۹۷

کہ رائے عامہ ہمارے ساتھ ہے لیکن یہ فریب نظر تھا۔ عام خلقت اس تحریک سے ہمدردی میں ویسی ہی تھی جیسے آندھی کے رخ پر اڑتے ہوئے پرند۔ اس غلط فہمی کا یہ نتیجہ ہوا کہ یا تو پہلے خط کے یہ الفاظ کہ "شاید خدا آپ کے ذریعہ سے ہماری شیرازہ بندی کرے" بیم و رجا کا اظہار کرتے تھے۔ یا اب دو ہی روز کے بعد جو خط لکھا گیا اس میں پُرزور الفاظ صرف کیے جانے لگے کہ "تشریف لائیے جلد، اس لیے کہ لوگ آپ کے منتظر ہیں اور آپ کے سوا کسی کی امامت تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہیں لہٰذا جلدی کیجیے جلدی، والسلام۔" اس خط کو ہانی بن ہانی سبیعی اور سعید بن عبداللہ حنفی کے ذریعہ روانہ کیا گیا[1]

رائے عامہ کی قوت اور ہوا کے موجودہ رُخ کا اس سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ سرداران قبائل جو یزید کے خاص آدمی تھے اور جنھیں اس تحریک کے محرکین نے اپنے ساتھ نہیں لیا تھا انھوں نے بھی سیاست کا تقاضا یہی سمجھا کہ اس آواز میں آواز ملا دیں چنانچہ ان اجتماعی کارروائیوں سے علیحدہ اور اس خط کے بعد جو اپنے مضمون کے اعتبار سے بالکل آخری کہا جاسکتا ہے۔ ایک خط کوفہ سے اور لکھا گیا جس کے الفاظ یہ تھے :-

"کھیتیاں لہلہا رہی ہیں، میوے درختوں میں رسیدہ ہیں اور نالاب لبریز۔ پس جب آپ چاہیں تشریف لائیں۔ ایک ایسے لشکر کی جانب جو آپ کی امداد کے لیے بالکل آراستہ موجود ہے۔ والسلام۔"

اس پر مندرجہ ذیل سات آدمیوں کے دستخط تھے۔ شیث بن ربعی، حجار بن ابجر، یزید بن حارث، یزید بن رویم، عزرہ بن قیس، عمرو بن الحجاج زبیدی، محمد بن عمیر تمیمی[2]

یہ خط لب و لہجہ کے اعتبار سے گزشتہ خطوط سے بالکل مختلف تھا۔ ان میں اپنی دوستی و اخلاص کے اظہارات تھے اور ہدایت کی خواہش تھی۔ یہاں مادی طاقت کی پیشکش اور منافع دنیا کی نمائش تھی جو ایک طرف لکھنے والوں کی مادی ذہنیت کی ترجمان اور

---

[1] طبری ج ۶ صفحہ ۱۹۷ [2] طبری ج ۶ صفحہ ۱۹۷۔ ارشاد صفحہ ۲۱

دوسری طرف مکتوب الیہ کے مذاقِ طبیعت سے اجنبیت اور ناشناسی کی دلیل ہے۔ چنانچہ اس آخری خط کے لکھنے والے تقریباً سب کے سب واقعۂ کربلا میں حضرت امام حسینؑ سے لڑنے کے لیے موجود تھے۔ ممکن ہے کہ اس خط کے لکھنے میں کوئی خاص سازش مضمر ہو اور اگر ایسا نہیں تو اس سے اس موقع کی رائے عامہ کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو بھی یہ ضرورت پڑ گئی تھی کہ ہم بھی اس تحریک میں شامل ہوکر آئندہ کے لیے اپنے مستقبل کو محفوظ بنالیں۔ دینوری کا بیان ہے کہ یہ سب قاصد اور ان کے ساتھ کے خطوط تابڑ توڑ دو دن کے اندر امام حسینؑ کو پہنچے اور اس کے بعد چند دن میں تو خطوط کی تعداد اتنی ہوگئی کہ ان سے دو خُرجیاں بھر گئیں[1]

گزشتہ تقریر سلیمان بن صرد کی اور اس کے بعد کے واقعات ان سب کے مطالعہ سے حسب ذیل نتائج صاف طور پر برآمد ہوتے ہیں۔

۱۔ امام حسینؑ کی بیعت یزید سے کنارہ کشی اور مدینہ سے روانگی کسی خارجی تحریک اور اہلِ کوفہ کے ساتھ کسی متقدمہ گفت و شنید کا نتیجہ نہ تھی۔

۲۔ حضرت کو مدینہ سے روانگی کے موقع پر ظاہری اسباب کی بنا پر یہ خیال بھی نہ تھا کہ آپ کوفہ تشریف لے جائیں گے۔

۳۔ آپ نے مکّہ پہنچنے کے بعد بھی خود اپنی جانب سے کسی قسم کی تحریک اہلِ کوفہ سے نہیں کی اور نہ وہاں اپنے مقاصد کی تبلیغ کے لیے کوئی خط بھیجا۔

مگر اب جبکہ کوفہ سے خود یہ آوازیں بلند ہیں کہ آپ ہمارے یہاں آیئے۔ ہم آپکی نصرت و امداد کے لیے تیار ہیں۔ ہم آپ کو امام جانتے ہیں اور آپ سے ہدایت کے طالب ہیں۔ یہ دو ایک آوازیں نہیں بلکہ کوفہ بھر یہی چلّا رہا ہے۔ چاہے وہ دوست ہوں یا دشمن۔

یہاں تک کہ دو خرجیاں خطوط سے بھر گئیں جس کا ذکر پہلے ہوچکا ہے۔ اب موقع کی حالت کا تقاضا کیا ہے؟ حضرت امام حسینؑ کو ان خطوط کے بعد کیا کرنا چاہیے؟

---

[1] الاخبار الطوال صفحہ ۲۳۱

صورتِ حال یہ ہے کہ آپ یزید سے بیعت جیسا کہ اب تک نہیں کی آئندہ بھی کرنا نہیں چاہتے۔ مدینہ میں قیام یزید کے اس تہدیدی حکم کی بنا پر کہ آپ سے بیعت لی جائے یا قتل کر دیے جائیں، ناممکن ہو چکا ہے۔ مکہ معظمہ میں قیام وقتی حیثیت سے امن کا ذریعہ سہی لیکن تا بکے؟ جبکہ یزید کے اخلاق و عادات اور احکامِ مذہبی کے مقابلہ میں خودسری سے یہ توقع بعید تھی کہ وہ مکہ معظمہ کے مذہبی احترام کا لحاظ کرے گا بلکہ یہ خطرہ بہت قریب تھا کہ مکہ میں آپ کا قیام اس کا باعث ہوگا کہ وہیں مکہ میں آپ کے خلاف فوج کشی ہو اور مکہ میں نہ تو کوئی فوجی طاقت ایسی ہے جو آپ کی حفاظت کر سکے اور نہ آپ مکہ میں قیام کر کے حرمِ خدا کے اندر خونریزی ہونے کے خود باعث بننا چاہتے ہیں۔

اس کے علاوہ باوجودیکہ رسولؐ کے نواسے کی مہاجرت مدینہ سے مشہور ہو چکی ہے مگر طائف ہو یا یمن، بصرہ ہو یا یمامہ کہیں سے کوئی آواز ایسی بلند نہیں ہوتی کہ ہم آپ کی مدد کے لیے حاضر ہیں اور آپ کی حفاظت کے لیے آمادہ۔

ایسے سخت اور نازک موقع پر عرب کے آباد ترین خطۂ ملک (عراق) اور اس کے بھی اہم مرکز (کوفہ) سے یہ تحریک ہوتی ہے کہ آپ یہاں تشریف لائیں، ہم آپ کی حفاظت و حمایت کے لیے ہر طرح تیار ہیں اور صرف معمولی سی تحریک نہیں بلکہ پچپن عرضداشتیں اور دو خورجین بھر کے خطوط اور سات قاصد یکے بعد دیگرے روانہ کیے جاتے ہیں اور لکھنے والوں میں بہت سے ایسے اشخاص بھی ہیں جن کی محبت پر آپ کو بھروسا ہے۔ جیسے حبیب بن مظاہر، سلیمان بن صرد، رفاعہ بن شداد وغیرہ۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ امام حسین کو کیا کرنا چاہیے تھا۔ کیا آپ کے لیے مناسب تھا کہ اس دعوت کو مسترد کر دیتے؟

حقیقت یہ ہے کہ مکہ معظمہ کے قیام کی صورت میں بھی حضرت کا شہید ہونا یقینی تھا یعنی جیسے عبداللہ بن زبیر پر اسی مکہ میں فوج کشی ہوئی اور وہیں قتل کیے گئے، اسی طرح آپ پر بھی فوج کشی ہوتی اور وہیں محصور ہو کر آپ کو شہید ہونا پڑتا۔ اس صورت میں جبکہ اہلِ کوفہ کی جانب

ے اتنے اصرار و تاکید کے ساتھ آپ کو دعوت ا جا رہی تھی اور آپ کی نصرت کا وعدہ کیا جا رہا
تھا، آپ اس دعوت کو ٹھکرا کر مکہ میں قیام کر تے اور شہید کیے جاتے تو یہی لوگ جو آپ پر اب
اعتراض کرتے ہیں کہ آپ کوفہ کیوں گئے؟ یہی نے اٹھ کھڑے ہوتے کہ یہ کون سی عقلمندی تھی کہ
ایک اتنے بڑے خطہ کی دعوت اور وعدۂ نصر ، کو رد کر دیا جہاں کے لوگ آپ کے والد بزرگوار
کی بھی نصرت کر چکے تھے اور خود آپ کی بھی محبت کا دم بھرتے تھے۔
اس وقت بجان و دل آپ کی حمایت کا عدہ کر رہے تھے اور سینکڑوں عرضداشتیں بھیج
آپ سے قیادت و ہدایت کے طالب تھے۔ ا ، نادر موقع کو ہاتھ سے دے کر مکہ میں قیام رکھا جہا
کی زمین بے آب و گیاہ، جہاں کے رہنے والے پست حوصلہ و بے امنگ اور جہاں کی فضا بے مہر
وفا، یہاں تک کہ خود بھی قتل ہوئے اور مکہ ظمہ کی حرمت کو بھی برباد کرایا۔ ال
ظاہر ہے کہ عقل و تدبر کا اقتضا، یہی تھا کہ ا بلانے والوں کی آواز پر لبیک کہی جائے۔ ان
کی نصرت کے وعدوں کو آزمایا جائے اور اگر سچے نہ بھی ثابت ہوں تب بھی اتمامِ حجت کیا جائے
بے شک تھے ایسے لوگ جو آپ کو عراق جا نے سے منع کرتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ عراق
والوں کے وعدہ کا کوئی اعتبار نہیں مگر وہ اس ہلو کو نظر انداز کیے ہوئے تھے کہ مکہ معظمہ میں آپ
کا قیام آپ کو قتل سے بچا نہ سکتا تھا بلکہ حق تاً اگر موازنہ کیا جاتا تو موجودہ حالات کے لحاظ
سے مکہ میں قیام کی صورت میں آپ کا قتل کیا جانا یقینی اور کوفہ کی روانگی کی صورت میں مشکوک
تھا اس لیے کہ ظاہری اسباب و علل کے ماتحت ، اہلِ کوفہ کے مواعید کے غلط ہونے کا کوئی ثبوت
نہیں تھا بلکہ یہ خیال صرف ان کی ذاتی افتاد ع کے متعلق ایک غیر متیقن حکم بلکہ بدگمانی کی
حیثیت رکھتا تھا۔ اس صورت میں اگر آپ م یں شہید ہو جاتے تو دنیا کے اندر آپ کی شہادت
سے کوئی ہمدردی کا جذبہ پیدا نہ ہوتا لیکن اب جبکہ اہلِ کوفہ کی ان تمام خواہشوں پر لبیک کہتے
ہوئے نوعِ انسانی کے اتنے افراد کی درخواس ں کو منظور کرتے ہوئے روانہ ہو رہے ہیں تو اب
اگر آپ شہید بھی ہو گئے تو ایک بڑے انسانی یں کو ادا کرتے ہوئے اور اخلاق و مروّت کی

ایک اعلیٰ مثال قائم کرتے ہوئے اور کوفہ کے لوگوں پر حجت بھی تمام فرماتے ہوئے اور حفاظتِ خود اختیاری کے اصول پر بحدِّ امکان عمل کرتے ہوئے اور پھر اپنے کو مکہ سے علیٰحدہ کر کے مکہ کے احترام کو بھی پورے طور سے محفوظ کرتے ہوئے۔

اسی لیے امام نے ان لوگوں کے جواب میں جو آپ کو عراق جانے سے منع کرتے تھے جیسے عبداللہ بن عباس وغیرہ کبھی یہ نہیں فرمایا کہ مجھے عراق کے لوگوں پر اطمینان ہے اور اگر میں وہاں جاؤں گا تو ضرور وہ میری نصرت کریں گے، ہرگز نہیں بلکہ آپ نے زیادہ تر اہلِ عراق کے متعلق ان کی بے اطمینانی اور عدم اعتماد کے بارے میں اپنی رائے کو محفوظ رکھتے ہوئے اپنے ارادہ پر مبہم و مجمل طور پر قائم رہنے کا اظہار فرمایا جیسا کہ ابن عباس سے گفتگو کے موقع پر[1] اور کبھی صاف کہہ دیا کہ میں یہاں رہوں گا تو بھی قتل ہوں گا اور خانہ کعبہ کا احترام میرے سبب سے زائل ہوگا جیسا کہ ایک مرتبہ عبداللہ بن زبیر سے فرمایا۔ مجھے معلوم ہے کہ یہاں ایک شخص مینڈھے کی طرح ذبح ہوگا جس سے یہاں کی حرمت زائل ہوگی۔ میں وہ مینڈھا بننا نہیں چاہتا۔[2]

دوسرے موقع پر جب ابن زبیر نے آپ سے چپکے چپکے کان میں کچھ کہا تو ابن زبیر کے جانے کے بعد اپنے کچھ مخصوصین سے فرمایا۔ جانتے ہو ابن زبیر نے کیا کہا؟ ابن زبیر نے کہا کہ آپ مکّہ میں قیام فرمائیے اور باہر نہ جائیے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا۔ خدا کی قسم میں ایک بالشت بھر مکّہ کے حدود سے باہر قتل کیا جاؤں، مجھے زیادہ پسند ہے اس سے کہ ایک بالشت بھر مکہ کے حدود کے اندر مارا جاؤں۔ اور قسم خدا کی اگر میں کسی جانور کے سوراخ میں جا کر رہوں تب بھی یہ لوگ مجھ کو وہاں سے باہر لے آئیں گے، یہاں تک کہ جیسا چاہتے ہیں میرے ساتھ سلوک کریں۔ خدا کی قسم مجھ پر یہ لوگ تعدّی کریں گے جیسے یہود نے روزِ شنبہ کے بارے میں ظلم و تعدی سے کام لیا۔[3]

ان حالات میں ظاہری اسباب کی بنا پر آپ کے لیے کوفہ کی طرف تشریف لے جانا ناگزیر

[1] الاخبار الطوال ص ۲۴۳ [2] طبری ج ۶ ص ۲۱۷ [3] طبری ج ۶ ص ۲۱۷

تھا اور آپ کے لیے اہلِ کوفہ کی درخواست کو مسترد کرنا مناسب نہ تھا۔ پھر بھی آپ نے بحسب ظاہر اسباب احتیاطی تدبیر یہ اختیار فرمائی کہ اپنے چچا زاد بھائی مسلم بن عقیل کو جو مدینہ سے آپ کے ساتھ آئے تھے[1] اپنا نمائندہ بنا کر حالات کا مشاہدہ کرنے کے لیے کوفہ جانے پر مامور فرمایا[2] اور اس کے لیے آپ نے ایک خط اہلِ کوفہ کے نام لکھ کر ہانی بن ہانی اور سعید بن عبداللہ کے سپرد کیا جو اہلِ کوفہ کے آخری قاصد تھے اور انھیں حکم دیا کہ وہ جناب مسلم کے آگے روانہ ہوں۔

اس خط کا مطلب یہ تھا کہ ہانی اور سعید تمھارے خطوط لے کر پہنچے اور یہ دونوں شخص تمھارے سب سے آخری قاصد ہیں جو میرے پاس آئے ہیں۔ جو کچھ تم نے لکھا ہے میں نے غور سے پڑھا اور سمجھا۔ تم میں سے اکثر کا قول یہ ہے کہ ہمارے سر پر کوئی امام نہیں۔ آپ آئیے۔ شاید خدا ہم کو آپ کی بدولت حق پر مجتمع کر دے۔ اچھا تو میں تمھاری جانب اپنے بھائی، چچا کے بیٹے اور مخصوص معتمد کو روانہ کرتا ہوں اور انھیں حکم دیتا ہوں کہ وہ مجھ کو تمھارے حالات کے متعلق اطلاع دیں۔ اگر انھوں نے اطلاع دی کہ تمھاری جماعت اور اہل حل و عقد اس امر پر جسے تم نے اپنے خطوط میں ظاہر کیا ہے متفق ہیں تو میں عنقریب تمھاری طرف آتا ہوں اور واضح رہے کہ امام کے معنی نہیں سوا اس کے جو کتابِ الٰہی پر عامل عدالت کا پابند، حق کا متبع اور اپنی ذات کو خدا کی مرضی پر وقف کیے ہوئے ہو۔ والسلام[3]

اس خط کی عبارت سے ظاہر ہے کہ مسلم بن عقیل کو جنگ پر مامور نہیں کیا گیا تھا اور نہ وہ کوفہ کی تسخیر کی غرض سے بھیجے گئے تھے بلکہ وہ صرف ایک نمائندہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ کہ کوفہ کی رائے عامہ اور وہاں کے لوگوں کے حالات و خیالات کا حضرت امام حسینؑ کے متعلق اندازہ کر کے آپ کو اس کی اطلاع دیں۔ جناب مسلم، قیس بن مسہر صیداوی اور عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن کدن الرحبی، اہلِ کوفہ کے نامہ بروں کے ساتھ[4] حکم امام کی تعمیل میں مکّہ سے روانہ

[1] الاخبار الطوال ص ۱۳۲ [2] طبری ج ۶ ص ۱۹۷۔ الاخبار الطوال ص ۲۳۲ [3] طبری ج ۶ ص ۱۹۷ - ۱۹۸ و ص ۲۱۰-۲۱۱ [4] طبری ج ۶ ص ۲۹۸ -

ہوئے اور پہلے مدینۂ رسولؐ گئے۔ وہاں مسجدِ پیغمبرؐ میں نماز پڑھی۔ پھر عزیز و اقارب سے[1] رخصت ہوئے اور قبیلۂ قیس میں سے دو عربوں کو جو راستے سے واقف تھے اپنے ساتھ لے کر کوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔ عجیب اتفاق ہے کہ دونوں راستے کے ماہر ہوتے ہوئے جب آپ کو لے کر چلے تو ایک دم راستا بھول گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ریگستان میں پڑ گئے۔ پیاس کا غلبہ ہوا اور اسی عالم میں ایک ایسے مقام پر پہنچ کر جہاں سے دور مسافروں کے چلنے کی سڑک نظر آ رہی تھی وہ دونوں بالکل بے حال ہو گئے۔ انھوں نے ہاتھ سے اشارہ کر کے سڑک کا پتہ دیا اور پھر ان میں سے ایک یا دونوں[2] مر کر ہلاک ہو گئے۔ جناب مسلم اور ان کے ساتھیوں کی حالت بھی بہت تباہ ہو چکی تھی۔ مگر یہ ان کی غیر معمولی قوتِ برداشت تھی کہ انھوں نے کسی نہ کسی طرح اپنے کو شاہراہ تک پہنچا دیا اور بطن خبت (وادی) کے ایک چشمہ پر جس کا نام مضیق تھا قیام کر کے وہاں سے امام حسینؑ کی خدمت میں خط بھیجا جس میں آغازِ سفر کے اس حادثہ پر اپنے غیر معمولی تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ میرا دل کوفہ کے سفر کے لیے کسی طرح آمادہ نہیں ہے مگر دوبارہ امام کے تاکیدی حکم نے مجبور کر دیا اور وہ کوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔[3]

کوفہ پہنچ کر حکم امام کے مطابق جناب مسلم نے امن پسندی سے کام لیا۔ حاکم دارالامارہ میں موجود تھا مگر مسلم نے اس سے کوئی تعرض نہ کیا۔ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا جسے شورش انگیزی منظور ہو تو اس کا پہلا کام یہ ہوتا کہ دارالامارہ پر قبضہ کرے مگر مسلم نے اپنے عمل سے ظاہر کر دیا کہ ہمیں تمھاری سلطنت سے مطلب نہیں، تمھاری حکومت سے کوئی غرض نہیں۔ ہمیں تو صرف طالبانِ ہدایت کی تلاش اور ان کی مذہبی و اخلاقی اصلاح مدِنظر ہے۔

مسلم کے ورودِ کوفہ کے متعلق حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلیمان بن صرد خزاعی اس وقت کوفہ میں موجود نہ تھے ورنہ مسلم ان ہی کے مکان پر قیام کرتے اس لیے کہ وہ اس

[1] طبری ج ۶ ص ۱۹۴ [2] طبری ج ۶ ص ۱۹۵ الاخبار الطوال ص ۲۳۲
[3] الاخبار الطوال ص ۲۳۲ - طبری ج ۶ ص ۱۹۵

تحریک کے روحِ رواں اور اس جماعت میں سب سے زیادہ صاحبِ وجاہت اور ذی اثر تھے۔ مجبوراً مسلم نے مختار بن ابی عبیدہ ثقفی کے گھر میں قیام کیا۔[1]

کوفہ میں یہ خبر تیزی کے ساتھ پھیل گئی اور لوگ جوق در جوق آپ کے پاس ملاقات کے لیے پہنچنے لگے۔ جب کافی مجمع ہو گیا تو مسلم نے امام حسینؑ کا خط جو اس جماعت کے نام تھا پڑھ کر سنایا جس کو سن کر حاضرین میں کافی جوش کے آثار نمودار ہوئے۔ عابس بن ابی شبیب شاکری نے کھڑے ہو کر حمد و ثنائے الٰہی کے بعد اپنے ذاتی خیال کو ظاہر کرتے ہوئے کہا "مجھ کو عام لوگوں کے متعلق کسی اظہارِ رائے کا حق نہیں ہے اور نہ مجھے یہ معلوم ہے کہ ان کے دلوں میں کیا ہے اور میں ان کی طرف سے وکالت کر کے آپ کو دھوکے میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا مگر میں وہ ظاہر کرتا ہوں جسے میں نے اپنے دل میں ٹھان لیا ہے۔ خدا کی قسم میں جس وقت بھی آپ دعوت دیں گے لبیک کہتا ہوا حاضر ہوں گا اور آپ کے ہمراہ دشمنوں سے جنگ کروں گا اور اس وقت تک شمشیر زنی کروں گا کہ اس زندگی کو ختم کر کے اپنے خدا سے ملاقات کروں اور میرا مقصد اس سے سوا رضائے پروردگار کے کچھ نہ ہوگا۔"

ان کی یہ تقریر ختم ہونا تھی کہ حبیب بن مظاہر کھڑے ہوئے اور کہنے لگے۔ "مرحبا، جزاک اللہ کتنے مختصر لفظوں میں تم نے حقیقتِ حال کو واضح کیا ہے۔" پھر مسلم کی طرف خطاب کر کے کہا۔ خدا کی قسم میرا بھی ذاتی حیثیت سے یہی خیال ہے جس کو عابس بن ابی شبیب نے اپنے لفظوں میں ظاہر کیا۔ اسی سے ملتی جلتی لفظوں میں سعید بن عبداللہ حنفی نے تائید کی جس کے بعد مجمع متفرق ہوا۔[2] خط کے مضمون کی بنا پر اس کارروائی کا مقصد ظاہر ہے۔ یعنی یہ

[1] الاخبار الطوال ص ۲۳۲ طبری ج ۶ ص ۱۹۹ وج ۷ ص ۵۸۔ ارشاد ص ۲۱۱۔ اس گھر کے نشانات غالباً چوتھی صدی ہجری تک باقی تھے چنانچہ ابوحنیفہ دینوری نے لکھا ہے کہ اب یہ گھر "دار مسیّب" کے نام سے مشہور ہے (الاخبار الطوال ص ۲۳۲)، طبری نے لکھا ہے "دار مسلم بن مسیّب" کے نام سے مشہور ہے (طبری ج ۶ ص ۱۹۹) دوسری جگہ "دار مسلم بن مسیّب" درج ہے (طبری ج ۷ ص ۵) [2] طبری ج ۶ ص ۱۹۹

عہد و پیمان اس غرض سے نہ تھا کہ مسلم کوئی جارحانہ اقدام کرنا چاہتے تھے۔ اور اس کے متعلق یہ لوگ نصرت اور مدد کا وعدہ کر رہے تھے اور نہ موجودہ صورت حال کی بنا، پر یہ خیال کسی دماغ میں جگہ پا سکتا تھا کہ چند ہی روز میں تن تنہا مسلم کے مقابلہ میں فوج کشی ہوگی اور اس کے لیے اس جماعت کو تیار رہنا چاہیے۔ بلکہ یہ عہد و پیمان صرف امام حسینؑ کی تشریف آوری کی پیش نہاد اور اس موقع کے لیے ان لوگوں کے عزائم و نیات کے اندازہ کے طور پر تھا۔

مسلم بن عقیل کے ورود کی خبر کوفہ میں عام طور پر مشہور ہو ہی چکی تھی اور اس فضا کے لحاظ سے جو امام حسینؑ کو دعوت دینے کی تحریک کے سلسلہ میں ابتدا ہی سے کوفہ میں پیدا ہوگئی تھی اور جس کے اسباب وضاحت کے ساتھ درج کیے جا چکے ہیں۔ ہر شخص نے اس خبر کا مسرت کے ساتھ استقبال کیا۔

یزید کی خلافت سے بسبب اس کی سیاہ کاریوں کے بیزاری ایک طرف، حضرت حسینؑ بن علیؑ کی ہر دلعزیزی نہ صرف خاندانی وجاہت کے باعث بلکہ اپنے اخلاق و کمالات کے لحاظ سے دوسری جانب، وہ لوگ کہ جو مسلم بن عقیل کی تحریک کے مبلغ و داعی تھے ان کی ذاتی وجاہت اور تعلقات تیسری طرف اور "کل جدید لذیذ" کے طبعی قانون کے مطابق ہر تازہ تحریک میں جو لذت ہوتی ہے وہ چوتھی جانب ان تمام اسباب کی بنا پر حضرت مسلم کے ہاتھ پر ایک ہفتہ کے اندر بارہ[1] یا اٹھارہ ہزار[2] کوفیوں نے بیعت کی لیکن کیا یہ سب دوستانِ علیؑ تھے؟ کیا کوفہ میں زیاد و آلِ زیاد کی بیس سال حکومت کے بعد جس میں کھنچی ہوئی تلواریں اور جلادوں کے ہاتھ برابر اپنی سفاکی دکھاتے رہے ہوں اور دست و پا، سر و زبان کے قطع و برید کا سلسلہ برابر جاری رہا ہو، کوفہ میں اتنی تعداد میں علیؑ کے دوست موجود ہو سکتے تھے؟ ہرگز نہیں۔ سچے شیعہ تو کوفہ میں پہلے ہی کم تھے۔ اور جو تھے بھی وہ معاویہ کے قتل و غارت کے بعد تقریباً نیست و نابود ہو چکے تھے۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۹۴ [2] طبری ج ۷ ص ۲۱۱

اس کے بعد تھوڑے سے چھپے چھپائے افراد باقی ہو سکتے ہیں۔ ورنہ جتنے تھے وہ وہی افراد تھے جو حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کو چوتھا خلیفہ تسلیم کرکے محض ساتھ ہونے کی وجہ سے لغوی معنی کے اعتبار سے شیعہ کہے جاتے تھے اور وہ بھی اب زیادہ تعداد میں باقی نہیں تھے۔ اس صورت میں یہ ماننا ناگزیر ہے کہ مذکورہ بالا سطحی اور عارضی اسباب سے جو رائے عامہ ہموار ہوئی ہو اس میں کوئی وزن نہیں ہو سکتا۔ بے شک جب اس تحریک کے ابتدائی محرکین کو رائے عامہ کی نوعیت سمجھنے میں غلطی ہوئی حالانکہ وہ یہیں کے رہنے سہنے پروردہ اور تجربہ یافتہ تھے تو جناب مسلم کو جو کہ یہاں پردیسی کی حیثیت رکھتے تھے، دھوکا ہونا قابلِ تعجب نہیں ہے۔

مسلم کی تحریک کو چلانے والے ان کی صدا پر سب سے پہلے لبیک کہنے والے اور سب سے پہلے جلسہ میں جانبازی کا اقرار کرنے والے اور رائے عامہ کو ہموار کرکے مسلم کی نصرت و حمایت پر آمادہ کرنے والے ان میں سے اکثر بے شک سچے، خالص اور مخلص ہمدرد اور دوست تھے اور ان کا کام یہی تھا کہ وہ شہر کی فضا کو مسلم کے موافق بنا دیں جس میں ان کو بظاہر خاطر خواہ کامیابی ہوئی لیکن آئندہ کے انقلابات کوئی دوسری صورت پیدا نہ کریں گے۔ اسکی ذمہ داری کسی پر عائد نہیں ہو سکتی۔ بے شک ان قلیل التعداد خالص دوستوں نے اپنے اقرار اور عہدِ جانبازی پر بہترین طریقہ سے عمل کیا اور جو کہا تھا اسے کر دکھایا، جس کے مشاہدہ کے لیے مستقبل کا انتظار کرنا چاہیے۔

جناب مسلم بن عقیل کو حالات خوشگوار اور مطابق قول و قرار نظر آئے۔ اس لیے امام حسینؑ کو خط لکھ دیا کہ جلد تشریف لائیے۔ حالات سازگار ہیں اور اہلِ کوفہ اپنے قول و قرار پر قائم ہیں[1]۔ مقامی حکومت کا طرزِ عمل ان کی نسبت روادارانہ تھا۔ کوفہ کے حاکم نعمان بن بشیر نے منبر پر جا کر ایک تقریر کی جس کا مضمون یہ تھا کہ اے بندگانِ خدا فتنہ و فساد

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۱۱ ۔ الاخبار الطوال ص ۲۴۳

اور افتراق سے پرہیز کرو۔ اس سے خواہ مخواہ جانیں جائیں گی، خون بہیں گے اور مالی تباہیاں ہونگی جہاں تک میرا تعلق ہے میں جب تک کوئی جارحانہ اقدام میرے خلاف نہ ہو اس وقت تک کوئی اقدام نہیں کروں گا[1] کوفہ میں یہ خبر گرم تھی کہ اب بہت جلد ہی حسینؑ بن علیؑ تشریف لانے والے ہیں اور اس وجہ سے ہر طرف ایک خاص چہل پہل نظر آتی تھی اور حلقہ حلقہ جماعت در جماعت لوگ بیٹھ کر اس پر اظہارِ خیالات کرتے تھے اور بے چینی کے ساتھ دیدہ براہ تھے مگر کوفہ کے اندر ایک ایسی جماعت موجود تھی جو ان تمام منصوبوں کو خاک سیاہ بنا دینے پر تلی ہوئی تھی اور یہ اموی حکومت کے خیر خواہ وہ لوگ تھے جنھیں اندیشہ ہوا ہوگا کہ حسینؑ بن علیؑ کے اقتدار کے بعد انھیں اموالِ خلق پر بے جا تصرفات کا موقع باقی نہ رہے گا۔ چنانچہ ان میں سے ایک شخص بنی امیہ کے حلیف عبداللہ بن مسلم حضرمی نے تو نعمان بن بشیر کی مذکورہ بالا روداد ارانہ تقریر کے بعد ہی کھڑے ہو کر کہہ دیا کہ یہ آپ کا طریقِ کار صحیح نہیں ہے اور آپ کمزوری دکھا رہے ہیں جس پر نعمان نے کہا کہ "میں اللہ کی اطاعت کے لیے کمزور ثابت ہوں یہ بہتر ہے اس سے کہ معصیتِ الٰہی کر کے زور آور ثابت ہوں[2]۔" یہ جواب نعمان کے ضمیر کی صاف ترجمانی کر رہا تھا جس کے بعد فسادی اشخاص کو کچھ کہنے کا موقع نہ تھا۔ اس لیے یہاں سے جا کر فوراً عبداللہ بن مسلم[3] نے یزید کے نام خط لکھا کہ مسلم بن عقیل کوفہ آئے ہیں اور ان کے طرفداروں نے ان کے ہاتھ پر حسینؑ کی بیعت کر لی ہے۔ اگر آپ کو کوفہ اپنے ہاتھ میں رکھنا ہے تو یہاں کوئی مضبوط آدمی بھیجیے جو آپ کے فرمان کے مطابق عمل کر سکے۔ اس لیے کہ نعمان بن بشیر کمزور شخص ہیں یا وہ جان بوجھ کر کمزوری دکھا رہے ہیں۔"

عمارہ بن عقبہ اور عمرو بن سعد نے بھی ایسے ہی مضمون کے خطوط روانہ کیے[4] ان خطوط کے پہنچنے پر یزید نے سرجون بن منصور رومی سے مشورہ لیا۔ یہ شخص عیسائی تھا جو معاویہ کے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۹۹ [2] طبری ج ۶ ص ۱۹۹

[3] دینوری نے اس خط لکھنے کی نسبت مسلم بن سعید حضرمی اور عمارہ بن عقبہ کی طرف دی ہے اور کہا ہے کہ یہ دونوں یزید بن معاویہ کے جاسوس تھے (الاخبار الطوال ص ۲۳۳) [4] طبری ج ۶ ص ۱۹۹۔ ارشاد ص ۲۱۱ ۔ ۲۱۲

زمانہ سے محکمۂ خراج میں کاتب تھا[1]۔ سرجون نے عبیداللہ بن زیاد کا نام لیا[2]۔ یزید اس وقت تک ابن زیاد سے خفا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اسی کی وجہ سے زیاد نے میری ولیعہدی سے اختلاف کیا تھا اور یہ کہ شاید معاویہ کے بعد بجائے میرے یہ خود خلافت کا امیدوار تھا اس لیے اس کا اب تک یہ ارادہ تھا کہ وہ بصرہ کی حکومت سے بھی ابن زیاد کو معزول کر دے گا[3]۔ چنانچہ ابن زیاد کا نام سنتے ہی یزید نے انکار کیا اور کہا، نہیں وہ ٹھیک نہیں ہے کسی اور کا نام لو۔ سرجون نے کہا۔ یہ بتائیے کہ اگر معاویہ اس وقت زندہ ہوتے اور وہ اس وقت آپ کو یہی رائے دیتے تو آپ قبول کرتے؟ یزید نے کہا، بے شک ان کے کہنے کو ضرور قبول کرتا۔ یہ سنکر سرجون نے ایک تحریر نکالی اور کہا کہ یہ معاویہ کا فرمان ہے جس میں ابن زیاد کو کوفہ کا حاکم مقرر کیا ہے۔ وہ اسے بھیجنے نہ پائے کہ انتقال ہو گیا۔ اب آپ بصرہ اور کوفہ دونوں جگہ کی حکومت عبیداللہ بن زیاد کے

---

[1] الوزراء والکتاب ص ۱۵۱۔ چونکہ اس زمانہ میں کوفہ و بصرہ اور دمشق دونوں مرکزوں میں مالیات کے متعلق دو دفتر تھے، ایک رعایا کی مردم شماری کا اور ان کے وظائف والعامات کا، یہاں کام عربی میں ہوتا تھا اور دوسرا آمدنی و خرچ کے حسابات کا۔ یہ کام کوفہ و بصرہ میں اب تک فارسی زبان میں ہوتا تھا اور شام میں یہ رومی زبان میں لکھا جاتا تھا اس لیے عراق میں یہ دفتر مجوسیوں اور شام میں عیسائیوں کے ہاتھ میں تھا۔ چنانچہ اس دفتر کا مہتمم اعلیٰ دمشق میں سرجون تھا جو معاویہ کے وقت سے عبدالملک بن مروان کے عہد تک برابر اس شعبہ کا ذمہ دار رہا اور اس غرہ سے میں کہ یہ کام بغیر ہمارے ہو ہی نہیں سکتا ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ خلیفہ تک کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اسی وجہ سے عبدالملک کے زمانہ میں عراق اور دمشق کے ان دونوں دفتروں کو بھی عربی میں منتقل کیا گیا چنانچہ ۷۸ھ میں حجاج بن یوسف نے عراق کے دفتروں سے مجوسیوں کو نکال کر ان کو عربی کی طرف منتقل کیا اور تقریباً اسی زمانہ میں عبدالملک کے حکم سے دمشق کے دفتر کی زبان عربی بنائی گئی اور سرجون کو عہدہ سے برطرف کر دیا گیا (الوزراء والکتاب ص ۳۸ [illegible])

[2] سب سے پہلے زیاد کے مرنے کے بعد ۵۴ھ میں عبیداللہ بن زیاد کو معاویہ نے خراسان کا حاکم قرار دیا۔ اس وقت اس کی عمر ۲۵ برس کی تھی (طبری ج ۶ ص ۱۶۶) پھر ۵۵ھ میں اسے بصرہ کا حاکم قرار دیا (ص ۱۶۸)

[3] طبری ج ۶ ص ۱۹۴

بیٹے قرار دے دیجیے۔

یزید نے معاویہ کی اس تحریر کے مطابق ابن زیاد کے نام خط لکھا کہ مجھے میرے شیعوں نے کوفہ سے خطوط لکھے ہیں کہ وہاں پسرِ عقیل نے آ کر لشکر جمع کرنا شروع کر دیا ہے تاکہ مسلمانوں میں تفرقہ اور فساد پیدا ہو۔ تم اس خط کے پہنچنے کے ساتھ ہی ادھر روانہ ہو اور مسلم کو قبضہ میں لا کر قید کرو، قتل کرو یا نکال دو۔ والسلام"[1]

قدیم مورخ جہشیاری نے اس خط کا مضمون حسب ذیل لکھا ہے جس کے پس منظر میں یزید کی ابن زیاد سے ناراضگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس میں تہدیدی انداز زیادہ نمایاں ہے۔

"معلوم ہونا چاہیے کہ جس کی ایک وقت تعریفیں ہوتی ہیں وہی دوسرے وقت سب و شتم سے یاد کیا جاتا ہے اور جسے سب و شتم سے کیا جاتا ہے وہی ایکدم محلِ تعریف بن جاتا ہے۔ اس وقت ایک بڑا منصب تمھارے سپرد کیا جا رہا ہے جس سے بڑھ کر تمھارے لیے کوئی اعزاز نہیں ہو سکتا اور اتفاق سے حسینؑ کی مہم تمھارے ہی دور اور تمھارے ہی قلمرو مملکت کے نصیب میں آئی ہے اور تمام عمالِ حکومت میں تم ہی وہ ہو جو اس محلِ آزمائش میں پڑے ہو۔ اب یا تو تمھاری شرافت پایۂ ثبوت تک پہنچ جائے گی اور یا جیسے کبھی تھے ویسے ہی غلام کے غلام قرار پا جاؤ گے۔ والسلام"[2]

اس کے آخری فقرہ میں تلمیح وہی زیاد کے مجہول النسب ہونے اور پھر معاویہ کی نظرِ عنایت سے فرزندِ ابوسفیان قرار دیے جانے کی طرف ہے۔ اس خط کے مضمون سے یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ صرف مسلم ہی کے بارے میں ابنِ زیاد کو سرگرمی کی تحریک نہیں کر رہا ہے بلکہ سخت و درشت اور غیرت انگیز الفاظ میں خود حضرت امام حسینؑ کے معاملہ میں ابن زیاد کو مضبوط اقدامات کی تحریک کر رہا ہے۔ جس میں ذرا بھی کوتاہی اس کے سامنے اس کے تمام مستقبل کے تاریک بننے کی دھمکیوں کا مرکز بنا دی گئی ہے۔

---

[1] ارشاد ص ۲۱۲۔ طبری ج ۶ ص ۲۰۰ [2] الوزراء والکتاب ص ۱۹

بہرحال اس خط کو کوفہ کی حکومت کے پروانہ کے ساتھ مسلم بن عمرو باہلی[1] کے ہاتھ ابن زیاد کے پاس روانہ کیا جس کو دیکھتے ہی اس نے بصرہ میں اپنے بھائی عثمان بن زیاد کو قائم مقام بنا کر خود کوفہ جانے کی تیاری کر دی اور مسجد جامع میں ایک تہدید آمیز تقریر کرنے کے بعد جس میں اعلان کیا تھا کہ اگر تم میں سے کسی نے ذرا بھی مخالفت کی تو میں اسی کو نہیں بلکہ اس کے ورثا کو بھی قتل کرا دوں گا اور آس پاس کے آدمیوں اور خطاکار کے ساتھ بے خطا کو بھی سزا دینے میں کمی نہ کرونگا۔[2] دوسرے دن روانہ ہو گیا۔[3] وہ کوئی اور نہیں زیاد بن ابیہ کا بیٹا اور معاویہ کا ان کے ادعا کے مطابق بھتیجا تھا اور یہ پورا خاندان ہی وہ تھا جس پر حیلہ و فریب کا خاتمہ تھا۔ چنانچہ سب سے پہلی بات ابن زیاد نے یہ کی کہ اس نے اپنی نقل و حرکت کو بالکل صیغۂ راز میں رکھا تاکہ اس کا ورود کوفہ میں اچانک حیثیت سے ہو اور پھر جب کوفہ نزدیک رہ گیا تو اس نے اپنی وضع میں تغیر پیدا کر کے ایک سیاہ عمامہ سر پہ باندھا اور چہرہ پر اسی طریقہ سے جو عرب قوم کے بہادروں کا جنگ وغیرہ کے موقعوں پر دستور تھا ایک ڈھاٹا باندھ لیا جس کی بناء پر شناخت ناممکن ہو گئی۔ ایک مرتبہ شہر پناہ کوفہ کے اندر یہ نقشہ نظر آیا کہ آگے آگے عربی گھوڑے پر سوار ایک رئیسِ قوم پورے وقار و تمکنت کے ساتھ سیاہ عمامہ سر پر باندھے جو اشراف عرب کا امتیازی نشان تھا اور اس کے پیچھے ایک شاندار قافلہ زین و لجام، سازو سامان سے آراستہ آ رہا ہے۔ اس حشم و خدم کو دیکھ کر ان توقعات کی بناء پر جو پہلے سے قائم تھے وہی ہونا چاہیے تھا جو ہوا۔ یعنی ہر شخص یہی سمجھا کہ حضرت حسینؑ بن علیؑ تشریف لائے ہیں اور اس قائم شدہ اثر کی بناء پر یا متوقع جدید انقلاب سے نفع دنیوی حاصل کرنے کی تمنا میں جس جماعت کی طرف سے عبیداللہ کا گزر ہوتا وہ بہ نظرِ تعظیم کھڑے ہو کر آداب بجا لاتی اور خوش آمدید کے معنی میں یہ الفاظ زبان پر جاری کرتی۔ مرحبا بك يابن رسول الله قدمت خير مقدم۔ ابن زیاد

---

[1] قتیبہ بن مسلم کی شخصیت تاریخ میں مشہور ہے۔ یہ مسلم بن عمرو اسی کا باپ تھا (الاخبار الطوال ص ۳۳)

[2] الاخبار الطوال ص ۲۳۲ [3] طبری ج ۶ ص ۲۰۱۔ ارشاد ص ۲۱۲۔ ۲۱۳۔

کسی کو کچھ جواب نہ دیتا بلکہ آوازوں کو سنتا، چہروں کو بغور دیکھتا، شکل و شمائل کو پہچانتا چلا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ مجمع زیادہ ہوگیا اور لوگ اشتیاق سے گھروں سے نکل آئے اور ہر شخص فرزند رسولؐ سمجھ کر آگے بڑھنے لگا اور نوبت یہ پہنچی کہ راہ چلنے میں رکاوٹ پیدا ہونے لگی۔ اس وقت مسلم بن عمرو باہلی نے جو ابن زیاد کے ساتھ تھا۔ پکار کر کہا۔ "راستہ چھوڑ دو۔ یہ امیر عبیداللہ بن زیاد ہیں۔"[1]

نہ معلوم ان الفاظ میں کونسا اثر تھا کہ بڑھتے ہوئے قدم اور اٹھتے ہوئے ہاتھ اور مسرت آمیز ترانے سب موقوف ہو گئے۔ ایک سناٹا تھا جو چھا گیا اور سارا مجمع تتر بتر ہوگیا۔ یہاں تک کہ جب ابن زیاد دارالامارہ میں پہنچا تو دس آدمیوں سے زیادہ اس کے ساتھ نہ تھے۔[2]

اس موقع پر اہل کوفہ کے فطری رجحانات پر غور کرنے کے بعد ان کے باطنی اضطراب کا اندازہ کرنا چنداں دشوار نہیں۔ اس لیے کہ حالات کا غیر متوقع صورت سے ظہور پذیر ہونا بجائے خود سنسنی پیدا کر دیتا ہے چہ جائیکہ صورت حال یہ ہو کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے خلاف خود جاسوسی کے کام کو انجام دیا یعنی اپنے باطنی خیالات اور حسینؑ بن علیؑ کے ساتھ خلوص و عقیدت کی خود ابن زیاد کے سامنے بوقت ورود ترجمانی کر دی اور ابن زیاد نے ایک ایک چہرہ اور آواز کو پہچان لیا اور پھر ابن زیاد وہی تھا جس کی اور جس کے باپ کی تلوار کے نیچے بیس برس تک اس تمام خلقت کی گردنیں اس طرح خم رہی ہیں کہ جس کو چاہا گرفتار کیا، سولی پر لٹکایا، جلاد کے ہاتھ سے سر کو قلم کرا دیا اور ایسے ہیبت ناک مناظر ان ہی ہاتھوں سے آنکھوں کے سامنے آ چکے ہیں جن کو سوچ کر اب تک رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور دل ہل جاتے ہوں گے۔ اور اب وہی صورتیں اپنے اور اپنی اولاد اور اعزہ و اقارب کے لیے پیش نظر ہیں۔ کیا یہ وجوہ ایسے نہ تھے جن کی بناء پر دل و دماغ معطل، طاقتیں مضمحل اور ہمتیں پست ہو جائیں اور ان پر عظیم خوف و ہراس کا غلبہ ہو جاتا خصوصاً جبکہ زیادہ تر تعداد عوام کی تھی جو واقعات و حالات کو سمجھے بغیر ہر نئی آواز پر لبیک کہنے کے شوق میں شریک ہو گئے تھے۔

[1] الاخبار الطوال صفحہ ۲۳۴ ۔ طبری ج ۶ صفحہ ۲۰۱ [2] طبری ج ۶ صفحہ ۲۰۱

ابن زیاد نے مسجد جامع میں ایک تہدیدی تقریر کے ساتھ اپنی حکومت کا اعلان کرنے کے بعد قصر میں جا کر قیام کیا اور نعمان بن بشیر ۔ فوراً قصر کا تخلیہ کر کے کوفہ سے اپنے وطن شام کی طرف روانگی اختیار کی۔[1] ابن زیاد نے اس کے بعد تمام محلات کوفہ کے ذمہ دار اشخاص کو جن سے عرافت[2] کا منصب تعلق رکھتا تھا بلا کر یہ فرمان جاری کیا کہ جلد سے جلد ہر محلہ کی مردم شماری اور جو لوگ نو وارد ہیں ان کی فہرست اور جن لوگوں سے حکومت شام کو خطرہ ہے ان کے نام ادارۂ حکومت محلیہ میں پیش کر دیے جائیں اور اگر وہ کسی وجہ سے ان فہرستوں کے تفصیل وار ترتیب دینے سے معذور ہوں تو ضمانت داخل کریں کہ ان کے محلہ میں کوئی متنفس بھی حاکم شام کی مخالفت پر آمادہ نہ ہوگا اور اس کے خلاف ظاہر ہوا تو اس مختار محلہ کو فوراً اس کے گھر کے دروازہ پر سولی دی جائے گی اور اس کے خاندان سے ہمیشہ کے لیے اس منصب کو علیحدہ کر لیا جائیگا۔[3] یہ مضبوط تدبیر ایسی نہ تھی جس کی کامیابی میں شبہ ہو۔ کوفہ کا چپہ چپہ جواسیس و مخبرین کی کثرت سے غیر محفوظ نظر آنے لگا۔ اب ہر شخص خود اپنے محلہ میں ایک گھر سے دوسرے گھر پر جاتے ڈرتا تھا اور اس طرح دس پانچ آدمیوں کا بھی ایک جگہ جمع ہو کر کسی امر پر گفتگو کرنا اور کوئی قرارداد استوار کرنا ناممکن ہو گیا۔

یہ پہلا موقع وہ ہو سکتا تھا کہ جب مسلم بن عقیل کو جان کا اندیشہ اور مقصد کی پامالی کا احساس ہو جاتا۔ اب آپ کا صرف ایک فرض رہ گیا تھا کہ آپ حفاظت خود اختیاری کے فریضہ کے ماتحت یہاں تک ممکن ہو اپنے تحفظ کے لیے احتیاطی تدابیر عمل میں لائیں۔ اس کے لیے آپ کو مختار بن ابی عبیدہ کا مکان جس میں آپ اب تک مقیم تھے غیر محفوظ معلوم ہوا۔ اس لیے

[1] الاخبار الطوال صفحہ ۲۳۴ [2] ملک عرب میں یہ طریقہ اب تک رائج ہے کہ بڑے شہروں میں ہر محلہ میں ایک مختار محلہ ہوتا ہے جو اس محلہ کی مردم شماری وارد و صادر، زائیدہ و مردہ، شادی شدہ و غیر شادی شدہ وغیرہ امور کی تشریح کا مقامی حکومت کی طرف سے ذمہ دار ہوتا ہے۔ اسی منصب کو اس زمانہ میں عرافت کہتے تھے۔ [3] طبری ج ۶ صفحہ ۲۰۱ ۔ ارشاد صفحہ ۱۷۱ ۔

کہ آپ کا قیام وہاں مشتہر ہو چکا تھا اور پھر اگر کوئی وقت آتا تو وہاں آپ کی حمایت کرنے والا بھی کوئی نہ ہوتا۔ مختار بن ابی عبیدہ شریف قوم سہی لیکن صرف ایک زمیندار کی حیثیت رکھتے تھے وہ کسی بڑے قبیلہ کے سردار نہ تھے اس کے علاوہ اس خاص موقع پر وہ کوفہ میں موجود بھی نہ تھے۔[1]

لہٰذا مسلم نے اپنے لیے اس سے بہتر کوئی صورت نہ دیکھی کہ آپ تاریکی شب میں ہانی بن عروہ کے گھر میں منتقل ہو جائیں[2] یہ قبیلۂ مراد و مذحج کے سردار تھے اور جب نکلتے تھے تو بارہ ہزار آہن پوش سوار ان کے ہمرکاب ہوتے تھے۔

مسلم نے ہانی کے گھر میں پناہ لے کر ظاہری اسباب کی بنا پر اپنے کو بارہ ہزار شمشیر زن بہادروں کے حلقہ میں پہنچا دیا جو بظاہر آپ کی حفاظت کا فرض بہترین طریقہ پر ادا کر سکتے تھے۔ ہانی نے مسلم کو مخفی طور پر اپنے یہاں رکھا اور سوا مخصوص افراد کے جو محل اعتماد تھے کسی کو اس راز کی اطلاع نہ دی۔ اب ان قلیل التعداد دوستان اہل بیتؑ کو جو اس تحریک کے داعی تھے۔ فضا کی ناسازگاری کا پورا پورا احساس ہو گیا تھا مگر وہ مستقل مزاجی کے ساتھ صورت حال کے مقابلہ پر آمادہ ہو گئے اور اب لازمی طور پر نقطۂ نظر میں تبدیلی ہو گئی۔ اس کے پہلے امام حسینؑ کے خط کے مطابق مسلم کی حیثیت صرف ایک پُرامن نمائندہ کی تھی جس کا مقصد فقط کوفہ کے لوگوں سے امام حسینؑ کے لیے عہدِ وفاداری کا استوار کرنا تھا۔ چنانچہ اس کے پہلے ہرگز یہ پتہ نہیں چلتا کہ کوئی اسلحہ کی فراہمی کی کوشش ہو رہی ہو یا جنگ کی تیاری ہو مگر اب نوعیت یہ ہے کہ یہ یقینی ہے کہ عنقریب مسلم کے خلاف حکومت کی طرف سے جارحانہ اقدام ہوگا اور اب اس جماعت کو جو مسلم کے بلانے کی ذمہ دار ہے اس کے مقابلہ کے لیے تیار ہونا چاہیے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے اب یہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس ہدایت نامہ کے حدود سے آگے جو مسلم کو امام حسینؑ کی جانب سے دیا گیا تھا۔ یہ اب ایک ہنگامی صورت حال ہے جس کے لیے مسلم اور جماعت کوفہ کو بہرحال مناسب

[1] طبری ج ۷ صفحہ ۵۵ [2] الاخبار الطوال صفحہ ۲۳۵ طبری ج صفحہ ۱۹۵ و صفحہ ۲۰۳ ۔ ارشاد صفحہ ۲۱۳

طرزِ عمل اختیار کرنا لازم ہے چنانچہ مسلم بن عوسجہ اسدی نے حضرت مسلم کی طرف سے اب لوگوں سے حفاظت و نصرت کا وعدہ لینا شروع کیا اور ابو ثمامہ صائدی فراہمی سرمایہ اور جمع آوری اسلحہ کے ذمہ دار ہوئے[1]

ابن زیاد کو جناب مسلم کی جائے قیام کا پتہ لگانے کی بڑی فکر تھی۔ اس نے مسلم کی سراغرسانی کے لیے اپنے شامی غلام معقل کو تین ہزار درہم دے کر مقرر کیا کہ وہ خفیہ طریقہ پر کسی نہ کسی طرح مسلم کا پتہ چلائے۔ معقل اس فکر میں مسجدِ جامع میں آیا۔ اتفاق سے اس وقت مسلم بن عوسجہ ایک رکن مسجد کے پاس نماز میں مصروف تھے۔ وہ دیر تک انکو دیکھتا رہا اور اس نے اپنے دل میں کہا (جیسے خود اس نے بعد میں بیان کیا) کہ یہ شیعہ لوگ نمازیں بکثرت پڑھتے ہیں اس لیے ہوں نہ ہوں یہ انہیں میں سے ہوں گے لہٰذا وہ انتظار میں بیٹھا رہا[2] جب مسلم نماز سے فارغ ہوئے تو وہ ان کے پاس آکر بیٹھا اور کہا کہ "میں شام کا رہنے والا ذوالکلاع کا غلام خدا کے فضل سے اہل بیت رسولؐ کا دوست ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس خاندان میں سے کوئی بزرگ آجکل کوفہ میں آئے ہوئے ہیں اور لوگوں سے رسولِ خدا کے نواسے کی بیعت لے رہے ہیں اور یہ تین ہزار درہم میرے پاس ہیں۔ تو کیا آپ مجھے ان کا پتہ بتا سکتے ہیں کہ یہ رقم میں ان کی خدمت میں حاضر کر دوں جسے وہ اپنی مہم میں صرف کریں۔"

مسلم نے کہا کہ آخر مسجد میں دوسرے لوگ بھی ہیں تم میرے ہی پاس اس کے دریافت کرنے کو کیوں آئے ہو؟ اس نے کہا کہ سبب یہ ہے کہ میں نے آپ میں نیکوکاری اور پرہیزگاری کے آثار دیکھے تو یقین ہوا کہ آپ ضرور دوستانِ اہلبیتِ رسولؐ میں سے ہیں۔ جناب مسلم اس کے قریب ہیں آگئے اور کہا تم نے خوب پہچانا۔ میں تمہارے ہی بھائیوں میں سے ہوں۔ میرا نام مسلم بن عوسجہ ہے۔ مجھے تمہاری ملاقات سے بہت خوشی ہوئی اور اس

[1] طبری ج ۵ صفحہ ۲۰۴ ۔ ارشاد صفحہ ۲۱۵ [2] الاخبار الطوال صفحہ ۲۳۶

بات سے اور زیادہ مسرت حاصل ہوئی کہ تم اپنی خواہش میں کامیاب ہوئے اور تمہارے ذریعہ سے اہل بیت رسولؐ کو کچھ تقویت پہنچے گی۔ بے شک اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں ظالم ابن زیاد کو بھی اس کی اطلاع نہ ہو جائے لہٰذا تم مجھ سے عہد کرو کہ کسی سے اس کا اظہار نہ کرو گے۔

چنانچہ کافی اطمینان اور عہد و پیمان اور راز داری کے وعدوں کے ساتھ مسلم بن عوسجہ نے اقرار کیا کہ میں کل تمہیں جناب مسلم بن عقیل کی خدمت میں لے چلوں گا۔ معقل دوسرے دن جناب مسلم بن عوسجہ کے مکان پر آیا اور وہ اسے حضرت مسلم بن عقیل کے پاس لے گئے۔ اس نے آپ کی بیعت کی اور تین ہزار درہم جو لایا تھا آپ کی خدمت میں پیش کیے۔ اس کے بعد معقل کی یہ صورت تھی کہ دن دن بھر جناب مسلم کے پاس رہتا اور تمام حالات معلوم کرتا تھا اور رات کو ہر بات کی اطلاع ابن زیاد کو پہنچا دیتا تھا۔[1]

ہانی کے ابن زیاد سے بہت قدیم تعلقات تھے مگر صرف اس اندیشہ پر کہ کہیں ابن زیاد کو مسلم کے میرے یہاں قیام کی کچھ بھنک مل گئی ہو وہ آجکل ابن زیاد کی ملاقات کو جانے سے پرہیز کرتے تھے اور بیماری کے عذر کے ساتھ خانہ نشین ہو گئے تھے۔ ابن زیاد کو یہ فکر ہوئی کہ کسی طرح ہانی کو بلانا چاہیئے۔ چنانچہ اس نے ہانی بن عروہ کے پاس ملاقات کا پیغام بھیجا۔[2] ہانی کو اس وقت کسی وقتی خطرہ کا احساس نہیں ہوا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ابن زیاد کے دعوتی پیغام پر انہوں نے اپنے بارہ ہزار جوانوں میں سے کسی ایک کو بھی واقعہ سے اطلاع دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی بلکہ خود تن تنہا ابن زیاد کے پاس چلے گئے۔ وہاں پہنچے تو پہلے ہی سے ابن زیاد کا رنگ بدلا ہوا پایا۔ پہلے تو صورت دیکھتے ہی اس نے عرب کی ایک مثل زبان پر جاری کی کہ "اتتک بحائن رجلاہ" جس کا مطلب یہ ہوا کہ ہانی اپنے پیروں سے موت کی طرف آ رہے ہیں۔ پھر اس نے شریح قاضی کی طرف رخ کر کے یہ شعر پڑھا ؎

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۳۷ [2] الاخبار الطوال ص ۲۳۸ - طبری ج ۶ ص ۲۰۴

ارید حیوته و یرید قتلی — عذیرك من خلیلك من مراد

"یعنی میں تو اس کی زندگی چاہتا ہوں اور وہ میری جان لینے کا درپے ہے۔ خدا ہی سمجھے اس قبیلۂ مراد والے تمہارے دوست سے۔"

اس سے ہانی سمجھ گئے کہ بظاہر راز افشا ہو چکا ہے مگر انہوں نے کہا۔ "کیوں امیر کیا معاملہ ہے؟" اس نے بڑے غصے سے کہا کہ "ارے کتنے غضب کی بات ہے کہ تم نے اپنے گھر کو خلیفۂ وقت اور تمام مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا اڈہ بنایا ہے۔ تم نے مسلم بن عقیل کو بلا کر اپنے گھر میں رکھا ہے۔ ان کے لیے اسلحہ جمع کر رہے ہو۔ اپنے گرد و پیش کے گھروں میں ان کی مدد کیلئے آدمی جمع کر رہے ہو اور سمجھتے ہو کہ یہ باتیں سب مجھ سے چھپی رہیں گی۔"

ہانی نے پہلے ان باتوں کی صحت سے انکار کیا مگر جب اس نے معقل کو بلا کر سامنے کھڑا کر دیا۔ اور ہانی کو معلوم ہوا کہ یہ شخص جاسوس ہے تو اب ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا اور تھوڑی دیر کے لیے وہ مدہوش سے ہو گئے پھر انہوں نے اپنے ہوش و حواس کو جمع کر کے کہا۔ اب مجھ سے اصل حقیقت سنیئے، باور کیجئے، بخدا ایک لفظ بھی غلط نہ کہوں گا۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے مسلم کو نہ خود بلایا اور نہ مجھے ان کی تحریک کے متعلق کوئی علم تھا مگر وہ خود میرے پاس آ گئے اور میرے مکان پر قیام کے خواہش مند ہوئے۔ اب مجھے شرم دامنگیر ہوئی اور انکار نہ بن پڑا۔ اس طرح میں نے انہیں مہمان کر لیا اور پناہ دے دی۔ تاہم میں آپ سے یہ عہد کرتا ہوں میں آپ کے خلاف کوئی جارحانہ اقدام نہیں کروں گا اور ابھی آ کر اپنے کو آپ کے حوالہ کر دونگا۔ مگر اتنی اجازت دے دیجئے کہ میں جا کر مسلم سے کہہ دوں کہ میرے گھر سے نکل کر جہاں چاہیں چلے جائیں تاکہ ان کے پناہ دینے کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاؤں۔ پھر مجھے ان سے کوئی مطلب نہ رہے گا۔

ابن زیاد نے کہا "نہیں جب تک انہیں خود میرے پاس حاضر نہ کرو تم نہیں جا سکتے۔" ہانی نے کہا یہ تو نہیں ہو سکتا کہ میں اپنے مہمان کو بلا کر آپ کے سپرد کر دوں کہ آپ قتل کر دیں۔[1]"

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۳۸، طبری ج ۲ ص ۲۰۵ - ارشاد ص ۲۱۶

بات اتنی بڑھی کہ ابن زیاد نے کہا "تم کو انہیں لانا ہوگا" نہیں تو میں تمہارا سر قلم کرا دونگا ہانی نے کہا "ایسا ہوا تو آپ کے مکان کے گرد بجلیاں کوندتی ہونگی" ان کا خیال تھا کہ انکا قبیلہ ان کی مدد کرے گا۔ یہ سننا تھا کہ ابن زیاد کو زیادہ غصہ آیا اور کہا "اچھا! تم بجلیوں سے مجھے ڈراتے ہو۔ لاؤ۔ اسے میرے قریب لاؤ۔" سپاہی دوڑ پڑے۔ ہانی کو ظالم ابن زیاد کے قریب لائے۔ نتیجہ یہ تھا کہ بوڑھے لیکن بات کے پکے ہانی کا سر و چہرہ چھڑی کی ضرب سے خون میں رنگین ہوگیا۔ ہانی بالکل نہتے تھے۔ انہوں نے ایک سپاہی کی تلوار پر جو اُن کے پاس کھڑا تھا ہاتھ ڈالا کہ اس سے چھین لیں۔ ابن زیاد نے کہا۔ "اچھا اب تو تم خارجی قرار پا گئے۔ تمہارا خون ہمارے لیے حلال ہے۔" جلاد بے دردی سے انہیں کھینچ کر لے گئے اور قید خانے میں ڈال دیا[1]۔

بنی زبیدہ کا سردار عمرو بن الحجاج، ہانی بن عروہ کا برادر نسبتی تھا[2]۔

اسے اطلاع ہوئی کہ ہانی قتل کر ڈالے گئے تو وہ مذحج کے بہت سے زرہ پوش سوار لے کر دارالامارہ پر چڑھ دوڑا اور تلواروں کی جھنکار، گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنے ہانی کے دل میں رہائی کے توقعات پیدا کر دیے لیکن افسوس کہ شریح قاضی کی فہمائش اور اس کے کہنے سے کہ ہانی قتل نہیں ہوئے ہیں بلکہ بعض مصالح سے ایک محدود زمانہ تک نظر بند کر دیے گئے ہیں۔ وہ سب مطمئن ہو کر واپس گئے[3]۔

حضرت مسلم کے لیے یہ موقع بہت سخت تھا۔ ان کا پناہ دینے والا۔ وفادار اور مستقل مزاج بہادر ہانی بن عروہ ان کی وجہ سے زدو کوب کی توہین آمیز تکلیف برداشت کر کے دشمن کے قید خانہ میں تھا اور مسلم کے گرد گھر میں خاندان مراد کی عورتیں نالہ و شیون کر رہی تھیں[4]۔ کیا اب بھی مسلم بن عقیل چھپے بیٹھے رہتے یا اس وجہ سے کہ یہاں ان کا قیام معلوم ہو گیا ہے کسی دوسرے قابلِ اعتماد شخص کے یہاں جا کر مخفی ہو جاتے؟ ہر گز نہیں

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۰۶ - ارشاد ص ۲۱۷ [2] طبری ج ۶ ص ۲۰۷
[3] طبری ج ۶ ص ۱۹۵-۲۰۶-۲۰۷ - ارشاد ص ۲۱۷ - ۲۱۸ [4] طبری ج ۶ ص ۲۰۷ - ارشاد ص ۲۱۸

غیرت بنی ہاشم کا یہ تقاضا نہ تھا۔ انہوں نے یہ طے کر لیا کہ ہانی نہیں تو پھر میں بھی نہیں۔ طبری نے صاف طور پر تصریح کی ہے کہ مسلم کا جنگ کے لیے نکلنا اپنے ساتھیوں کی اطلاع کے بغیر تھا اور کوئی قرارداد اس دن کے متعلق نہ ہوئی تھی۔ وہ ایک مرتبہ اس وقت کھڑے ہو گئے جب کہ ان کو معلوم ہوا کہ ہانی بن عروہ مرادی زدو کوب کے بعد قید کیے گئے ہیں[1]۔

دینوری کا بیان ہے کہ جناب ہانی قتل کر دیے گئے اور ان کی شہادت کا حال سن کر جناب مسلم باہر نکلے[2]۔ ابن زیاد نے مسجد میں آکر پھر ایک تہدیدی تقریر کی۔ ابھی وہ منبر سے اترا نہ تھا کہ لوگ دوڑتے ہوئے "باب التمارین" سے مسجد میں داخل ہوئے یہ کہتے ہوئے کہ ابن عقیل آ گئے۔ ابن زیاد گھبرا کر منبر سے اُترا اور تیزی کے ساتھ قصر کے اندر جا کر دروازے قصر کے بند کر لیے[3]۔

واقعہ کی ناگہانی حیثیت کو دیکھتے ہوئے اب یہ توقع تو کی ہی نہیں جا سکتی تھی کہ وہ ۱۸ ہزار بیعت کرنے والے سب مسلم کے گرد جمع ہو جائیں گے اور جنگ میں ان کے ساتھ شرکت کریں گے اور پھر جب کہ کوفہ کے محلے بھی ایک دوسرے سے متصل نہیں تھے بلکہ کافی فاصلہ رکھتے تھے۔ ہاں یہ محلہ کہ جس میں مسلم کا قیام تھا۔ کافی وسعت رکھتا تھا اور اسی کے اطراف میں مسلم کے گرداگرد چار ہزار آدمی موجود تھے اور مسلم کی طرف سے جونہی "یامنصور امت" کا نعرہ بلند کیا گیا جو ان کا شعار یعنی امتیازی نعرہ جنگ تھا تو شر ماشری وہ چار ہزار آدمی جمع ہو گئے لیکن ظاہر ہے کہ اس محدود وقت میں جبکہ جنگ کے پہلے سے کچھ آثار نہ تھے وہ شاہی منظم فوج سے کہاں تک مقابلہ کے لیے تیاری کر سکے ہوں گے خصوصاً جبکہ ان چار ہزار میں بھی اکثر ایسے ہی عوام تھے جو نتائج پر غور کیے بغیر وقتی اقدامات پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور جن کا حقیقی شیعۂ آلِ رسولؐ ہونا ہرگز ثابت نہیں۔

بہرحال جناب مسلم نے اس مختصر لشکر کو ترتیب دیا اور پیشقدمی شروع کی مگر جناب مسلم

---

[1] طبری ج ۶ ص ۵۵ [2] الاخبار الطوال ص ۲۳۹ [3] طبری ج ۶ ص ۲۰۷ - ارشاد

دارالامارہ تک پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ وہ لوگ واپس جانا شروع ہوگئے اور پہنچتے پہنچتے صرف تین سو رہ گئے[1]۔ لیکن ابن زیاد اس خیال سے کہ مسلم کے ساتھ کوئی بڑی جمعیت ہے قصر کے اندر قلعہ بند ہوگیا اور مسلم نے بنی مراد کی ایک جماعت کو لیے ہوئے قصر کا محاصرہ کرلیا۔ رفتہ رفتہ دوسرے لوگ بھی آتے گئے یہاں تک کہ مسلم کے پاس کافی جمعیت ہوگئی اور ظہر سے شام تک برابر لڑائی ہوتی رہی[2]۔

موجودہ جمعیت کو جو مسلم کے ساتھ محاصرہ میں شریک تھی مختلف قبائل کے مخلوط مجمع پر مشتمل سمجھنا چاہیے اور قبائل کے روح رواں شیوخ و اشراف قبائل ہوتے ہیں جو حکومت کے ہوا خواہ اور پابند زبان تھے اور ابن زیاد نے بروقت پیش بندی یہ کی تھی کہ آج صبح سے شیوخ و اشراف کو بلا کر اپنے پاس زیر حراست رکھ لیا تاکہ ان سے حسب موقع کام نکالا جا سکے۔ باوجودیکہ ابن زیاد کے پاس محل میں اس وقت کوئی فوج نہیں تھی بلکہ قصر حکومت میں صرف تیس پولیس کے سپاہی تھے اور بیس آدمی اس کے مخصوصین اور رؤسائے قبائل میں سے[3] یا زیادہ سے زیادہ دو سو آدمی موجود تھے[4] اس لیے وہ کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن ایک طرف اس نے یہ کوشش کی کہ قصر کا دروازہ کھلنے نہ پائے[5]۔ دوسرے کچھ آدمی ادھر ادھر بھیج کر باہر سے سپاہی اکٹھا کر کے یہ انتظام کیا کہ شہر کی ناکہ بندی کی جائے یعنی چوراہوں اور عام راستوں پر پہرے بیٹھ جائیں کہ کوئی شخص مسلم کی مدد کو نہ آسکے اور صورت واقعہ کی بنا پر یہ امر لازمی تھا کہ مسلم کی مدد کو آنے والے مجتمع حیثیت سے کسی لشکر کے ساتھ نہ آتے بلکہ اکا دکا جس کو خبر ہوتی جاتی وہ تنہا یا اپنے بھائی بندوں کے ساتھ مسلم کی شرکت کے لیے آتا اور وہ فوراً گرفتار ہوجاتا تھا چنانچہ عبدالاعلیٰ بن یزید کلبی اپنے گھرانے کے کچھ نوجوانوں کو ساتھ لیے آرہے تھے جن کو کثیر بن شہاب نے گرفتار کر لیا اور محلہ بنی عمارہ کی طرف سے عمارہ بن صلخب ازدی نے ہتھیار جسم پر آراستہ کر کے چاہا تھا کہ

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۰۶ [2] طبری ج ۶ ص ۲۰۷ - ارشاد ص ۲۱۱ [3] طبری ج ۶ ص ۲۰۷ - ارشاد ص ۲۱۹
[4] الاخبار الطوال ص ۲۳۹ [5] طبری ج ۶ ص ۲۰۸

مسلم کے پاس آئیں لیکن محمد بن اشعث نے گرفتار کر لیا[1]۔ یہ دونوں جانباز مسلم وہانی کی شہادت کے بعد ابن زیاد کے حکم سے قتل کر ڈالے گئے[2]۔ اس طرح مسلم سے مختلف اطراف و جوانب کی مدد قطع ہوگئی۔ چنانچہ حبیب بن مظاہر، مسلم بن عوسجہ اور ابو ثمامہ صائدی ایسے خاص لوگ بھی جناب مسلم کے پاس پہنچنے سے قاصر رہ گئے۔ اس کے بعد وہ اشراف قبائل کو مجمع کے منتشر کرنے کا حکم دیا گیا۔ وہ لوگ دارالامارہ کے بالاخانہ پر چڑھ گئے اور انھوں نے اپنے قبیلہ والوں کو پکار پکار کر ہمدردانہ انداز میں قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا کہ عنقریب یزیدی حکومت شام کی جانب سے بہت بڑی فوجیں آنے والی ہیں اور اس صورت میں تمہارے جان و مال و اولاد سب تلف ہوجائیں گے دمشق سے فوجیں آنے کی خبر ہر طرف پھیلا دی گئی جس کے بعد یہ عالم ہوا کہ عورتیں اپنے گھروں سے نکل نکل کر اپنے باپ بھائی کے پاس آتیں اور کہتی تھیں کہ چلو واپس چلو، دوسرے لوگ کافی ہیں باپ یا بھائی اپنے بیٹے یا بھائی کے پاس آتا اور کہتا تھا کہ ارے کل دمشق سے لشکر آجائے گا تو پھر تم کیا کروگے۔ چلو لڑائی سے ہاتھ اٹھاؤ اور مجبور کر کے اسے اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شام ہوتے ہوتے صرف تیس آدمی حضرت مسلم کے پاس رہ گئے۔ آپ نے مسجد میں جاکر نماز مغرب پڑھی۔ نماز کے ختم ہونے کے بعد جب آپ باہر نکلے تو رفتہ رفتہ وہ بقیہ تیس بھی چلے گئے[3]۔ اب مسلم تنہا بازاروں میں پھرنے لگے اور کوئی اتنا تک نہ تھا کہ آپ کو راستہ بتا دے۔ آپ تاریکی شب میں یونہی چلے جا رہے تھے یہاں تک کہ قبیلۂ کندہ میں پہنچ گئے[4]۔ اس قبیلہ کی عورت طوعہ جو پہلے محمد ابن اشعث کی کنیز تھی اور اس کے آزاد کرنے کے بعد اسید حضرمی کے نکاح میں آئی جس سے ایک لڑکا بلال پیدا ہوا۔ یہ کہیں گیا ہوا تھا اور طوعہ گھر کے دروازہ پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ جناب مسلم نے اسے دیکھ کر بعد سلام پانی پینے کو مانگا۔ عورت خدا ترس تھی وہ گئی اور پانی لائی۔ جناب مسلم بیٹھ گئے اور پانی پیا۔ وہ برتن رکھنے گھر میں گئی۔ آئی تو دیکھا کہ یہ پھر بھی بیٹھے ہیں۔ اس نے کہا۔ "آپ پانی تو

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۰۸ [2] طبری ج ۶ ص ۲۱۴ [3] الاخبار الطوال ص ۲۴۰ [4] الاخبار الطوال ص ۲۴۰

پی چکے۔ اب اپنے گھر جایئے۔ مُسلم خاموش رہے۔ اس نے جب دوبارہ اور سہ بارہ کہا تو مسلم نے جواب دیا کہ" اے کنیزِ خدا۔ میرا اس شہر میں کوئی گھر نہیں ہے۔ کیا تم مجھے پناہ دے کر ثواب حاصل کر سکتی ہو۔ ممکن ہے کہ اس کے بعد میں کبھی اس کا معاوضہ تمہارے ساتھ کر سکوں" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔ "آپ ہیں کون اور واقعہ کیا ہے؟" فرمایا "میں مُسلم بن عقیل ہوں۔ یہاں لوگوں نے میرے ساتھ غداری کی۔ مجھ سے نصرت کے وعدے کیے اور اب میرا ساتھ چھوڑ دیا۔" اس نے کہا "اچھا۔ آپ مسلم ہیں؟" کہا "ہاں میں وہی ہوں"۔ یہ سننا تھا کہ وہ آپ کو اپنے گھر میں لے گئی اور مکان کے ایک مخصوص کمرے میں آپ کیلئے فرش بچھا دیا اور کھانا حاضر کیا مگر آپ نے کھانا نوش نہیں کیا۔ تھوڑی دیر میں اس کا لڑکا آیا اور اس نے ماں کو ایک کمرے میں بار بار آتے جاتے دیکھ کر سبب دریافت کیا اور اخفا کی کوشش محسوس کر کے زیادہ کد کرنے لگا یہانتک کہ طوعہ کو واقعہ کا اظہار کرنا پڑا اس تاکید کے ساتھ کہ اس کا کسی سے اظہار نہ کرنا۔ وہ سن کر خاموش ہو گیا اور رات گزرنے کا انتظار کرنے لگا[1]

ادھر ابن زیاد نے جب دیکھا کہ خطرہ بظاہر بالکل نہیں رہا تو اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ سائبانوں میں دیکھیں کہیں ابن عقیل ساتھ والے سائبانوں میں چھپے نہ ہوں۔ پورے طور پر اطمینان کر لینے کے بعد ابن زیاد نے عمرو بن نافع کو حکم دیا کہ شہر میں اعلان کر دے کہ آج عشاء کی نماز کے لیے ہر شخص کو مسجد میں آنا ضروری ہے۔ کوئی شخص نماز کے وقت اپنے گھر میں نہ رہے ورنہ اس کے جان و مال کی ذمہ داری امیر کے سر نہ ہوگی۔ تھوڑی دیر میں مسجد کے اندر لوگوں کا ہجوم ہو گیا۔ اقامت کہی گئی اور پسر زیاد نے اپنے دائیں بائیں محافظ کھڑے کر دیے۔ اس کے بعد نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد منبر پر جا کر تقریر کی کہ ابن عقیل نے جو مخالفت کا ہنگامہ اٹھا رکھا ہے تم نے دیکھا۔ جس کے گھر میں ابن عقیل کو پائیں گے اس کے جان و مال کی ذمہ داری ہم پر نہیں اور جو انہیں ہمارے پاس لائے گا اس کو ان کی دیت (خون بہا) دی جائیگی۔ اس کے

[1] طبری ج ۶ ص ۲۰۹ - ۲۱۰

بعد حصین بن تمیم کو حکم دیا کہ تمام شہر کی خانہ تلاشی کرے اور ابن عقیل کا پتہ لگائے۔ اور لوگوں کو عمرو بن حریث کی ذمہ داری پر چھوڑ کر خواب گاہ میں داخل ہو گیا[1]

طوعہ کا لڑکا بلال صبح ہوتے ہی محمد بن اشعث کے نوعمر لڑکے عبدالرحمٰن کے پاس گیا اور اسے مسلم کے اپنے گھر میں ہونے کی اطلاع دی اور وہ فوراً اپنے باپ کے پاس جو ابن زیاد کے دربار میں جا چکا تھا، پہنچا اور اس کے ذریعہ سے ابن زیاد کو مطلع کیا[2] ابن زیاد نے محمد بن اشعث کی سرکردگی میں مسلم کی گرفتاری کے لیے فوج روانہ کر دی۔ حضرت مسلم نے جو گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنی سمجھ گئے کہ فوج میری گرفتاری کے لیے آئی ہے۔ تلوار لے کر حجرے سے باہر نکلے۔ اتنی دیر میں فوجی گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ آپ نے حملہ کیا اور ایسا سخت کہ دشمنوں کو گھر سے باہر نکال دیا۔ وہ دوبارہ ہجوم کر کے اندر گھسے اور آپ نے دوبارہ انھیں باہر کر دیا۔ بیشک اس حملے میں بکر بن حمران احمری کی تلوار سے ان کے اوپر کا لب قطع ہو گیا اور نیچے کے لب پر بھی زخم آ گیا اور دو دانت شکستہ ہو گئے پھر بھی دشمنوں کو یہ یقین ہو گیا کہ مسلم پر یوں فتح پانا مشکل ہے لہٰذا وہ مکان کی چھت پر چڑھ گئے اور پتھر مارنے لگے۔ اس کے علاوہ سینٹھوں کے مٹھے آگ سے جلا کر اوپر سے پھینکنے لگے۔

جناب مسلم نے یہ بزدلانہ طریقۂ جنگ دیکھا تو آپ تلوار کھینچے ہوئے مکان سے باہر کوچہ میں آ گئے۔ محمد بن اشعث نے پکار کر کہا کہ آپ کے لیے امان ہے۔ خواہ مخواہ تلوار نہ چلایئے آپ نے جنگ جاری رکھی اور رجز پڑھنے لگے۔ جس کا مضمون یہ تھا کہ "میں نے قسم کھائی ہے، نہ قتل ہوں گا مگر آزادی کی حالت میں، اگرچہ موت ناگوار چیز ہے مگر بہرحال وہ ایک نہ ایک دن تو ہر شخص کے لیے ضروری ہے۔ مجھے تو یہ اندیشہ ہے کہ کہیں مجھ سے جھوٹ نہ بولا جائے اور دھوکا نہ دیا جائے۔ محمد بن اشعث نے کہا کہ "نہیں آپ سے جھوٹ نہیں کہا جائے گا اور نہ دھوکا دیا جائے گا۔ اطمینان رکھیے" مسلم جنگ کر کے تھک چکے

[1] الاخبار الطوال ص۲۴۰ [2] الاخبار الطوال ص۲۴۱ [3] طبری ج ۶ ص۲۱۱ - ارشاد ص۲۲۲

تھے اور زخموں سے چُور تھے۔ انھوں نے پوچھا "کیا واقعی مجھے امان ہے؟" اس نے کہا "ہاں آپ امان میں ہیں۔" جتنے محمد بن اشعث کے ساتھی تھے ان سب نے بھی امان کا وعدہ کیا، سوا ایک عمرو بن عبیداللہ بن عباس سلمی کے جس نے کہا "میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا" اور یہ کہہ کر وہ الگ ہٹ گیا۔ مسلم نے کہا۔ "دیکھو تم نے مجھے امان دی ہے۔ اس لیے میں تلوار اپنی نیام میں رکھتا ہوں اور اگر تم امان نہ دیتے تو میں کبھی اپنے کو تمھارے حوالے نہ کرتا۔" اتنی دیر میں ایک مرکب لایا گیا جس پر مسلم کو سوار کیا اور سپاہیوں نے گرد حلقہ کر کے آپ کی تلوار کمر سے نکال لی۔ یہ ہونا تھا کہ مسلم کا دل ٹوٹ گیا اور کہا۔ "یہ پہلی غداری ہے۔" محمد بن اشعث نے کہا۔ "مجھے امید ہے کہ مخصیں کوئی خطرہ پیش نہ آئے گا۔" مسلم نے کہا۔ "اچھا تو بس ایک امید ہی ہے اور امان کا وعدہ تمھارا کیا ہوا؟ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ۔" یہ کہہ کر رونے لگے۔ عمرو بن عبیداللہ بن عباس سلمی جس نے پہلے ہی وعدۂ امان سے انکار کیا تھا کہنے لگا۔

"جو ایسی مہم کے لیے کھڑا ہوا ہو جس کے لیے تم کھڑے ہوئے تھے اسے خطرہ دیکھ کر رونا تو نہیں چاہیے۔" مسلم نے کہا۔ "واللہ میں اپنے لیے نہیں روتا۔ میں تو حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کے لیے روتا ہوں جو میرے خط کو دیکھ کر کوفہ کی طرف روانہ ہو چکے ہوں گے۔" پھر آپ محمد بن اشعث کی طرف متوجہ ہوئے۔ کہا۔ "اے اللہ کے بندے! مجھے یقین ہے کہ تم مجھے امان دلوانے سے قاصر رہو گے۔ اب تم اتنا کرنا کہ ایک قاصد حسینؑ کے پاس بھیج دینا جو میری طرف سے ان سے جا کر کہہ دے کہ میں تو دشمنوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہوں اور یقین ہے کہ شام ہونے کے پہلے تک قتل ہو چکوں گا۔ مگر آپ ادھر آنے کا قصد نہ کیجیے اور اہل کوفہ کے فریب میں نہ آیئے۔ ان کے تمام وعدے بالکل غلط اور قول و قرار جھوٹے ہیں۔" ابن اشعث نے وعدہ کیا کہ "میں ضرور قاصد روانہ کر دوں گا۔" اس کے بعد محمد بن اشعث جناب مسلم کو لے کر دار الامارہ کے دروازہ پر پہنچا اور پہلے خود اجازت لے

کر ابن زیاد کے پاس گیا۔ اس سے تمام جنگ کی کیفیت اور پھر وعدۂ امان پر مسلم کو ساتھ لانے کا تذکرہ کیا۔ ابن زیاد نے کہا۔ "امان دینے والا تم کون تھے؟ ہم نے تمھیں کیا اس لیے بھیجا تھا کہ تم انھیں امان دو؟ ہم نے تو اس لیے بھیجا تھا کہ انھیں ہمارے پاس لے آؤ۔" ابن اشعث میں اب کہاں جرأت تھی کہ وہ اس کے بعد کچھ کہتا، خاموش ہو رہا۔[1] اس وقت دار الامارہ کے دروازہ پر بہت سے لوگ اجازت حضوری کے انتظار میں موجود تھے جن میں عمارہ بن عقبہ، عمرو بن حریث، مسلم بن عمرو باہلی اور کثیر بن شہاب مخصوص لوگ تھے اور ایک صراحی ٹھنڈے پانی سے بھری ہوئی دروازے کے قریب رکھی ہوئی تھی۔ جناب مسلم بہت پیاسے تھے۔ انھوں نے کہا۔ "تھوڑا سا پانی مجھے پلا دو۔" مسلم بن عمرو نے بڑے سخت الفاظ میں پانی پلانے سے انکار کیا۔ مگر عمرو بن حریث نے اپنے غلام کو حکم دیا کہ وہ مسلم کو پانی پلا دے۔ اس نے گلاس پانی سے بھر کر مسلم کے سامنے پیش کیا مگر جناب مسلم نے جب پانی پینا چاہا تو منہ سے خون بہنے لگا اور پانی کو رنگین کر دیا۔ دو مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ تیسری دفعہ دو دانت ٹوٹ کر گلاس میں گر پڑے۔ جناب مسلم نے مایوس ہو کر گلاس ہاتھ سے دے دیا اور کہا "معلوم ہوتا ہے پانی میری قسمت سے اٹھ چکا ہے۔" تھوڑی دیر میں ابن زیاد کا آدمی آیا اور مسلم کو اندر جانے کے لیے کہا۔ جب آپ ابن زیاد کے پاس پہنچے تو امیر کہہ کر اسے سلام نہیں کیا۔ ابن زیاد نے کہا "مسلم اب تم بچ نہیں سکتے۔ ابھی قتل کیے جاؤ گے۔" جناب مسلم نے کہا۔ "میں اس کے لیے تو تیار ہی ہوں مگر مجھے اتنا موقع دیا جائے کہ میں کسی اپنے شناسا سے جو یہاں ہو کچھ وصیت کر لوں۔" اس نے کہا۔ "اچھا جس سے چاہو وصیت کر دو۔" مسلم نے گرد و پیش نظر ڈالی تو عمر بن سعد کو پہچانا۔ آپ نے اس سے کہا کہ "تم قریش کے خاندان سے ہو۔ مجھے اس وقت تم سے کچھ راز کی باتیں کہنا ہیں، ذرا انھیں سن لو۔" حکومت وقت کا خوشامدی سننے کے لیے تیار نہ ہوا جس پر خود ابن زیاد نے کہا۔ "آخر سن لینے میں تمھارا

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۱۱

کیا حرج ہے؟" اس پر عمرِ سعد اٹھا اور مسلم کے ساتھ تھوڑی دور آگے بڑھ کر ایک ایسی جگہ بیٹھ گیا جہاں ابن زیاد کی نظر دونوں پر پڑ رہی ہو۔ جناب مسلم نے کہا۔ "مجھے ایک بات یہ کہنا ہے کہ میں جب سے کوفہ میں آیا ہوں سات سو درہم کا مقروض ہو گیا ہوں۔ تم میرے بعد میری تلوار اور زرہ فروخت کر کے یہ قرضہ ادا کر دینا۔ دوسری بات یہ ہے کہ میرے قتل ہونے کے بعد میری لاش ابن زیاد سے مانگ لینا اور اسے دفن کر دینا۔ تیسرے یہ کہ امام حسینؑ کے پاس کسی کو بھیج کر اس کے ذریعہ سے میرے واقعہ کی اطلاع کرا دینا تاکہ وہ واپس چلے جائیں اور اہلِ کوفہ کے فریب میں مبتلا نہ ہوں۔"

مسلم نے بطور راز یہ باتیں کہی تھیں مگر بدعہد عمر سعد نے ابن زیاد کے پاس آ کر کہا۔ آپ جانتے ہیں مسلم نے مجھ سے کیا کہا؟ یہ یہ باتیں انھوں نے مجھ سے کی ہیں۔ یہ ایسا شرمناک رویّہ تھا جسے ابن زیاد نے بھی بُرا جانا اور عرب کی یہ مثل زبان پر جاری کی کہ لا یخونک الامین ولکن قد یؤتمن الخائن۔ "امانتدار آدمی کبھی خیانت نہیں کرتا مگر کبھی کبھی غلطی سے خائن کو امانتدار بنا دیا جاتا ہے۔"[1] اس کے بعد اس نے ہر وصیت کے بارے میں اپنا فیصلہ سنایا۔ کہا۔ "تمھارے مال سے ہمیں مطلب نہیں۔ وہ فروخت ہو کر تمھارا قرضہ ادا کر دیا جائے، اور حسینؑ کے بارے میں یہ ہے کہ اگر وہ ہماری طرف نہ آئے تو ہمیں ان سے کوئی مطلب نہیں ہے مگر لاش، اس کے بارے میں ہم کوئی وعدہ کرنے کے لیے تیار نہیں کیونکہ تم نے ہماری مخالفت کی اور رعایا میں انتشار پیدا کیا لہٰذا ہم تمھاری لاش کے متعلق کسی احترام کے ذمہ دار نہیں ہیں۔"[2]

اس وصیت اور اس کے جواب کے بعد جو گفتگو جناب مسلم اور ابن زیاد میں ہوئی ہے وہ خاص طور پر دیکھنے کے قابل ہے۔ دیکھنا چاہیے کہ مسلم پر جو بغاوت کا الزام عائد کیا جاتا ہے اس کے بارے میں مسلم کیا جواب دیتے ہیں اور اپنے کوفہ آنے کی نوعیت کیا بتلاتے ہیں۔

---

[1] الاخبار الطوال ص۲۴۱-۲۴۲ [2] طبری ج ۶ ص۲۱۲

ابن زیاد نے کہا۔ ابن عقیل! تم یہاں آئے تھے لوگوں میں تفرقہ ڈالنے اور آپس میں فساد کرانے کہ ایک جماعت دوسری جماعت پر حملے کرے اور خانہ جنگی ہو۔" مسلم نے جواب دیا اور وہ جواب جس نے آخر تک حسینی مقاومت کی نوعیت کو ظاہر کر دیا۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں میں اس لیے نہیں آیا تھا بلکہ اس ملک والوں نے یہ ظاہر کیا کہ تمھارے باپ نے ان کے نیک آدمیوں کو قتل کیا اور ان کے خون بہائے اور ان میں (اسلام کی سادگی کو مٹا کر) وہ افعال و اعمال رائج کیے جو کسریٰ و قیصر کی سنت میں داخل تھے تو ہم آئے۔ اس لیے کہ ان کے اخلاق و عادات کی اصلاح کریں اور ان کو عدالت و انصاف اور تعلیماتِ قرآن پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دیں۔[1]

واقعۃً چونکہ مسلم کا کوئی طرزِ عمل ان کے اس بیان کے خلاف ظاہر بھی نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا یہ صفائی بغاوت کے الزام سے ان کے بری ہونے کے لیے کافی تھی مگر استبداد کے سامنے دلیل و برہان کام نہیں دیا کرتا۔ ابن زیاد نے حکم دیا کہ انھیں قصر کے بالاخانہ پر لے جایا جائے وہاں ان کی گردن قلم کی جائے اور پھر سر کے ساتھ ہی جسم کو نیچے گرا دیا جائے اور اس کے لیے وہی بکر بن حمران احمری[2] جس کی تلوار سے جناب مسلم کے لب و دہن پر زخم آیا تھا نامزد کیا گیا۔ جناب مسلم انتہائی صبر و سکون سے تکبیر، استغفار اور صلوات کے اوراد کے ساتھ دارالامارہ کے کوٹھے پر تشریف لے گئے اور ان کے سر کو جدا کر کے جسم کو قصر سے نیچے پھینک دیا گیا۔[3] روز سہ شنبہ ۸ ذی الحجہ سنہ ۶۰ھ جناب مسلم نے جنگ شروع کی[4] اور روز چہارشنبہ ۹ ذی الحجہ کو شہادت پائی۔[5]

اس کے بعد سے شہر میں خوف و دہشت کی عملداری اور رعب و ہیبت کا پورا دور دورہ تھا۔ لوگ گھروں سے نکلنا خطرناک سمجھتے تھے اس لیے ہر طرف سناٹا تھا اور ایک کو ایک کی خبر نہ تھی۔

---

[1] طبری ج ۶ ص۲۱۴۔ ارشاد ص۲۲۵ [2] دینوری نے اس کا نام احمر بن بکیر لکھا ہے (الاخبار الطوال ص۲۴۲)
[3] طبری ج ۶ ص۲۱۳۔ ارشاد ص۲۲۶۔ [4] طبری ج ۶ ص۲۱۵ [5] ارشاد۔ دینوری نے شہادت جناب مسلم کی تاریخ سہ شنبہ ۳ ذی الحجہ سنہ ۶۰ ہجری درج کی ہے (الاخبار الطوال ص۲۴۲) یہ درست نہیں معلوم ہوتی۔

انتہا یہ تھی کہ وہی ہانی بن عروہ جن کے ہمراہ رکاب ۱۲ ہزار مسلح سوار ہوتے تھے اور جن کے قتل کر دیے جانے کی غلط خبر پر دارالامارۃ کھنچی ہوئی تلواروں کے حلقہ میں آگیا تھا رسیوں میں جکڑ کر بازار میں لائے جا رہے تھے اور وہاں آواز دے رہے تھے "کہ کہاں ہیں میرے قبیلہ بنی مذحج کے بہادر! ہائے افسوس کہ اس وقت بنی مذحج مجھے نظر نہیں آتے۔" لیکن افسوس کوئی متنفس بھی ان کی طرف رخ کرتا نظر نہ آتا تھا۔ یہاں تک کہ ابن زیاد کے ترکی غلام نے اپنی تلوار سے ان کے سر و تن میں جدائی کر دی[1]

ابن زیاد نے مسلم و ہانی کے سرہائے بریدہ ہانی بن ابی حبہ ہمدانی اور زبیر بن اروح تمیمی کے ہاتھ واقعہ کی مختصر روداد کے ساتھ روانہ کیے اور ان دونوں نے تفصیلات جا کر زبانی بھی بیان کیے۔ یزید نے جواباً اس کارنامہ پر بڑی شاباشی دی اور لکھا کہ تم نے وہی کیا جس کی ہمیں تم سے امید تھی۔ اب خود حسینؑ بن علیؑ کے بارے میں تمہاری کارگزاری دیکھنا ہے[2]

[1] طبری ج ۶ ص ۲۱۳ - ۲۱۴ ۔ ارشاد ص ۲۲۶ [2] الاخبار الطوال ص ۲۴۲

انیسواں باب:

مکّہ سے کربلا تک

سفرِ امام حسینؑ ۔ منازلِ سفر اور کربلا میں ورود

کوفہ میں انقلاب، مسلم و ہانی کی شہادت، یہ سب کچھ ہو گیا مگر ظاہر ہے کہ اس سب کی اطلاع بر وقت مکّہ میں کیونکر پہنچ سکتی تھی۔ حضرت امام حسینؑ کو مسلم کا خط پہنچ چکا تھا کہ یہاں تشریف لائیے۔ سب آپ کی اطاعت کے لیے تیار ہیں۔ یہ خط جناب مسلم نے عابس بن ابی شبیب شاکری کے ہاتھ[1] اپنی شہادت سے ستائیس دن پہلے ۱۲ ذیقعد کو لکھا تھا[2] اس خط کے پہنچنے کے بعد آپ کے لیے کوفہ کا سفر اختیار کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ پھر بھی عام حالات میں اتنی جلدی کی ضرورت نہیں تھی کہ آپ حج کے دو ایک دن باقی رہنے کے باوجود حج کو ترک فرما دیں اور مکہ سے نکل کھڑے ہوں۔ یہ غیر متوقع صورت یقینی طور پر نہایت اہم ہنگامی اسباب کا پتہ دیتی ہے۔

آپ کی افتادِ طبیعت اور ذوقِ عبادت کا لازمی تقاضا بھی یہ تھا کہ آپ اس سال کے حج کو جو آپ کی زندگی میں آخری تھا مکمل فرما کر روانگی کا ارادہ کرتے لیکن ایک دم ہوا یہ کہ حج کی تکمیل میں دو دن باقی تھے کہ آپ نے حج کو عمرہ سے بدل کر مکہ معظمہ سے روانگی اختیار فرمالی۔ اس کے اسباب عام طور پر لوگوں کے سامنے کچھ نہ تھے کیونکہ حرمِ الٰہی کے اندر کوئی فوج و لشکر نہ تھا جسے سب دیکھتے مگر حاجیوں کے لباس میں فوج کے سپاہی آئے ہوئے تھے اور انھیں یہ ہدایت تھی کہ حسینؑ جس حال میں بھی ہوں ان کو گرفتار کر لو۔ یہ راز اس وقت کھلا جب آپ مکّہ سے باہر

[1] طبری ج ۶ ص ۲۱۱ [2] ارشاد ص ۲۲۳

آ چکے تھے اور فرزدق شاعر نے آپ سے راستے میں ملاقات کی اور پوچھا کہ فرزندِ رسولؐ اتنی جلدی کس لیے کہ حج بھی نہ ہو سکا؟ امامؑ نے جواب دیا کہ "اگر میں اتنی جلدی نہ کرتا تو وہیں گرفتار کر لیا گیا ہوتا۔[1]" بس یہ چیز وہ تھی جس نے امام حسینؑ کو عراق کی طرف اس قدر تعجیل کے ساتھ روانگی پر مجبور کر دیا۔

نتیجہ آخر امامؑ کے پیشِ نظر تھا یعنی شہادت جس پر آپ کی وہ تقریر گواہ ہے جو آپ نے مکہ معظمہ سے روانگی کے وقت فرمائی تھی۔ آپ نے کہا تھا کہ "موت فرزندِ آدم کے گلے کا ہار ہے اور مجھے اپنے اسلاف کی ملاقات کا اشتیاق ہے۔ اتنا ہی جتنا یعقوبؑ کو یوسفؑ سے ملنے کا اشتیاق تھا اور میرے لیے بہت اچھی ہے وہ جگہ جہاں میں کشتہ ہو کر گروں گا۔ گویا میری آنکھوں میں پھر رہا ہے وہ سماں کہ میرے جوڑ بند کو صحرائی درندے[2] جدا کر رہے ہیں، کوئی چارہ کار نہیں اس دن سے جو خطِ تقدیر میں گزر چکا۔ خدا کی مرضی میں ہم اہل بیت کی مرضی ہے۔ ہم اس کے امتحان پر صبر کرتے ہیں اور صابروں کے اجر کو حاصل کرتے ہیں۔ رسولؐ سے ان کے جسم کے ٹکڑے الگ نہیں ہو سکتے۔ جو شخص ہمارے ساتھ اپنی جان کی قربانی پر آمادہ اور خدا سے ملاقات پر تیار ہو وہ ہمارے ساتھ سفر کرے۔ میں کل صبح کو انشاء اللہ روانہ ہو جاؤں گا۔ یہ تھی وہ تقریر جو آپ نے گرد و پیش کے لوگوں کے سامنے کی تھی۔ اس رات کو جس کی صبح ہوتے ہوتے آپ مکہ سے روانہ ہو گئے۔ اس کے علاوہ ایک واقعہ یہ ہے کہ اثنائے سفر میں آپ ہر منزل پر جناب یحییٰ اور ان کی شہادت کو یاد کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ دنیا کی بے قدری کے لیے اللہ کے نزدیک یہ کافی ہے کہ اس دنیا میں یحییٰ بن زکریا کا سر قلم ہو کر بنی اسرائیل کے زناکار کے سامنے بطور تحفہ بھیجا گیا۔[3]

یہ بھی حقیقت میں اپنے مستقبل کی طرف ایک اشارہ ہی تھا جو آپ باربار فرما رہے تھے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۱۸ [2] یعنی دشمنانِ انسانیت [3] ارشاد ص ۲۶۸

پھر بھی آپ کے لیے اپنے عمل کو امکانی تحفظات کے حدود سے آگے بڑھنے دینا روا نہیں تھا۔ آپ کے لیے مکہ سے فوراً علیحدگی اختیار کرنا ان خطرات کی بنا پر جو اس وقت یہاں پیدا ہو گئے تھے لازمی قرار پا چکا تھا۔ اس کے بعد آپ کہاں جاتے؟ عقلاً اسی جگہ کہ جہاں کے لوگ انتہائی اصرار کے ساتھ آپ کو بلا رہے تھے۔

اس صورت میں کسی شخص کا یہ پہلو آپ کے سامنے لانا کہ اس میں جان کا خطرہ ہے تحصیل حاصل اور فضول تھا۔

جان کا خطرہ تو تھا ہی مگر اس خطرہ کے ہوتے ہوئے کسی ایسی طرف جانا قرین مصلحت ہو سکتا تھا جہاں کا جانا "ناخواندہ مہمان" کی حیثیت رکھتا ہو یا ایسی جگہ جہاں کے لوگ الحاح و زاری کے ساتھ دعوت دے رہے تھے۔

خطرہ کے معنیٰ کیا ہو سکتے تھے؟ یہی کہ جان جائے گی، مگر جان جانا تو ناگزیر تھی، پھر یہ جان ایک انسانی اور مذہبی فرض کی ادائیگی کے سلسلہ میں کیوں نہ جائے جس کا نام ہے وعدہ وفائی۔ طالبانِ ہدایت پر اتمامِ حجت اور خلقِ خدا کی فریاد رسی۔ اسی لیے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ حضرت امام حسینؑ نے ان لوگوں کے خیال کی کبھی رد نہیں کی جو اہل کوفہ پہ بے اعتمادی کا اظہار کرتے تھے اور یہ نہیں کہا کہ مجھے ان سے امید ہے کہ وہ اب کی اپنی بات پر قائم رہیں گے مگر اسی کے ساتھ آپ نے ہمیشہ اپنی روانگی کو ان کی طرف ضروری بتلایا جیسا کہ فرزدق سے گفتگو میں جس کا تذکرہ ابھی آ چکا آپ نے فرمایا۔ خانہ کعبہ میں گرفتاری کا جو خطرہ تھا۔ اس کا ایک حد تک یقینی قرینہ سامنے آ گیا۔ اس وقت جب آپ کی مکہ سے روانگی کے موقع پر حاکمِ مکہ عمرو بن سعید بن العاص کی طرف سے ایک فوجی دستہ نے یحییٰ بن سعید کی قیادت میں بیرونِ شہر آ کر آپ سے مزاحمت کی اور آپ کو واپس لے جانا چاہا حضرت نے واپس جانے سے انکار کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ طرفین میں تھوڑی دیر آویزش بھی ہوئی مگر امام حسینؑ کے ساتھ والے پوری بہادری کے ساتھ مقابل جماعت کی مزاحمت کو

رکنے پر تیار تھے اس لیے ان لوگوں کو ہٹنے پر مجبور ہونا پڑا اور قافلہ روانہ ہوگیا۔[1] دینوری نے لکھا ہے کہ خود عمرو بن سعید نے اس اندیشہ سے کہ صورتِ حال کچھ نازک نہ ہو جائے اپنے پولیس آفیسر کو واپس آنے کی ہدایت بھیج دی۔[2] یہ سہ شنبہ ۸ ذی الحجہ ۶۰ھ کا واقعہ ہے اور اسی روز کوفہ میں ابن زیاد کی فوج سے جناب مسلم بن عقیل کا مقابلہ ہو رہا تھا اور دوسرے دن جبکہ وہ شہید ہوئے حضرت امام حسینؑ مکہ سے نکل کر وادئ غربت میں راستہ طے فرما رہے تھے۔[3]

آپ کے قیامِ مکہ کے دوران میں علاوہ آپ کے خاص خاص عزیزوں کے جو مدینہ سے ساتھ آئے تھے کچھ مخصوص افراد اہلِ حجاز میں سے اور کچھ اہلِ بصرہ میں سے آپ کی خدمت میں پہنچ گئے تھے۔ اب یہ سب آپ کے ساتھ ساتھ روانہ ہوئے۔[4]

مکہ سے کربلا تک کے سفر میں حضرت امام حسینؑ نے جن منزلوں میں قیام کیا تھا انکی تفصیل کے متعلق مورخین میں اختلاف ہے۔ جہاں تک تاریخی واقعات کی مدد سے ثابت ہوتا ہے ان کی ترتیب واقعات کے ساتھ ساتھ حسب ذیل ہے :-

۱۔ **صفاح** : یہ مکہ معظمہ سے روانگی کے بعد پہلی وہ جگہ ہے جس کا نام ملتا ہے۔ یہاں قیام نہیں ہوا بلکہ رہ گزر ہی میں فرزدق بن غالب شاعر سے ملاقات ہوئی[5] اور فرزدق نے کوفہ کی حالت بیان کی کہ لوگوں کے دل آپ کی طرف مگر تلواریں ان کی بنی امیہ کے ساتھ ہوں گی۔ آپ نے فرمایا "تم سچ کہتے ہو لیکن ہر بات اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور ہر دن وہ ایک نیا کرشمہ قدرت کا دکھاتا ہے۔ اللہ کی تقدیر اگر ہماری دلی خواہشوں کے مطابق ہو تو ہم اس کا شکر کریں گے اور ادائے شکر کے لیے اسی سے مدد کے طالب ہوں گے اور اگر قضائے الٰہی ہمارے مطلب میں سدِ راہ ہوئی تو انسان کے لیے یہی کیا کم ہے کہ اس کی نیت میں سچائی اور اس کے ضمیر میں پارسائی ہو"[6]

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۱۶ - ۲۱۸ - ارشاد ص ۲۲۹ [2] الاخبار الطوال ص ۲۴۴ [3] ارشاد ص ۲۲۸ دینوری کا بیان ہے کہ جس دن جناب مسلم کی شہادت ہوئی اسی دن امام حسینؑ مکہ سے روانہ ہوئے (الاخبار الطوال ص ۲۴۳)
[4] ارشاد ص ۲۲۸ [5] الاخبار الطوال ص ۲۴۵ [6] طبری ج ۶ ص ۲۱۸، ارشاد ص ۲۲۸

اس کے معنی یہ ہوئے کہ مقصد نیک ہو اور نیت بخیر، اس کے بعد "ہر چہ بادا باد"۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ امام حسینؑ کسی کے وعدوں پر اعتماد کر کے منزل عمل میں گامزن نہیں ہوئے تھے بلکہ محض اللہ کے بھروسے پر اس کے عائد کردہ فرض کی تکمیل کے لیے امتحان گاہِ عمل میں آگئے تھے۔

۲۔ **تنعیم** : اس جگہ یمن کا ایک قافلہ آتا نظر آیا جس سے حضرت نے کچھ اونٹ اپنے اسباب اور ساتھیوں کی سواری کے لیے کرایہ پر لیے اور ان کے مالکوں سے فرمایا کہ تم میں سے جو عراق تک جانا چاہے اسے ہم پورا کرایہ دیں گے اور پھر کچھ انعام بھی عطا کریں گے اور جو راستے سے واپس جانا چاہے گا اسے ہم اتنی دور کا کرایہ دے کر واپس کر دیں گے۔ چنانچہ کچھ لوگ ان میں سے حضرت کے ساتھ عراق تک جانے کے لیے تیار ہوئے۔[1]

اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ سے آپکی روانگی اچانک بغیر کسی تیاری کے ہوئی تھی اس لیے آپ اپنے ساتھیوں کے لیے مکہ معظمہ سے باربرداری اور سواری کا سامان بھی پورا مہیا نہیں فرما سکے تھے۔

اسی منزل پر عبداللہ بن جعفر اور یحییٰ بن سعید بن العاص نے امام سے آکر ملاقات کی۔ واقعہ یہ تھا کہ جب امام حسینؑ مکہ معظمہ سے روانہ ہو رہے تھے اس وقت عبداللہ بن جعفر مدینہ میں تھے۔ ظاہری حالات کی بنا پر امام کا مدینہ سے آنا اس خطرہ کے ماتحت ہوا تھا کہ وہاں کے حاکم کو یزید کا یہ فرمان پہنچ چکا تھا کہ اگر حسینؑ بیعت نہ کریں تو ان کا سر روانہ کیا جائے اور اب مکہ سے روانگی اس اندیشہ کی وجہ سے ہو رہی تھی کہ یہاں کچھ لوگ حاجیوں کے لباس میں بھیج دیے گئے تھے تاکہ جس طرح ممکن ہو حسینؑ کو قتل کر ڈالیں یا گرفتار کر کے شام کی سمت بھیج دیں۔ اس موقع پر عبداللہ بن جعفر نے عون و محمد اپنے دونوں فرزندوں کے ہاتھ امام کے نام یہ خط بھیجا کہ میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ آپ میرا خط دیکھتے ہی یہاں واپس آ جائیے کیونکہ اس طرف جدھر آپ کا قصد ہے مجھے آپ کی ہلاکت اور آپ کے اہلبیتؑ کے تباہ ہونے کا اندیشہ

---

[1] ارشاد ص ۲۴۹

ہے اور اگر آپ دنیا سے اٹھ گئے، تو زمین کی روشنی رخصت ہو گئی کیونکہ آپ طالبانِ ہدایت کے لیے نشانِ راہ اور مومنین کی امیدوں کا مرکز ہیں۔ سفر میں جلدی نہ کیجیے۔ میں خود اس خط کے پیچھے آ رہا ہوں۔ عون و محمد یہ خط لے کر امام کے قافلہ سے راستے میں جا کر ملحق ہوئے۔ اس کے بعد عبداللہ بن جعفر، حاکم مدینہ عمرو بن سعید بن العاص کے پاس گئے اور اس سے گفتگو کر کے ایک امان کا پروانہ امام حسینؑ کے لیے حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔[1] عبداللہ کی خواہش کے مطابق عمرو بن سعید نے اس پر مہر کی اور اپنے بھائی یحییٰ بن سعید کو عبداللہ کے ساتھ کیا۔ عبداللہ، یحییٰ کے ساتھ اس تحریر کو لیے ہوئے مدینہ سے روانہ ہوئے اور راستے میں امام سے ملحق ہو کر تحریر آپ کے سامنے پیش کی۔ آپ خوب جانتے تھے کہ مرکزی حکومت کی پالیسی کے خلاف ایک مقامی حاکم کے امان نامہ کی کیا وقعت ہے۔ آپ نے عبداللہ بن جعفر کی رائے سے اختلاف کیا اور فرمایا کہ مجھے اب یہاں قیام کرنا مناسب نہیں ہے اور عمرو بن سعید کے نام اس تحریر کا جواب لکھ کر ان کے سپرد کیا۔[2] عبداللہ کچھ مجبوریوں کی وجہ سے اس سفر میں ساتھ نہ جا سکتے تھے۔ انھوں نے عون و محمد کو حضرت کے ساتھ رہنے کی ہدایت کی اور خود مدینہ واپس ہو گئے۔[3]

۳۔ ذاتِ عراق : شیخ مفیدؒ نے عبداللہ بن جعفر اور یحییٰ بن سعید کی واپسی کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ حضرت امام حسینؑ تیزی کے ساتھ عراق کی سمت راہ قطع کرتے رہے یہاں تک کہ ذاتِ عراق میں پہنچ کر قیام فرمایا۔[4]

۴۔ بطن الرمہ اور حاجر : "بطن الرمہ" ایک وادی کا نام تھا جس کے ایک مقام کا نام "حاجر" ہے۔ اس منزل سے آپ نے قیس بن مسہر کو جو اہلِ کوفہ کے فرستادہ آپ

---

[1] عمرو بن سعید مکہ اور مدینہ کا مشترکہ حاکم تھا۔ بظاہر جس وقت امام روانہ ہوئے اس وقت عمرو بن سعید اور اس کا بھائی یحییٰ بن سعید دونوں مکہ میں موجود تھے اور یحییٰ کی قیادت میں ایک دستہ نے آ کر امام کا راستا روکا۔ اس کے بعد امام عراق کے راستے پر روانہ ہوئے اور یہ دونوں مدینہ چلے گئے۔ وہاں عبداللہ بن جعفر نے عمرو بن سعید سے ملاقات کر کے یہ خط حاصل کیا اور یحییٰ بن سعید کے ساتھ امام سے منزلِ تنعیم پر آ کر ملاقات کی۔ [2] طبری ج ۶ ص ۲۱۹۔ ارشاد ص ۲۲۰

[3] ... ص ۲۱۰ ... ۲۲۹ [4] ارشاد ص ۲۲۹

کے ساتھ تھے۔ اہلِ کوفہ کے نام خط دے کر روانہ فرمایا۔[1] اس خط کا مضمون یہ تھا:-

"یہ خط ہے حسینؑ بن علیؑ کا برادرانِ ایمانی و اسلامی کے نام۔ بعد سلام اور حمدِ الٰہی کے معلوم ہو کہ مسلم بن عقیل کے خط سے مجھے تمھارے حالات کی درستی اور میری نصرت پر تم لوگوں کی ہم آہنگی کا علم ہوا جس پر میں نے خدا سے دعا کی کہ وہ ہمارے معاملہ کو بہترین صورت پر انجام تک پہنچائے اور تم کو اس کے متعلق بہترین اجر عطا فرمائے۔ میں مکہ معظمہ سے روز شنبہ ۸ ذی الحجہ کو روانہ ہو گیا ہوں۔ جب میرا خط تمھیں پہنچے تو انتظامات مکمل اور تیزی سے اپنا نظام درست کر لینا کیونکہ چند ہی روز میں میں تمھارے یہاں پہنچنے والا ہوں۔ انشاء اللہ۔ والسلام۔"[2]

بعض کا قول ہے کہ اس خط کو عبداللہ بن یقطر کے ہاتھ بھیجا تھا۔[3] اس خط کے مضمون اور نوعیت سے صاف ظاہر ہے کہ مکہ سے نکلنے کے بعد یہ سب سے پہلی منزل ایسی منزل تھی جہاں اطمینان کی سانس لی جا سکتی تھی ورنہ اس خط کو پہلے ہی روانہ کر دیا جاتا۔

قیس اس خط کو لے کر کوفہ کی طرف روانہ ہوئے مگر جب قادسیہ پہنچے تو حصین کی فوج نے گرفتار کر لیا اور انھیں ابن زیاد کے پاس بھیج دیا۔ ابن زیاد نے کہا کہ اگر جان بچانا چاہتے ہو تو منبر پر جا کر حسینؑ بن علیؑ کے خلاف تقریر کرو اور ان کی مذمت بیان کرو۔ قیس یہ سن کر منبر پر چلے گئے۔ مجمع ہمہ تن گوش تھا کہ دیکھیں حسینؑ کا قاصد حسینؑ کے خلاف کیا کہتا ہے مگر انھوں نے مقصدِ امام کی اشاعت کا یہ ایک ممکن موقع پیدا کیا تھا۔ حمد و ثنائے الٰہی کے بعد مجمع کو مخاطب کیا اور کہا:-

"ایہا الناس! اس وقت خلقِ خدا میں بہترین شخص حسینؑ بن علیؑ ہیں جو رسولؐ کی بیٹی حضرت فاطمہؑ کے فرزند ہیں۔ میں انہی کا بھیجا ہوا تمھارے پاس آیا ہوں۔ تمھارا فرض ہے کہ ان کی نصرت کے لیے قدم آگے بڑھاؤ اور ان کی آواز پر لبیک کہو۔"

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۴۵ [2] الاخبار الطوال ص ۲۴۷، طبری ج ۵ ص ۲۲۲۔ ارشاد ص ۲۲۳ [3] ارشاد ص ۲۲۳

ابن زیاد غضب ناک ہوا اور اس نے حکم دیا کہ انھیں قصر کے اوپر سے زمین پر گرا دو۔ بے رحموں نے انھیں نیچے گرا دیا جس سے ان کے اعضاء چکنا چور ہو گئے۔[1]

جب آپ اس منزل سے آگے بڑھے تو ایک چشمہ پر عبداللہ بن مطیع سے ملاقات ہوئی جو عراق سے واپس ہو رہے تھے۔ انھوں نے بھی آپ سے مکہ چھوڑنے کا سبب دریافت کیا اور اہلِ کوفہ کی دعوت کا حال سنکر دوسرے تمام مشورہ دینے والوں کی طرح آپ کے کوفہ جانے سے اختلاف کیا۔[2]

۵۔ زرود: اس منزل سے قریب جو چشمہ تھا اس پر زہیر بن القین کا خیمہ نصب تھا۔ یہ حج کر کے مکہ سے واپس ہوئے تھے اور کوفہ جا رہے تھے۔[3] شروع میں ان کو خاندانِ رسولؐ سے کوئی عقیدت نہ تھی بلکہ عام طور پر وہ اہلِ شام کے ہم عقیدہ سمجھے جاتے تھے جس کو اس زمانہ میں "عثمانی" مسلک کہا جاتا تھا۔ مگر امام حسینؑ کی نباض فطرت و بصیرت انکی باطنی استعداد کو دیکھ رہی تھی۔ آپ نے ان کے پاس پیغام بھیجا کہ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ خاندانِ رسولؐ سے جو وحشت عام طور سے اس گروہ میں پیدا کر دی گئی تھی اس کی بنا پر انھوں نے ملنے سے انکار کر دینا چاہا مگر ان کی بیوی نے جو ان کے ساتھ تھیں کہا کہ واہ کیا غضب کی بات ہے کہ رسولؐ کا فرزند تمھارے پاس پیغامِ ملاقات بھیجے اور تم مسترد کر دو۔ اس بات سے متاثر ہو کر یہ امام حسینؑ کے پاس گئے اور کچھ اس طرح صفائی سے ان کے سامنے امام حسینؑ نے اپنے معاملہ کو پیش کیا کہ وہ ہمہ تن آپ کے موافق ہو گئے اور بڑے خوش خوش اپنی قیامگاہ پر پہنچ کر انھوں نے حکم دیا کہ ہمارا خیمہ یہاں سے اکھاڑ کر اصحابِ حسینؑ کے خیموں کے پاس لگا دیا جائے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور ان سے کہا کہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ میکے چلی جائیں پھر ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ "میں نے امام حسینؑ کے ساتھ مرنے کا مضبوط ارادہ کر لیا ہے جو شخص تم میں سے ہمارے ساتھ شہید ہونا چاہے وہ میرے ساتھ رہے اور جو نہ چاہے

---

[1] الاخبار الطوال صفحہ ۲۴۵۔ ارشاد صفحہ ۲۳ [2] الاخبار الطوال صفحہ ۲۴۶ طبری ج ۶ صفحہ ۲۲۴ [3] الاخبار الطوال صفحہ ۲۴۶ طبری ج ۶ صفحہ ۲۲۴۔

وہ یہیں سے علیحدہ ہو جائے۔" چنانچہ ساتھ والے سب علیحدہ ہو گئے۔[1]

صورتِ حال سے صاف ظاہر ہے کہ امام کی گفتگو زہیر سے کچھ خوش آئند توقعات یا امید افزا تصورات پر مبنی نہ تھی بلکہ صفائی کے ساتھ اس انجامِ کار کا انکشاف کر دیا گیا تھا جس پر ابھی تک عام نگاہوں میں توقعات کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ کیا اس کے بعد بھی یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ حضرت امام حسینؑ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر منزلِ عمل میں گامزن ہو رہے تھے۔

پھر بھی چونکہ عوام بالکل ظاہر بین ہوتے ہیں لہٰذا ان کے توقعات امام کی نسبت بہت خوش آئند تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ فرزندِ رسولؐ اپنے باپ بھائی کے پایۂ تخت اور عراق ایسے مردم خیز صوبہ کے صدر مرکز کوفہ کی طرف خود وہیں کے باشندوں کے اصرار و طلب پر جا رہے ہیں وہاں پہنچ کر تخت و تاج، فوج و لشکر اور حشم و خدم سب کچھ مہیا ہو گا۔ حضرت شاہِ عراق تسلیم کیے جائیں گے اور آپکی ذات میں امامت و سلطنت دوش بدوش جمع ہو گی۔ ان خیالات کو پیش نظر رکھ کر دنیا کے لالچی لوگ بھی جوق درجوق آپ کے ساتھ شامل ہو رہے تھے اور راستے میں آپ کا وہ مختصر قافلہ جو مکہ سے نکلتے وقت خاص خاص لوگوں پر مشتمل تھا اب ایک مختصر لشکر کی صورت اختیار کر چکا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بیشک کوئی بادشاہ ہے جو اپنے مرکزِ سلطنت کی طرف جا رہا ہے لیکن زرود سب سے پہلا وہ مقام تھا جہاں سے روانہ ہونے پر پریشانی کا آغاز ہوا جبکہ عبداللہ بن سلیم اور نذری بن مشمعل دونوں اسدی شخصوں نے جو مکہ معظمہ سے فراغتِ حج کے بعد بہت تیزی سے روانہ ہو کر زرود میں حضرت سے ملحق ہو گئے تھے۔ ایک شخص کو کوفہ کی طرف سے آتے دیکھا۔ امام اس کو دیکھتے ہی ٹھہر گئے تھے کہ کچھ حالات کوفہ کے معلوم کریں لیکن اس نے حسینی قافلہ کو دیکھ کر رخ دوسری جانب کر دیا لہٰذا امام آگے بڑھ گئے۔ ان دونوں اسدی شخصوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس سے کچھ کوفہ کے حالات دریافت کرنا چاہئیں۔ چنانچہ یہ دونوں قافلہ سے جدا ہو کر انتہائی تیز رفتاری

---

[1] طبری ج ۶ صفحہ ۲۲۴۔ ارشاد صفحہ ۲۳۱۔ ۲۳۲۔ الاخبار الطوال صفحہ ۲۴۶

ہے اور اگر آپ دنیا سے اٹھ گئے تو زمین کی رونق رخصت ہوگئی کیونکہ آپ طالبانِ ہدایت کے لیے نشانِ راہ اور مومنین کی امیدوں کا مرکز ہیں۔ سفر میں جلدی نہ کیجیے۔ میں خود اس خط کے پیچھے آرہا ہوں۔ عوؔن و محمدؔ یہ خط لے کر امام کے قافلہ سے راستے میں جاکر ملحق ہوئے۔ اس کے بعد عبدؔاللہ بن جعفر، حاکم مدینہ عمؔرو بن سعید بن العاص کے پاس گئے اور اس سے گفتگو کرکے ایک امان کا پروانہ امام حسینؑ کے لیے حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔[۱] عبداللہ کی خواہش کے مطابق عمؔرو بن سعید نے اس پر مُہر کی اور اپنے بھائی یحیؔیٰ بن سعید کو عبداللہ کے ساتھ کیا۔ عبداللہ، یحیٰی کے ساتھ اس تحریر کو لیے ہوئے مدینہ سے روانہ ہوئے اور راستے میں امام سے ملحق ہوکر تحریر آپ کے سامنے پیش کی۔ آپ خوب جانتے تھے کہ مرکزی حکومت کی پالیسی کے خلاف ایک مقامی حاکم کے امان نامہ کی کیا وقعت ہے۔ آپ نے عبداللہ بن جعفر کی رائے سے اختلاف کیا اور فرمایا کہ مجھے اب یہاں قیام کرنا مناسب نہیں ہے اور عمؔرو بن سعید کے نام اس تحریر کا جواب لکھ کر ان کے سپرد کیا۔[۲] عبداللہ کچھ مجبوریوں کی وجہ سے اس سفر میں ساتھ نہ جاسکتے تھے۔ انھوں نے عون و محمد کو حضرت کے ساتھ رہنے کی ہدایت کی اور خود مدینہ واپس ہوگئے۔[۳]

۳۔ ذاتِ عراق : شیخ مفیدؒ نے عبداللہ بن جعفر اور یحیٰی بن سعید کی واپسی کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ حضرت امام حسینؑ تیزی کے ساتھ عراق کی سمت راہ قطع کرتے رہے یہاں تک کہ ذاتِ عراق میں پہنچ کر قیام فرمایا۔[۴]

۴۔ بطن الرمہ اور حاجر : "بطن الرمہ" ایک وادی کا نام تھا جس کے ایک مقام کا نام "حاجر" ہے۔ اس منزل سے آپ نے قیس بن مسہر کو جو اہلِ کوفہ کے فرستادہ آپ

---

[۱] عمرو بن سعید مکہ اور مدینہ کا مشترکہ حاکم تھا۔ بظاہر جس وقت امام روانہ ہوئے اس وقت عمرو بن سعید اور اس کا بھائی یحیٰی بن سعید دونوں مکہ میں موجود تھے اور یحیٰی کی قیادت میں ایک دستہ نے آکر امام کا راستہ روکا۔ اس کے بعد امام عراق کے راستے پر روانہ ہوئے اور یہ دونوں مدینہ چلے گئے۔ وہاں عبداللہ بن جعفر نے عمرو بن سعید سے ملاقات کرکے یہ خط حاصل کیا اور یحیٰی بن سعید کے ساتھ امام سے منزلِ تنعیم پر آکر ملاقات کی۔ [۲] طبری ج ۶ ص ۲۱۹۔ ارشاد ص ۲۲۰

[۳] ارشاد ص ۲۲۹ [۴] ارشاد ص ۲۲۹۔

کے ساتھ ساتھ تھے۔ اہلِ کوفہ کے نام خط دے کر روانہ فرمایا۔[۱] اس خط کا مضمون یہ تھا:-

"یہ خط ہے حسینؑ بن علیؑ کا برادرانِ ایمانی و اسلامی کے نام۔ بعد سلام اور حمدِ الٰہی کے معلوم ہو کہ مسلم بن عقیل کے خط سے مجھے تمہارے حالات کی درستی اور میری نصرت پر تم لوگوں کی ہم آہنگی کا علم ہوا جس پر میں نے خدا سے دعا کی کہ وہ ہمارے معاملہ کو بہترین صورت پر انجام تک پہنچائے اور تم کو اس کے متعلق بہترین اجر عطا فرمائے۔ میں مکہ معظمہ سے روز شنبہ ۸ ذی الحجہ کو روانہ ہوگیا ہوں۔ جب میرا خط تمھیں پہنچے تو انتظامات مکمل اور تیزی سے اپنا نظام درست کرلینا کیونکہ چند ہی روز میں میں تمھارے یہاں پہنچنے والا ہوں۔ انشاء اللہ۔ والسلام۔"[۲]

بعض کا قول ہے کہ اس خط کو عبداللہ بن یقطر کے ہاتھ بھیجا تھا۔[۳] اس خط کے مضمون اور نوعیت سے صاف ظاہر ہے کہ مکّہ سے نکلنے کے بعد یہ سب سے پہلی منزل ایسی منزل تھی جہاں اطمینان کی سانس لی جاسکتی تھی ورنہ اس خط کو پہلے ہی روانہ کردیا جاتا۔

قیسؔ اس خط کو لے کر کوفہ کی طرف روانہ ہوئے مگر جب قادسیہ پہنچے تو حصؔین کی فوج نے گرفتار کرلیا اور انھیں ابن زیاد کے پاس بھیج دیا۔ ابن زیاد نے کہا کہ اگر جان بچانا چاہتے ہو تو منبر پر جاکر حسینؑ بن علیؑ کے خلاف تقریر کرو اور ان کی مذمت بیان کرو۔ قیس یہ سنکر منبر پر چلے گئے۔ مجمع ہمہ تن گوش تھا کہ دیکھیں حسینؑ کا قاصد حسینؑ کے خلاف کیا کہتا ہے مگر انھوں نے مقصدِ امام کی اشاعت کا یہ ایک ممکن موقع پیدا کیا تھا۔ حمد و ثنائے الٰہی کے بعد مجمع کو مخاطب کیا اور کہا:-

"ایہا الناس! اس وقت خلقِ خدا میں بہترین شخص حسینؑ بن علیؑ ہیں جو رسولؐ کی بیٹی حضرت فاطمہؑ کے فرزند ہیں۔ میں انھی کا بھیجا ہوا تمھارے پاس آیا ہوں۔ تمھارا فرض ہے کہ ان کی نصرت کے لیے قدم آگے بڑھاؤ اور ان کی آواز پر لبیک کہو۔"

---

[۱] اخبار الطوال ص ۲۴۵ [۲] الاخبار الطوال ص ۲۴۷، طبری ج ۵ ص ۲۲۳۔ ارشاد ص ۲۳ [۳] ارشاد ص ۲۳

سے اس جانے والے تک پہنچ گئے اور صاحب سلامت کے بعد اس کا قوم و قبیلہ اور نام و نسب دریافت کیا۔ معلوم ہوا بکیر بن مشعبہ اسدی ہے تو انھوں نے بھی اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ ہم بھی قبیلۂ بنی اسد میں سے ہیں۔ ذرا تم سے اپنے شہر کی حالت دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے کہا کہ "ہاں سنو میں کوفہ سے باہر نہیں آیا تھا کہ مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ قتل کیے گئے اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ان کی لاش کے پاؤں میں رسی باندھ کر بازار میں گھسیٹا جا رہا ہے۔[1] بڑی وحشت ناک خبر تھی۔ دونوں آدمیوں نے سن لیا اور موقع شناسی سے کام لے کر اس وقت اسے دل میں رکھ لیا۔ یہاں تک کہ وقت اس کے اظہار کی اجازت دے۔

۴۔ **ثعلبیہ**: اس منزل پر دوسرے دن شام کے وقت جب امام حسینؑ نے قیام کیا تو دونوں اسدی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تسلیم بجا لائے۔ حضرت نے سلام کا جواب دیا۔ انھوں نے عرض کیا کہ ہمیں ایک اطلاع دینا ہے۔ حضور فرمائیں تو سب کے سامنے عرض کریں اور اگر ارشاد ہو تو علیحدہ تخلیہ میں کہیں؟ حضرت نے ایک نظر حاضر الوقت اشخاص پر ڈالی اور فرمایا "ان لوگوں سے کسی راز داری کی ضرورت نہیں ہے"۔ انھوں نے کہا "کہ آپ نے اس سوار کو دیکھا تھا جو کل شام کے وقت آ رہا تھا؟" فرمایا "ہاں! اور میں نے اس سے کچھ حالات بھی دریافت کرنا چاہے تھے۔" انھوں نے کہا کہ "ہم نے حضور کی منشا کے مطابق اس سے حالات دریافت کیے اور وہ ہمارے ہی قبیلہ کا آدمی ہے اور بہت سمجھ دار، سچا اور دانش مند شخص ہے۔ اس نے ہم سے بیان کیا کہ وہ کوفہ سے باہر نہیں آیا تھا کہ مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ دونوں شہید کر دیے گئے اور ان کی لاشیں بازاروں میں کھینچی گئیں۔"

ظاہری تمام امیدوں کا ختم ہو جانا، لیکن ایک رئیس قوم اور سردار کی حیثیت سخت موقع پر بہت ذمہ دارانہ ہوتی ہے اس لیے کہ تمام لوگوں کی نظریں اسی پر ہوتی ہیں۔ اگر کہیں اس کو اضطراب ہوا تو پھر تمام رفقاء اور ساتھیوں پر مایوسی کا چھا جانا اور اضطراب کا پیدا ہو جانا لازمی امر ہے۔ اسی لیے اس موقع پر جب یہ اچانک خبر امام حسینؑ کو پہنچی تو آپ نے صرف اتنا کیا کہ چند بار کہا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ رَحْمَۃُ اللّٰہِ عَلَیْہِمَا اور بس خاموش ہو گئے۔[1] دینوری نے کلمۂ استرجاع کے بعد ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے کہ عند اللہ نحتسب انفسنا (یعنی) "ہم اللہ کے یہاں حساب کرتے ہیں اپنی جانوں کا"[2] مطلب اس کا یہ ہوا کہ اسی کی راہ میں ہم اپنی جانوں کو نثار کرتے ہیں اور وہی معاوضہ دینے والا ہے۔

اسدی جو ایک رات تک اس وحشت ناک خبر کو اپنے دل میں رکھ کر اس سے پورا پورا اثر لے چکے تھے اور نتائج کو ہر طرح سوچ کر دل ہی دل میں رائے قائم کر چکے تھے ان سے اپنے دل کی بات چھپائی نہ گئی اور وہ بیساختہ بول اٹھے کہ "خدا کا واسطہ اپنی اور اپنے گھر بھر کی جان کو خطرہ میں نہ ڈالیے۔ یہیں سے واپس ہو جائیے کیونکہ کوفہ میں آپ کا نہ کوئی مددگار رہے نہ دوست بلکہ ہمیں خوف ہے کہ پورا کوفہ آپ کے خلاف ہی ہوگا" ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایک ہنگامی اضطراب اور تاثر کے جذبہ سے جو ہمدردی کا مشورہ دیا جائے اس کا جواب زیادہ سنجیدہ دلائل کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ حضرت امام حسینؑ خود پہلے ہی سے انجام پر مطلع تھے اور آپ کا سفر جن نتائج کو پیش نظر رکھ کر تھا ان میں اس خبر کے آنے سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی لیکن دوسرے افراد کے لیے وقتی جذبات کے مقابل میں عقلی دلائل کے پیش کرنے کا محل نہیں ہوا کرتا۔ اس لیے حضرت نے اس ہنگامی جذبہ کے ماتحت مشورہ کا جواب بالکل متضاد ایک فطری جذبہ

مسلم نے چکھا۔" حضرت متوجہ ہوئے دونوں اسدیوں کی طرف اور فرمایا "جب یہ نہ ہوئے تو ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے"[1]۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے یہ بھی کہا کہ آپ کی اور مسلم کی برابری نہیں۔ آپ کوفہ میں پہنچ جائیں تو کوفہ کے لوگ آپ کی مدد کے لیے دوڑ پڑیں گے۔" حضرت نے اس خیال کی کوئی تائید نہیں کی اور خاموشی اختیار فرمائی[2]

رات یہیں گزاری گئی۔ سحر کے وقت آئندہ کی منزلوں کے لیے کافی پانی ساتھ لینے کے بعد آگے روانہ ہوئے یہاں تک کہ زبالہ پہنچے[3]

۷۔ **زبالہ**: اس منزل پہ آیاس بن عثل طائی جو شعراء میں سے تھا محمد بن اشعث کا بھیجا ہوا خط لے کر امام کے پاس پہنچا۔ چونکہ جناب مسلم نے دشمن کے ہاتھوں میں گرفتار ہونے اور اپنی شہادت کا یقین ہو چکنے کے بعد یہ وصیت کی تھی کہ میرے بعد حضرت امام حسینؑ کو اطلاع دے دی جائے کہ کوفہ کی یہ حالت ہے اور آپ کے مددگار اب کوفہ میں موجود نہیں ہیں اس لیے آپ اب یہاں آنے کا ارادہ نہ کیجیے چنانچہ یہ خط بھیجا گیا اور منزل زبالہ پہ امام کے پاس پہنچا[4]

اس قاصد نے یہ بھی اطلاع دی کہ قیس بن مسہر قتل کر دیے گئے[5]

قرائن بتلاتے ہیں کہ وہ افراد جن کی موجودگی میں جناب مسلم کی خبرِ شہادت بیان کی گئی تھی واقعی نہایت مخصوص رازدار ہستیاں تھیں۔ اسی لیے اس مجمع کے روبرو مسلم کی خبر شہادت ظاہر ہونے کے بعد بھی عام اہلِ قافلہ سے وہ راز ہی کی حیثیت سے مخفی رہی مگر حضرت نے اب ان واقعات کو اہلِ قافلہ سے مخفی رکھنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ آپ جانتے تھے [illegible] ہو گئے ہیں کہ آپ ایک ایسے ملک کی طرف جا رہے ہیں جہاں لوگ آپ کی سلطنت تسلیم کر چکے

[1] الاخبار الطوال ص ۲۴۶۔ طبری ج ۶ ص ۲۲۵۔ ارشاد ص ۲۲۳ [2] طبری ج ۶ ص ۲۲۵۔ ارشاد ص ۲۲۳
[3] طبری ج ۶ ص ۲۱۱ [4] طبری ج ۶ ص ۲۰۳ [5] الاخبار الطوال ص ۲۴۷

ہیں لہٰذا آپ کو یہ منظور نہ ہوا کہ وہ لوگ غلط فہمی میں مبتلا رہیں اور حقیقت حال سے تاریکی میں رہنے کی وجہ سے آپ کا ساتھ دیں۔ آپ کو یقین تھا کہ جب آپ صورتِ حال کا اظہار کر دیں گے تو بس وہی جان نثار آپ کے ساتھ رہ جائیں گے جو حقیقتاً آپ کے مقصد کے ساتھ ہمدردی رکھتے اور آپ کی نصرت میں جان تک سے ہاتھ دھونا پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے حسب ذیل بیان کے ذریعے سے تمام اہلِ قافلہ کو صورتِ حال سے مطلع فرمایا:-

"ہمیں یہ دردناک خبر معلوم ہوئی ہے کہ مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ قتل کر ڈالے گئے اور ہماری اطاعت کے دعویداروں نے ہماری نصرت سے ہاتھ اٹھا لیا اس لیے جو شخص تم میں سے واپس جانا چاہے وہ واپس چلا جائے۔ ہماری طرف سے اس پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ والسلام۔"

نتیجہ وہی ہوا جو معلوم تھا کہ اس اعلان کے ساتھ ہی لوگ متفرق ہونا شروع ہوئے اور تقریباً سب دائیں بائیں روانہ ہو گئے۔ یہاں تک کہ زیادہ تر وہی لوگ جو مدینہ سے آپ کے ساتھ آئے تھے باقی رہ گئے[1]

۸۔ **بطن عقیق**[2]: اس منزل پر قبیلۂ عکرمہ کا ایک شخص[3] عمرو بن لوذان[4] ملا اور اس نے بتایا کہ ابن زیاد کی طرف سے قادسیہ اور عذیب کے درمیان ناکہ بندی ہو گئی ہے اور اس نے کہا کہ برائے خدا واپس جائیے۔ آپ کے سامنے سوا تلواروں اور نیزوں کے کوئی چیز آنے والی نہیں ہے اور خطوط لکھنے والوں پر بھروسا نہ کیجیے۔ وہی لوگ سب سے پہلے آپ سے لڑنے کے لیے آئیں گے۔ امام حسینؑ نے اس کی خیر خواہی پر اسے دعائے خیر دی اور آگے روانہ ہوئے[5]

بظاہر یہ سننے کے بعد کہ قادسیہ کے ناکے پر فوجوں کا پہرہ ہے اور وہاں پہنچنا اپنے

[1] الاخبار الطوال ص ۲۴۷۔ طبری ج ۶ ص ۲۲۶۔ ارشاد ص ۲۲۳ [2] شیخ مفید نے اس منزل کا نام بطنِ عقبہ لکھا ہے (ارشاد ص ۲۲۳) [3] الاخبار الطوال ص ۲۴۷ [4] ارشاد ص ۲۲۳۔ [5] الاخبار الطوال ص ۲۴۷۔ ارشاد ص ۲۲۳، ۲۲۴

کوبقینی طور پر دشمن کے ہاتھ میں گرفتار کرا دیتا ہے آپ نے سمتِ سفر میں ذرا تبدیلی فرمائی اور اسی لیے قادسیہ کہ جس کا ہر کوفہ جانے والے کے محلِ گزر میں واقع ہونا ضروری تھا اور جہاں قیس بن مسہر گرفتار کیے گئے تھے آپ کے منازلِ سفر میں واقع نہیں ہؤا اور آپ کا اس فوج سے تصادم نہیں ہؤا جو حصین کی سرکردگی میں قادسیہ کے حدود میں مقیم تھی۔

۹۔ سراۃ : بطنِ عقیق سے روانہ ہو کر امام نے یہاں رات بسر کی[1]

۱۰۔ شراف : طبری اور شیخ مفید کی تصریح کے مطابق ثعلبیہ و زبالہ کے بعد اس منزل پر امام نے حکم دیا کہ پانی بھر لو اور مشکیں اور چھاگلیں پُر کر لو[2] اس منزل سے آگے بڑھے اور اب

[illegible]

پہلی تاریخ دوپہر کو امام حسینؑ کا قافلہ منزلِ شراف کے حدود سے آگے بڑھا تھا۔ قادسیہ سے تین میل کے فاصلہ پر[3] کہ آپ کے اصحاب میں کسی نے کہا۔ "اللہ اکبر"۔ امام نے فرمایا، بے شک اللہ سب سے بڑا ہے مگر اس وقت تکبیر کہنے کی وجہ؟ اس نے کہا، مجھے خرمے کے درخت دکھائی دے رہے ہیں۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ کوئی آبادی نزدیک ہے۔ اصحاب میں سے کچھ لوگوں نے کہا کہ اس جگہ تو کبھی ہم نے درخت خرما دیکھے نہیں۔ حضرت نے فرمایا۔ پھر تم ہی دیکھو کیا دکھائی دیتا ہے؟ انھوں نے کہا، ہم کو تو گھوڑوں کی گردنیں[4] یا کنوتیاں[5] نظر آتی ہیں۔ حضرت نے فرمایا، میں بھی یہی دیکھتا ہوں۔

۱۱۔ ذو حسم : مخالف فوج کو ادھر متوجہ پا کر امام حسینؑ نے اپنے اصحاب سے پوچھا کہ یہاں کوئی ایسی محفوظ جگہ ہے جسے ہم اپنی پشت پر قرار دے کر دشمن سے سامنے کی جانب سے مقابلہ کریں۔ مطلب یہ تھا کہ چاروں طرف سے گھرنے کا امکان باقی نہ رہے۔ لوگوں نے کہا یہ ذو حسم[6] پہاڑ موجود ہے جو آپ کے بائیں پہلو کی طرف ہے۔ آپ اس کی طرف متوجہ

---

[1] الاخبار الطوال صفحہ ۲۴۷ [2] طبری ج ۶ صفحہ ۲۲۷ ارشاد صفحہ ۲۳۳ - ۲۳۴ [3] طبری ج ۶ صفحہ ۲۲۷
[4] طبری ج ۶ صفحہ ۲۲۷ [5] ارشاد صفحہ ۲۳۴ [6] دینوری نے ذو حشم لکھا ہے (الاخبار الطوال صفحہ ۲۴۷)

ہو جیے۔ اگر ہم دشمن کے پہلے اس حد تک پہنچ گئے تو مقصد حاصل ہو جائے گا۔ حضرت نے اس رائے کو پسند فرمایا اور بائیں طرف کا رُخ کیا۔ آنے والی سپاہ نے جو یہ دیکھا تو اس نے بھی اسی طرف کا رُخ کر دیا۔ مگر امام وہاں پہلے پہنچ گئے تھے۔ اصحاب کو حکم دیا کہ خیمہ نصب کر دیے جائیں فوراً تعمیل کی گئی۔ اتنی دیر میں وہ فوج بھی قریب پہنچ گئی۔ معلوم ہؤا کہ حُر بن یزید ریاحی ایک ہزار کی فوج کے ساتھ سدِّ راہ ہونے کے لیے آیا ہے[1] چونکہ امام کوفہ کے عام راستے پر نہیں جا رہے تھے جو قادسیہ سے ہو کر گزرتا تھا اس لیے حصین کی فوج سے تصادم نہ ہؤا جو قادسیہ میں پڑی ہوئی تھی مگر جاسوسوں نے حصین کو آپ کے اس طرح بچ کر آگے بڑھ جانے کی اطلاع دے دی تھی اس لیے حصین نے حُر کو اس ایک ہزار فوج کے ساتھ آپ کا راستہ روکنے کے لیے آگے روانہ کیا[2] دوپہر کا وقت اور گرمی کا موسم[3] اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ناکہ بندی پر معین فوج کے حلقہ سے بہت دور دور جا رہے تھے اس لیے حُر کو آپ تک پہنچنے کے لیے غیر معمولی تگ و دو کرنا پڑی اور ریگستان میں بغیر پانی ساتھ لیے ہوئے بہت تیز چلنا پڑا اس لیے یہاں پہنچتے پہنچتے فوج کے سوار اور گھوڑے سب ہی کی پیاس کے مارے حالت تباہ تھی۔

امام اپنے اصحاب سمیت عمامے سروں پر رکھے، تلواریں حمائل کیے کھڑے تھے کہ دشمن کے ہانپتے ہوئے گھوڑے اور سوار سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ آثار پیاس کی شدت کے گواہ تھے اور صورت سوال۔ حسینؑ ایک حساس دل رکھتے تھے جس میں انسانی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ آپ کے لیے دشمن کی موجودہ حالت ناقابلِ برداشت تھی۔ آپ نے اپنے جوانوں کو حکم دیا کہ ان کو پانی پلاؤ اور تمام فوج کو پوری طرح سیراب کر دو۔ حکم

---

[1] الاخبار الطوال صفحہ ۲۴۷، طبری ج ۶ صفحہ ۲۲۷ [2] طبری ج ۶ صفحہ ۲۲۷ - ۲۲۸ [3] الاخبار الطوال صفحہ ۲۴۸

کی دیر بھی اطاعتِ امام پہ کمربستہ جوان کھڑے ہو گئے، اور سب کو سیراب کیا[1]۔ حالت یہ تھی کہ پیالے، لگنیں، طشت پانی سے بھرتے تھے اور گھوڑوں کے پاس لے جاتے تھے۔ جب ہر گھوڑا تین، چار، پانچ دفعہ پی کر منہ ہٹا لیتا تھا تب دوسرے گھوڑے کے پاس لے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ راکب و مرکب سب سیراب ہو گئے۔ علی بن طعان محاربی حُر کا ایک ساتھی تھا۔ وہ کہتا ہے کہ میری حالت پیاس سے بہت تباہ تھی اور سب سے آخر میں میں پہنچا۔ جب امام حسینؑ نے میری اور میرے گھوڑے کی پیاس کو دیکھا، فرمایا "راویہ (یعنی شتر آبکش کو) بٹھا لو۔" میری زبان میں "راویہ" مشک کو کہتے تھے اس لیے میں اس کے معنی نہ سمجھا۔ حضرت نے فرمایا "جمل (یعنی اونٹ) کو بٹھا لو۔" میں نے اونٹ کو بٹھایا۔ حضرت نے فرمایا، اب پانی پیو۔ مگر میں اتنا بدحواس تھا کہ جتنا پینے کی کوشش کرتا پانی زمین پر بہتا اور مجھ تک نہ پہنچتا۔ امام نے کہا مشک کے دہانے کو اپنی طرف موڑ لو۔ پھر بھی میری سمجھ میں نہ آیا۔ تب حضرت خود اٹھے اور مشک کے دہانے کو ٹھیک کر کے مجھے دیا۔ میں نے خود بھی پانی پیا اور اپنے گھوڑے کو سیراب کیا[2]۔

امام حسینؑ کی اس بلند ظرفی کا جو اثر مخالف سردار یعنی حُر کے دل پر قائم ہوا اس کے ظاہر ہونے کا ابھی وقت نہ آیا تھا لیکن کم از کم وہ ششدر رہ گیا ہو گا کہ اس احسان کے بعد اب اس بزرگ فطرت انسان سے کس طرح گفتگو کرے۔ امام نے بھی اپنے فطری استقلال و اطمینان کی وجہ سے اس وقت کچھ نہ پوچھا کہ تم کیوں آئے ہو اور کیا مطلب ہے؟ فوج حُر کے سپاہی اپنے گھوڑوں کے سایہ میں باگیں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے بیٹھ گئے[3]۔ یہاں تک کہ ظہر کی نماز کا وقت آیا اور امام حسینؑ نے حجاج بن مسروق جعفی کو اذان کا حکم دیا اور انھوں نے اذان کہی۔ جب نمازِ جماعت کی صفیں تیار ہو گئیں تو امام اپنے نماز کے لباس میں خیمہ سے برآمد ہوئے اور اقامت کا حکم دیا۔ اس کے بعد آپ نے حُر سے فرمایا کہ تم ہمارے ساتھ نماز پڑھو گے یا اپنے ساتھیوں کو الگ نماز پڑھانا چاہتے ہو؟ حُر نے کہا نہیں، آپ نماز پڑھائیے اور ہم سب آپ کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔ چنانچہ

[1] الاخبار الطوال ص۲۴۷۔ [2] ... ۲۴۷ ... [3] ... ۲۲۸ ...

ایسا ہی ہوا اور دونوں جماعتوں نے امامؑ کے پیچھے نماز ادا کی[1]۔

نماز کے بعد حضرت نے اس جماعت کی طرف رخ کیا اور حمد و ثنائے الٰہی کے بعد حُر اور اس کی فوج کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد کیا۔ "اے گروہِ مردم! میں خدا کی بارگاہ میں اور تمھارے سامنے اپنی صفائی پیش کرتا ہوں۔ میں تمھاری طرف اس وقت تک نہیں آیا جب تک کہ تمھارے خطوط میرے پاس نہیں گئے کہ آپ ہماری طرف آئیے۔ ہمارا کوئی امام نہیں ہے۔ شاید خدا آپ کے ذریعہ سے ہمیں ہدایت پر مجتمع کر دے۔ اب اگر تم اپنی بات پر قائم ہو تو میں آ ہی گیا ہوں۔ اپنے ارادہ پر قائم رہوں اور اگر تم میرے آنے سے ناراض ہو تو میں واپس چلا جاؤں وہیں جہاں سے آیا ہوں۔" اس تقریر کے بعد خاموشی چھائی اور کوئی جواب نہیں ملا[2]۔ آخر حضرت اپنے خیمہ میں تشریف لے گئے اور آپ کے اصحاب آپ کے خیمہ میں مجتمع ہو گئے۔ حُر اس خیمہ میں جو اس کے لیے لگایا گیا تھا داخل ہوا اور اس کے کچھ ساتھی اس کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ دوسرے لوگ متفرق طور پر اسی میدان میں اسی شان سے کہ سپاہیوں نے اپنے گھوڑوں کی باگیں ہاتھوں میں لے لیں ان ہی کے سایہ میں دوپہر کا وقت گزرنے تک بیٹھے رہے[3]۔ عصر کا وقت ہوا تو امام حسینؑ نے اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ روانگی کی تیاری کرو۔ پھر آپ نے باہر آ کر عصر کی نماز کا اعلان کیا اور اسی صورت سے حضرت کی اقتدا میں دونوں گروہوں نے نماز پڑھی۔ نماز کے بعد آپ نے پھر مجمع کی طرف رخ کیا اور حمد و ثنائے الٰہی کے بعد فرمایا "اگر تقویٰ اختیار کرو اور حقدار کا حق پہچانو تو خدا کی رضامندی حاصل کرو گے۔ حقیقتاً ہم اہلِ بیتؑ امتِ اسلامیہ کی فرمانروائی کے ان لوگوں سے زیادہ مستحق ہیں۔ جو آج اس منصب کے غلط دعویدار ہیں اور مسلمانوں پر ستم ڈھاتے ہیں لیکن اگر تم ہم کو ناپسند کرتے ہو اور ہمارے حق کا اقرار نہیں رکھتے ہو اور اس رائے کے خلاف ہو جو تمھارے خطوط اور قاصدوں کے بیانات سے ظاہر ہو رہی تھی تو میں واپس چلا جاؤں گا[4]۔" پھر کی مہرِ خاموشی ٹوٹی اور اس نے کہا "نہیں تو بخدا خبر بھی نہیں کہ یہ خطوط کیسے ہیں؟ جن کا

[1] الاخبار الطوال ص۲۴۷، طبری ج ۶ ص۲۲۸۔ [2] الاخبار الطوال ص۲۴۸۔ طبری ج ۶ ص۲۲۸۔ [3] طبری ج ۶ ص۲۲۸۔
[4] طبری ج ۶ ص۲۲۸۔ ارشاد ص۲۲۴ - ۲۲۶

آپ حوالہ دے رہے ہیں۔
امام نے عقبہ بن سمعان سے فرمایا لاؤ وہ تھیلے جن میں ان لوگوں کے خطوط بھرے ہوئے ہیں۔ عقبہ نے دو تھیلے خطوط سے بھرے ہوئے لاکر سامنے رکھے اور ان میں سے خطوط نکال کر پھیلا دیے۔ حُر نے کہا کہ ہم تو ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جنھوں نے آپ کو خطوط لکھے ہیں۔ ہم تو مامور کیے گئے ہیں۔ اس پر کہ جہاں بھی آپ مل جائیں پھر ہم آپ کا ساتھ نہ چھوڑیں۔ یہاں تک کہ آپ کو ابن زیاد کے پاس پہنچا دیں۔ یہ سننا تھا کہ امام نے زور سے کہا کہ "موت تمھارے لیے اس سے قریب تر ثابت ہوگی"۔ [1]

اور اس کے بعد آپ نے کوفہ جانے کا ارادہ کلیتہً ترک کر دیا یعنی اس کے پہلے راستہ بدلنے کے بعد بھی آپ کا رُخ کوفہ ہی کی طرف تھا۔ لیکن اب کوفہ جانے کے خیال ہی کو ذہن سے نکال دیا۔ اس کے بعد آپ نے اپنے اصحاب کے سامنے ایک خطبہ ارشاد فرمایا جس میں حمد و ثنائے باری کے بعد فرمایا۔ "صورتِ حال جو پیش آئی ہے وہ تم دیکھ رہے ہو یقیناً دنیا کا رنگ بدل گیا ہے اور اس کی نیکی رخصت ہو چکی ہے اور اس میں کچھ نہیں رہ گیا ہے۔ سوا ایسے تھوڑے حصہ کے جو پانی کے بہنے کے بعد کسی ظرف میں بچ رہتا ہے اور ایک پست زندگی کے جو مثل زہریلی گھاس کے ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ حق پر عمل نہیں ہوتا اور باطل سے علیحدگی نہیں اختیار کی جاتی۔ اس صورت میں مومن یقیناً خدا کی ملاقات کا آرزو مند ہوتا ہے۔ میرے نزدیک تو موت کی صورت میں شہادت کی سی نعمت ہے اور زندہ رہنا ان ظالموں کے درمیان وبالِ جان ہے۔" اس خطبہ کا مقصد صرف اصحاب کو انجام کار کی طرف ایک مرتبہ پھر متوجہ کرنا اور اس طرح ان کو اپنے عزائم کی پختگی کا دوبارہ جائزہ لینے کی دعوت دینا ہی قرار دیا جاسکتا تھا اور اس لیے ضرورت تھی کہ اس تقریر کو سنکر اصحاب کی جانب سے خلوصِ نیّت اور پختگیٔ عزم کا قرار واقعی اظہار کیا جاتا چنانچہ امام کی تقریر ختم ہوتے ہی زہیر بن قین کھڑے ہوگئے اور اس احساس کو

[1] الاخبار الطوال ص۲۴۸، طبری ج ۶ ص۲۲۸ - ارشاد ص۲۴۶

کہ میں اس جماعت میں تازہ شریک ہوا ہوں اس لیے مجھے ایسے مواقع پر سبقت کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ دوسرے اصحاب سے ان الفاظ میں تقریر کی اجازت چاہی کہ آپ لوگ پہلے تقریر کریں گے یا میں کچھ کہوں؟ سب نے کہا کہ نہیں تم تقریر کرو۔ زہیر نے حمد و ثنائے الٰہی کے بعد کہا:۔

"اللہ آپ کو مقصد تک پہنچائے اے فرزندِ رسولؐ! ہم نے آپ کے ارشاد کو سُنا بخدا دنیا اگر ہمارے لیے ہمیشہ باقی رہنے والی ہوتی مگر جدا ہونا اس سے محض آپ کی نصرت اور ہمدردی کی بناء پر ہوتا تو بھی ہم آپ کا ساتھ دینے کو دنیا میں ہمیشہ قیام پر ترجیح دیتے"

یہ سُنکر امام نے زہیر کو دعائے خیر دی اور ان کے خلوص کی تعریف کی [1] اس کے بعد نافع بن ہلال جملی کھڑے ہوئے اور انھوں نے حسب ذیل پُر زور تقریر کی:۔

"فرزندِ رسول! آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے جد بزرگوار کے لیے بھی یہ ممکن نہیں ہوا کہ لوگوں کو اپنی محبت گھول کر پلا دیں اور لوگ حضرت کی اس طرح اطاعت کرنے لگیں جس طرح کہ حضرت چاہتے تھے اور حضرت کے ساتھ والوں میں بہت سے منافق تھے جو حضرت سے نصرت کا وعدہ کرتے تھے مگر دماغ میں غداری کا خیال مضمر رکھتے تھے وہ باتیں تو ایسی بناتے تھے جو شہد سے زیادہ شیریں ہوتیں مگر کردار سے مخالفت کرتے ایسی جو انتہائی تلخ ثابت ہوتی یہاں تک کہ رسول اللہؐ کا انتقال ہوگیا اس کے بعد آپ کے والد بزرگوار حضرت علیؑ کو بھی اسی صورت سے دوچار ہونا پڑا۔ کچھ لوگ ان کی نصرت پر متفق ہوئے اور انھوں نے ان کا ساتھ دیتے ہوئے ناکثین و قاسطین و مارقین (جمل صفین اور نہروان والوں) سے جنگ کی اور کچھ لوگوں نے مخالفت کی۔ یہاں تک کہ حضرت کی وفات ہوگئی اور آج ہمارے سامنے آپ کے لیے وہی صورت درپیش ہے۔ لہٰذا جو شخص اپنے عہد کو توڑے گا اور نیّت کو خراب کریگا وہ خود اپنا بُرا کرے گا اور خدا آپ کو اس سے لاپروا کر دے گا بسم اللہ چلیے ہم

[1] طبری ج ۶ ص۲۲۹

کر لے کر خیر و سلامتی کے ساتھ چاہے مشرق کی طرف اور چاہے مغرب کی جانب، ہم بخدا خدا کے مقرر فیصلہ سے خوفزدہ نہیں ہیں اور نہ اپنے رب کی ملاقات (موت) سے کراہت رکھتے ہیں۔ ہم اپنی نیتوں اور اعتقادوں پر قائم ہیں۔ موالات رکھتے ہیں۔ اس شخص سے جو آپ کے ساتھ موالات رکھے اور دشمن ہیں اس کے جو آپ سے دشمنی کرے۔"

پھر بریر بن خضیر ہمدانی نے تقریر کی:۔

خدا کی قسم اے فرزندِ رسولؐ! یہ خدا کا ہم پر احسان ہے کہ اس نے ہم کو موقع دیا اس بات کا کہ ہم آپ کے سامنے جنگ کریں اور آپ کی نصرت کے سلسلہ میں ہمارے اعضاء و جوارح قطع کیے جائیں یہاں تک کہ آپ کے جدِ بزرگوار روزِ قیامت ہمارے شفاعت خواہ ہوں کیونکہ وہ جماعت کبھی نجات نہیں پاسکتی جس نے اپنے نبی کے نواسے کو تہ تیغ کیا ہو اور وائے ہو ان کے لیے وہ خدا کو کیا منہ دکھائیں گے اور ان کا کیا حال ہوگا۔ اس دن جب وہ آتشِ جہنم میں نالہ و فریاد کرتے ہوں گے۔"[1]

اس گفتگو کے بعد امام نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ اپنی سواریوں پر سوار ہو جاؤ اور سب لوگ یہاں تک کہ خواتین بھی اپنی عماریوں میں سوار ہو گئیں۔ آپ نے حکم دیا کہ چلو جس راستے سے آئے ہیں اسی راستے پر واپس چلو۔ جب اصحاب نے ارادہ پلٹنے کا کیا حُر کی سپاہ سامنے آکر سدِّ راہ ہوئی۔ اس پر امام نے دریافت کیا کہ "تمہارا مطلب کیا ہے؟" حُر نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ آپ کو ابن زیاد کے پاس لے جاؤں"۔ حضرت نے فرمایا۔ "خدا کی قسم یہ نہیں ہوگا"۔ حُر نے کہا "پھر میں بخدا آپ کو چھوڑوں گا بھی نہیں"۔ یونہی تین مرتبہ ردّ و بدل ہوئی۔

آخر میں حُر نے کہا کہ "میں آپ سے جنگ کرنے پر مامور نہیں ہوا ہوں۔ مجھے تو بس یہ حکم ہوا ہے کہ آپ کے ساتھ ساتھ رہوں یہاں تک کہ آپ کوفہ پہنچیں۔ اب اس صورت میں کہ آپ کوفہ جانے سے ہی انکار کرتے ہیں تو ایک ایسا راستہ اختیار کیجیے جو نہ کوفہ کی طرف جاتا ہو اور نہ مدینہ کی طرف

[1] [illegible] ۲۶۹

بس میرے اور آپ کے درمیان انصاف کا یہی ایک طریقہ ہے۔ اس وقت تک کہ جب تک مجھے حاکم کی رائے معلوم ہو۔" حضرت کو حُر کی یہ بات معقول معلوم ہوئی، اور آپ قادسیہ و عذیب کے راستے سے بائیں سمت کی طرف متوجہ ہو گئے، اور حُر بھی آپ کے ساتھ ساتھ چلا۔ تاریخ میں صراحت ہے کہ یہاں سے اور عذیب تک ۳۸ میل کا فاصلہ تھا۔[1]

راستے میں امام حسینؑ اور حُر کے درمیان جو گفتگو ہوتی جاتی تھی وہ بھی بڑی معنی خیز تھی۔ حُر نے کہا "میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ آپ اپنے اوپر رحم کریں اس لیے کہ اگر آپ نے جنگ کی تو یقیناً آپ قتل کر دیے جائیں گے اور تباہ ہوں گے۔" حضرت نے جواب دیا۔ "کیا تم مجھے موت سے ڈراتے ہو؟ کیا تم اس سے زیادہ کچھ کر سکتے ہو کہ مجھے قتل کر ڈالو؟" اس کے بعد حضرت نے قبیلۂ اوس کے ایک شاعر کا وہ شعر پڑھا جس کا مضمون یہ تھا کہ "میں اپنے ارادہ پر قائم رہوں گا اور موت سے دوچار ہونے میں جوانمرد کے لیے کوئی عار و ننگ نہیں ہے جبکہ اس کی نیت میں سچائی ہو اور وہ راہِ حق میں جہاد کر رہا ہو۔"

حُر اس انتہائی عزم و استقلال کا اظہار سن کر حسینی قافلہ سے کچھ دور ساتھ ساتھ ہو کر راستہ طے کرنے لگا۔[2]

البیضہ: اس مقام پر امام حسینؑ نے فوجِ حُر اور اپنے اصحاب کے سامنے ایک تقریر فرمائی جس میں اسلام کی تعلیمات کے حوالہ سے اپنے فرائض پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ "ایہا الناس پیغمبرِ اسلام نے فرمایا ہے کہ جو شخص کسی بادشاہ کو دیکھے کہ وہ ظلم و جور کرتا ہے، محرماتِ الٰہیہ کو حلال بنائے ہوئے ہے خدائی عہد و پیمان کو توڑ دیتا ہے، سنتِ رسولؐ کی مخالفت کرتا ہے اور بندگانِ خدا میں معصیت کا طرز اختیار کیے ہوئے ہے اور یہ شخص ان باتوں کو گوارا کرے اور اصلاح کی کوشش نہ کرے، اپنے قول اور اپنے عمل سے تو وہ مستحق ہوگا اس کا کہ اللہ اس کو بھی اسی بادشاہ کے درجہ میں محسوب کرے۔"

اس کے بعد موجودہ صورتِ حال پر تبصرہ کی حیثیت سے فرمایا:۔

[1] اخبار الطوال ص۲۴۸-۲۴۹ - طبری ج ۶ ص۲۲۸-۲۲۹ - ارشاد ص۲۲۳ [2] طبری ج ۶ ص۲۲۹ - ارشاد ص۲۲۶-۲۲۷

"تمھیں معلوم ہوگا کہ ان بنی امیہ نے اطاعتِ شیطان کو اپنا راستہ بنا لیا اور اللہ کی اطاعت سے روگردانی کی ہے۔ مسلمانوں کے اموال کو اپنا لیا ہے اور حرام خدا کو حلال اور حلالِ خدا کو حرام قرار دے لیا ہے۔ اس صورت میں مجھ سے زیادہ کس پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اصلاح کی کوشش کرے۔" [1]

۱۲۔ عذیب الہجانات [2]**:** اس منزل پر امام حسینؑ اور حُر کے لشکر نے ایک تیر کی مسافت کا فاصلہ درمیان میں چھوڑ کر الگ الگ قیام کیا۔ [3] اسی اثنا میں کوفہ کے پانچ آدمی اپنے مرکبوں پر سوار وارد ہوئے جن کے ساتھ ایک کوتل گھوڑا تھا۔ ان کے راستہ بتانے والے طرماح بن عدی ساتھ تھے۔ یہ پانچ آدمی عمرو بن خالد اسدی صیداوی، ان کے غلام سعد، مجمع بن عبداللہ عائذی، ان کے فرزند عائذ بن مجمع اور جنادہ بن حارث سلمانی تھے۔ حُر نے جو امام کی نقل و حرکت کا نگران تھا بڑھ کر کہا کہ "یہ کوفہ کے لوگ ہیں اور آپ کے ساتھ آنے والوں میں سے نہیں ہیں لہٰذا انھیں قید کر دوں گا یا کوفہ واپس کر دوں گا۔" امام نے فرمایا۔ "اب جب یہ میرے پاس پہنچ گئے ہیں تو ان کی حفاظت میرے ذمہ ہے اور اب وہ میرے انصار و اعوان کی جماعت میں داخل ہو گئے ہیں۔" حُر خاموش ہو گیا۔

حضرت نے ان سے اہلِ کوفہ کی کیفیت دریافت کی۔ مجمع بن عبداللہ عائذی نے کہا کہ بڑے آدمیوں کو رشوتیں دی گئی ہیں اور مال و دولت سے پُر کر دیا گیا ہے۔ اس لیے وہ سب آپ کے خلاف متفق ہیں۔ رہ گئے دوسرے لوگ، ان کے دل آپ کی طرف مگر تلواریں ان کی آپ کے خلاف ہی ہوں گی۔ انھوں نے قیس بن مسہر کی شہادت کے حالات بھی بیان کیے جس پر امام کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے اور آپ نے قرآن کی آیت پڑھی۔ فمنھم من قضی نحبہ و منھم من ینتظر و ما بدلوا تبدیلا۔ مطلب یہ ہوا کہ وہ اس راستے پر چلے گئے اور ہم بھی اسی راستے پر چلنے

[1] طبری ج ۶ ص ۲۲۹ [2] یہ نام اس مقام کا اس لیے ہوا کہ نعمان بن منذر بادشاہ حیرہ کی ہجائن یعنی اونٹنیاں اس مقام پر چرا کرتی تھیں (طبری ج ۶ ص ۲۳۰)

طرماح نے امام سے ابن زیاد کی افواج کی کثرت بیان کی اور کہا "کوفہ سے باہر نکلنے کے پہلے میں نے پشتِ کوفہ پر اتنا عظیم لشکر دیکھا ہے جتنا آج تک تو میری نظروں سے نہیں گزرا تھا اور میں نے دریافت کیا تو بتلایا گیا کہ یہ سب اس لیے اکٹھے ہیں کہ ان کا جائزہ لیا جائے گا اور پھر یہ حضرت امام حسین سے مقابلہ کے لیے روانہ ہوں گے۔"

یہ بیان کرنے کے بعد انھوں نے کہا کہ "اس جماعت سے مقابلہ آپ کے لیے ممکن نہیں لہٰذا آپ میرے ساتھ کوہِ آجا پر چلیے جہاں شاہانِ غسان و حمیر اور نعمان بن منذر ایسے زبردست بادشاہ تک ہم پر قابو نہیں پا سکے، وہاں میں ذمہ داری لیتا ہوں کہ قبیلۂ طے کے بیس ہزار سپاہی آپ کی مدد کے لیے تیار ہوں گے۔"

امام نے طرماح کی مخلصانہ پیشکش پر انھیں دعائے خیر دی لیکن ان کے مشورہ پر عمل کرنے سے معذوری ظاہر فرمائی۔ [1]

۱۳۔ قصرِ بنی مقاتل: عذیب الہجانات سے امام حسینؑ کوفہ کے راستے کو چھوڑ کر داہنے ہاتھ کی سمت روانہ ہوئے یہاں تک کہ قصرِ بنی مقاتل پہنچے۔ یہاں پہنچکر آپ نے اور ساتھ ہی ساتھ حُر نے بھی قیام کیا۔ [2]

اسی منزل پر کوفہ کے بہادروں اور شاہسواروں میں سے ایک شخص عبیداللہ بن حُر جعفی قیام پذیر تھا۔ حضرت نے اتمامِ حجت کے لیے اسے نصرت کی دعوت دی۔ مگر اس کی قسمت میں یہ سعادت نہ تھی اور اس کی قوتِ ارادی ابھی اس پختگی تک پہنچی ہوئی نہ تھی، اس نے حیلہ حوالہ کر کے اس موقع کو ہاتھ سے دے دیا۔ [3] جس پر اُسے عمر بھر افسوس رہا اور بعد میں خونِ امام کے انتقام لینے میں شریک ہوا۔

یہاں سے روانگی کے قبل رات کے آخری حصہ میں حضرت نے اپنے قافلہ کے جوانوں کو پانی بھر کر ساتھ لینے کا حکم دیا جس کی تعمیل ہوئی۔ پھر سب آگے روانہ ہوئے۔ [4]

ابھی تھوڑا راستہ طے ہوا تھا کہ امام پر کچھ غنودگی سی طاری ہوئی۔ آنکھ کھلی تو آپ فرما رہے تھے۔

[1] طبری ج ۶ ص ۲۲۰ - ۲۳ [2] الاخبار الطوال ص ۲۴۹ [3] طبری ج ۶ ص ۲۳۱، الاخبار الطوال ص ۲۴۹
[4] طبری ج ۶ ص ۲۳۱ -

"انا للہ وانا الیہ راجعون والحمد للہ ربّ العالمین" دو تین مرتبہ آپ نے یہی کلمات زبان مبارک پر جاری فرمائے۔

اس وقت آپ کے فرزند علی اکبر گھوڑا بڑھا کر آپ کے قریب آئے اور اس وقت ان کلمات کے زبان پر جاری کرنے کا سبب دریافت کیا۔ حضرت نے فرمایا۔ "ابھی میری آنکھ لگ گئی تھی میں نے ایک سوار کو دیکھا جو کہہ رہا تھا کہ "یہ لوگ تو راستے پر جا رہے ہیں اور موت ان کی طرف آ رہی ہے" میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح ہماری موت کی اطلاع دی گئی ہے۔" علی اکبر نے عرض کیا کہ خدا آپ کو رنج کی صورت نہ دکھلائے، کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟" امام نے فرمایا "کیوں نہیں قسم اس خدا کی جس کی جانب تمام خلق کی بازگشت ہے، ہم حق پر ہیں۔" علی اکبر نے کہا "جب ہم حق پر ہیں تو پھر ہمیں موت کی کیا پروا ہے۔" امام نے فرمایا۔ "بیٹا تمھیں خدا جزائے خیر دے بہترین جزا جو کسی بیٹے کو اس کے باپ کی طرف سے مل سکتی ہو۔[1]" یہ عزتِ نفس، اطمینانِ قلب اور ثباتِ ضمیر کا عجیب مرقع تھا۔

۱۳۔ نینوا: قافلہ راستہ قطع کر رہا ہے۔ امام آگے بڑھتے جا رہے ہیں اور حُر کی طرف سے بھی کوئی مزاحمت نہیں کی جا رہی ہے۔ یہاں تک کہ نینوا کی زمین تک پہنچنا ہوا۔ یہاں ایک سوار مسلّح کوفہ کی طرف سے آتا دکھائی دیا، اور سب ٹھہر کر اس کا انتظار کرنے لگے۔ جب وہ پہنچا تو اس نے حُر اور اس کے اصحاب کو تو سلام کیا لیکن حسینؑ اور اصحابِ حسینؑ کو سلام کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ یہ ابن زیاد کا قاصد تھا جو حُر کے نام خط لایا تھا۔ اس خط میں لکھا تھا کہ تم کو لازم ہے کہ جہاں پر تم کو یہ خط پہنچے وہیں پر حسینؑ کو آگے بڑھنے سے روک دو اور ایسی جگہ قیام کرنے پر مجبور کرو جہاں آب و گیاہ موجود نہ ہو اور نہ کوئی قلعہ یا جائے پناہ ہو۔ میں نے اپنے فرستادہ کو حکم دے دیا ہے کہ وہ تمھارے ساتھ ساتھ رہے اور تمھاری کارگزاری کی مجھے اطلاع دے[2] اور تم سے جدا نہ ہو جب تک کہ میرے حکم کی تعمیل نہ ہو جائے۔

---

[1] طبری ج ۶ صفحہ ۲۳۱-۲۳۲ - ارشاد صفحہ ۲۳۷، ۲۳۸ - [2] الاخبار الطوال صفحہ ۲۴۹-۲۵۰ -

معلوم ہوتا ہے کہ امام کے ساتھ حُر کے روادارانہ برتاؤ کی اطلاع ابن زیاد کو ہو گئی۔ اس کا امام کے پیچھے اپنی فوج سمیت نماز پڑھنا اور پھر کوفہ لے جانے کے مطالبہ سے دست بردار ہو کر یہ صورت تجویز کرنا کہ مدینہ اور کوفہ کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ اختیار کیا جائے۔ یہ باتیں وہ ہو سکتی ہیں جن سے حُر کی وفاداری ابن زیاد کی نگاہ میں مشکوک بن جائے اور شاید اسی بنا پر اسے ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ اپنے حکم کی تعمیل میں حُر کی نگرانی اپنے قاصد سے کرائے۔ حُر جو کچھ بھی ابھی تک دنیا کا بندہ تھا اس لیے ہزار ناچاری و مجبوری اور ناخواستگی طبع کے ساتھ ہی مگر اس نے امام اور آپ کے اصحاب کے روبرو آ کر یہ اعلان کیا کہ یہ امیر ابن زیاد کا خط ہے۔ اس میں مجھے حکم دیا گیا ہے کہ جہاں بھی مجھے یہ خط پہنچے وہیں پر میں آپ کو اترنے پر مجبور کر دوں اور یہ ابن زیاد کا قاصد ہے جسے حکم ہے کہ وہ مجھ سے بغیر اس حکم کی تعمیل کرائے ہوئے الگ ہی نہ ہو۔ اس طرح حُر نے واقعی صورتِ حال کو صفائی کے ساتھ پیش کر دیا۔ اس کے بعد امام نے نہ چاہا کہ اس کے ضمیر کی طاقت کا زیادہ امتحان لیا جائے۔ آپ نے اتنا کہا کہ اچھا ہم کو ذرا آگے بڑھ کر اس قریہ میں قیام کرنے دو جس کا نام غاضریہ ہے یا اس دوسرے قریہ میں جس کا نام شفیہ ہے[1] مگر حُر نے کہا کہ مجھے اس کا اختیار نہیں ہے۔ مجھے تو حکم ہے کہ میں آپ کو ایسے خشک صحرا میں اتار دوں جہاں آب و گیاہ نہ ہو اور یہ شخص مجھ پر نگران مقرر کیا گیا ہے کہ یہ میرے طرزِ عمل کی جا کر اطلاع دے۔ اس جواب پر اصحابِ امام میں جوش پیدا ہو گیا اور زہیر بن قین نے کہا کہ "فرزندِ رسولؐ! ان سے جنگ کر لینا ہمارے لیے آسان ہے بہ نسبت ان لوگوں سے جنگ کرنے کے جو ان کے بعد آئیں گے کیونکہ اس کے بعد اتنی فوجیں آئیں گی کہ ان کے مقابلہ کی ہم میں طاقت نہ ہوگی۔" مگر امام نے فرمایا کہ نہیں میں جنگ میں ابتدا کرنا نہیں چاہتا۔[2]"

آخر امام حسینؑ نے حُر سے فرمایا کہ اچھا کچھ تو چلنے دو، اور حُر خاموش ہو گیا۔

کربلا: امام ذرا بائیں طرف مڑ کر تھوڑا سا چلے تھے کہ سپاہِ حُر سامنے آ کر سدِّ راہ ہو گئی اور کہا

---

[1] دینوری نے سقبہ لکھا ہے (الاخبار الطوال صفحہ ۲۵) [2] الاخبار الطوال صفحہ ۲۵ - طبری ج ۶ صفحہ ۲۳۲ - ارشاد صفحہ ۲۳۸-۲۴۹

کہ بس یہیں اتر پڑئیے۔ فرات یہاں سے دور نہیں ہے۔ امام نے نام پوچھا، معلوم ہوا کربلا۔ فرمایا "اچھا کرب و بلا کی یہی منزل ہے" یہ کہہ کر گھوڑے سے اتر پڑے[1]۔ یہ دوسری محرم ۶۱ھ پنجشنبہ کا دن تھا[2]۔

اب جبکہ امام کا سفر منزلِ آخر تک پہنچ گیا تو ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سفر کے مختلف پہلوؤں پر ایک سیر حاصل تبصرہ کر دیا جائے تاکہ اسکی اہمیت اور ضرورت کچھ اور واضح ہو جائے۔

یہ تو پہلے بیان ہو چکا ہے کہ امام کا مقصد یزید سے اس طرح کی جنگ کرنا نہ تھا جیسی دنیا میں ہوا کرتی ہے۔ آپ کو نہ سلطنت کا حاصل کرنا مقصود تھا۔ نہ براہِ راست یزید کی سلطنت کا ختم کرنا بلکہ آپ کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کر دیں اور ان میں ایک ایسا انقلاب ذہنی پیدا کر دیں کہ وہ یزیدی کردار کو اس کی اصلی شکل میں دیکھنے لگیں اور اس کے ظاہری دعوائے اسلام سے دھوکا نہ کھائیں۔ اس کے لیے آپ نے مدینہ سے روانگی اختیار کی۔ جہاں تک مدینہ سے نکلنے کا تعلق ہے پورے طور سے اس پر تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ اگر آپ مدینہ میں قیام کر کے اور وہاں رہ کر یزید کے مقابلہ میں جنگ کرتے یا قربانی پیش کرتے تو اس سے وہ نوعیت پیدا ہی نہ ہوتی جو آپ کو مدِ نظر تھی۔ یا نہ ہر کام کرتا اور یا تلوار، مگر تلوار کیسی؟ جس کی ذمہ داری کسی صورت سے سلطنت شام پر عائد نہ ہو سکتی بلکہ کوئی خارجی نکلتا ابن ملجم کا سا جس نے علیؑ کو شہید کیا تھا یا کوئی تیر آتا آدمی نہیں بلکہ جنوں کی طرف سے جیسا کہ اسلامی تاریخ میں سعد بن عبادہ کا شام میں خاتمہ ہوا تھا۔ یہی ہوتی ہیں عام حکومتوں کی شعبدہ کاریاں جن کا نام دنیا نے "سیاست" رکھا ہے۔ حضرت امام اس طرح کی سیاست کے گُروں کو خوب سمجھتے تھے چاہے خود اخلاقی و اسلامی پابندیوں کی وجہ سے اختیار نہ کریں۔ انھوں نے مدینہ اس لیے چھوڑا کہ انکا واقعۂ شہادت کوئی اچانک اور بے سان گمان کا حادثہ نہ سمجھا جائے۔ جا کر قیام کیا کہاں؟ مکہ معظمہ میں جو قلبِ جزیرۃ العرب تھا اور جہاں حج کے لیے بہرحال ہر طرف سے کھنچ کھنچ کر مسلمان جمع ہوتے تھے۔ علاوہ ذلفیۂ حج کے جو اسلامی شریعت کی رو سے ہر مستطیع مسلمان پر واجب ہے۔ خود عرب کے قدیم روایات

[1] طبری ج ۶ ص ۲۳۲۔ ارشاد ص ۲۳۹۔ [2] دینوری نے چہار شنبہ یکم محرم لکھا ہے (الاخبار الطوال ص ۲۵۱)

اور سابقہ عملدرآمد کی وجہ سے جو صدیوں سے قائم تھا عرب کے اس خطہ کو تمام مختلف الخیال قبائل عرب کا محل اجتماع ہونا ضروری تھا۔ وہ مشہور کانفرنسیں جو شعر و سخن اور خرید و فروخت کے لیے قائم ہوتی تھیں جن کو "اسواق العرب" کہا جاتا تھا۔ ذیقعد سے لیکر محرم تک مکہ و طائف اور مدینہ کے درمیان ہی قائم ہوتی تھیں۔ امام حسینؑ کی شخصیت دنیائے عرب میں کوئی اجنبیت نہ رکھتی تھی اگرچہ مذہبی احساسات مردہ ہو گئے تھے اور حضرت کو آپ کے پورے مراتب کے ساتھ لوگ نہ پہچانتے تھے لیکن رسولؐ کے نواسے، سلطانِ حجاز و عراق کے فرزند، ملکِ عرب کے سب سے بڑے سخی جس کے در سے کوئی سائل محروم نہیں پھرا، بنی ہاشم کے بزرگ خاندان اور اسلام کے سب سے بڑے عالم، یہ عنوان وہ تھے جن سے کوئی بھی ناواقف نہیں تھا۔ حسینؑ نے یہی خاص زمانہ کہ جو تمام قبائلِ عرب کے اجتماع کا تھا مکہ میں اپنے قیام کے لیے تجویز کیا۔ امام حسینؑ کا یہاں خاموشی کے ساتھ قیام بھی تمام اطرافِ ملک میں آپ کی بیعتِ یزید سے کنارہ کشی کے اعلان کے لیے کافی تھا اور یہی سب سے بڑی وہ وجہ تھی جس کی بنا پر آپ کی زندگی سیاستِ وقت کے لیے یہاں بھی ناقابلِ برداشت ثابت ہوئی چنانچہ یزید کی طرف سے حاجیوں کے بھیس میں آدمی بھیجے گئے تاکہ وہ آپ کو گرفتار کر لیں یا قتل کر دیں۔

امام حسینؑ جیسا کہ آپ نے مکہ سے روانگی کے وقت فرما دیا تھا، یہ نہ چاہتے تھے کہ آپ مکہ کے اندر شہید کیے جائیں جس کی بنا پر خانۂ کعبہ کی حرمت زائل ہو۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ خانہ کعبہ کے گرد و پیش حج کے زمانہ میں ہر قسم کے لوگ ہر طرف سے آئے ہوئے ہوتے ہیں اور امام حسینؑ کے لیے یہ غیر ممکن تھا کہ آپ عرفات، منیٰ، مشعر، مقام ہر جگہ اپنے ساتھ محافظ رکھتے۔ ایسی صورت میں بہت آسان تھا کہ حجرِ اسود کے استلام کے وقت، عرفات میں وقوف کی حالت میں، مشعر کی طرف واپسی کے دوران میں، منیٰ میں قربانی کے موقع پر، مقام ابراہیمؑ میں نماز پڑھنے کی حالت میں کسی وقت آپ پر قاتلانہ حملہ ہو جاتا اور قاتل موجودہ ہنگامہ و اژدہام کے اندر گم ہو جاتے۔ اس کے بعد کون کہہ سکتا تھا کہ حسینؑ کا قاتل حقیقتاً یزید یا اس کا کوئی فرستادہ ہے۔

اس شدید خطرہ کی بنا پر امام حسینؑ نے مکہ کو چھوڑا اس طرح کہ حج کو بھی مکمل نہ کیا جس کا سبب

وہی ہنگامی صورت حال تھی جو پیدا ہو گئی تھی مگر جیسا کہ علامہ سید ہبۃ الدین شہرستانی نے "نہضۃ الحسین" میں لکھا ہے اس طرح دفعۃً ایسے موقع پر امام کی روانگی نے تمام قبائل عرب کے نمائندوں میں ایک بجلی کی سی لہر دوڑا دی۔ اور اگر کوئی تاریخ اس موقع کی مکمل اسی وقت قلمبند کی گئی ہوتی تو اس میں ضرور نظر آتا کہ اس موقع پر کن خیالات کا اظہار کیا جاتا تھا۔ حسینؑ بن علیؑ کہاں چلے گئے؟ حج بھی نہ کیا؟ آخر تمام اہل و عیال و اقرباء کے ساتھ اپنے نانا کی قبر کے جوار کو کیوں چھوڑ دیا؟

"یزید کے خوف سے۔"

"کیوں؟ یزید کیا چاہتا ہے؟"

"حسینؑ سے بیعت کا طالب ہے۔"

لاحول ولا قوۃ۔ بھلا ایسا کیونکر ہو سکتا ہے؟ فرزند رسولؐ ساحق آشنا یزید ایسے شرابخوار اور زناکار کی بیعت کرے! اچھا پھر مکہ معظمہ میں کیوں قیام نہ کیا؟ کس لیے حج کو بھی مکمل نہ کیا؟ "جان کا خطرہ تھا۔ شاید مکہ میں حسینؑ کو قتل کرنے کے لیے شام سے کچھ لوگ بھیجے گئے تھے۔" توبہ! توبہ! اس سے بڑھ کر سفاکی اور ظلم کیا ہوگا؟ ارے فرزند رسولؐ کو حرم میں بھی چین نہ لینے دیا۔ کم و بیش اس قسم کے تذکرے ہوں گے جو مکہ معظمہ اور اس کے اطراف و جوانب میں اکثر باخبر حلقوں میں بڑی قوت کے ساتھ ہو رہے ہوں گے۔ اس زمانہ میں جب مراسلت و مخابرت کے طریقے محدود تھے اور تار، ٹیلیفون، ریڈیو وغیرہ خبر رسانی کے ذرائع نایاب، اس سے بہتر کوئی صورت واقعات کی اشاعت کے لیے نہیں ہو سکتی تھی اس لیے کہ بعد اختتام حج جو شخص بھی اپنے شہر میں واپس آتا اس کو تازہ واقعات کے ضمن میں حسینؑ کی نقل و حرکت اور اس کے اسباب و علل کا بیان کرنا ضروری تھا۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ امام کی موافقت میں کسی لشکر کے جمع ہونے کا امکان پیدا ہو گیا تھا بلکہ یہ کہ پہلے سے ان حالات کی اشاعت ہو جانے کی وجہ سے آپ کی شہادت نامعلوم اسباب و علل کا نتیجہ قرار نہیں دی جا سکتی اور حکومت شام کو اس کے متعلق اپنے سیاسی مفاد کے لحاظ سے

مخصوص وجوہ تراشنے کا موقع نہیں مل سکا اور امام حسینؑ کی مظلومیت و حقانیت پر پردہ نہ ڈالا جا سکا۔ لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو سلطنت یزید کی طرف سے امام کی شہادت کو طرح طرح کے لباس پہنائے جاتے اور آئین و شعائر اسلام کے تحفظ کا وہ بلند مقام جو امام کے پیش نظر تھا اتنے کامیاب طریقہ پر حاصل نہ ہوتا۔ مگر یہ امام کے انتہائی مدبرانہ طریقۂ کار کا نتیجہ تھا کہ ادھر امام شہید ہوئے اور ادھر تمام دنیا نے اس بات کو تسلیم کر لیا کہ آپ ناحق قتل کیے گئے۔ شام کا حاکم اور اس کے وزراء اور ہوا خواہ کسی تہمت کے تراشنے کا موقع نہ پا سکے۔ اس لیے کہ امام حسینؑ نے اپنی نقل و حرکت کے اسباب کو اپنی شہادت کے پہلے ہی عالم اسلام میں شائع کر کے دشمنوں کی زبانیں بند کر دیں اور اپنی حقانیت کے سامنے دنیا کا سر خم کرا لیا۔

نتیجہ کے اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ حسینؑ کا قافلہ جو مکہ سے نکل کر جا رہا تھا ایک خاموش مبلغ تھا۔ اس لیے کہ حج کی وجہ سے عراق، یمن، طائف وغیرہ سب طرف سے قبائل مکہ میں آ رہے تھے اور ادھر امام حسینؑ اپنے اہل و اقرباء، انصار و اصحاب کی جماعت کے ساتھ خیمہ و خرگاہ تمام اسباب ساتھ لیے ایک قافلہ کی صورت میں مکہ سے جا رہے تھے۔ عالم مسافرت میں زندگی گزارنے والے واقف ہیں کہ راستے میں چار پانچ آدمیوں کا بھی قافلہ نظر آئے تو کھوج پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ کون لوگ ہیں؟ کہاں سے آتے ہیں؟ اور کیوں؟ پھر کہاں امام حسینؑ اور آپ کے اصحاب و انصار کا شاندار قافلہ، حج کو صرف دو دن باقی رہتے ہوئے مکہ معظمہ کی طرف سے آ رہا ہو جبکہ دنیا مکہ معظمہ کی طرف حج کے لیے جا رہی ہو۔ یہ وجوہ یقیناً جاذب نظر اور باعث توجہ تھے اور ایک اجنبی شخص کو یہ پوچھنا ناگزیر تھا کہ یہ کون جماعت ہے؟ اور کہاں جا رہی ہے؟ اور حسینؑ کا نام معلوم ہونے پر اسی قسم کا مکالمہ جیسا اوپر درج ہو چکا ہے، ان کے درمیان لازمی طور پر شروع ہو جاتا ہوگا۔ چنانچہ تاریخیں شاہد ہیں کہ فرزدق کی ملاقات امام سے یونہی ہوئی اور عبداللہ بن مطیع اور عمر بن عبدالرحمٰن مخزومی کی بھی کہ وہ مکہ کی طرف جا رہے تھے اور امام مکہ کی طرف سے آ رہے تھے اس سے ظاہر ہے کہ حسینؑ بن علیؑ اور ہاشمی جوانوں کا شاندار قافلہ جو خانۂ خدا کو بمجبوری چھوڑ کر

دشت غربت میں راہ پیما تھا دور دور کے لوگوں کو حالات کی تحقیق اور حقیقت کے سمجھنے پر مجبور کر دیتا تھا۔
مکّہ سے نکلنے کے بعد آپ نے کوفہ کا رُخ کیا۔ اس لیے کہ اہلِ کوفہ کے انتہائی اصرار کو عدم اعتماد
کی بنا پر مسترد کر دینا اخلاقی و مذہبی حیثیت سے کسی طرح آپ کے نزدیک مناسب نہ تھا خصوصاً
جبکہ آپ کے معتمد سفیر (مسلم بن عقیل) نے وہاں کے حالات کو قول و قرار کے موافق پا کر آپ کو
اس کی اطلاع بھی دے دی تھی جس کے بعد امام کے لیے ان کے مطالبۂ ہدایت کی آواز پر
لبیک کہتے ہوئے اتمامِ حجت کرنا ایک فریضہ تھا مگر اس ضمن میں اس انقلاب کے لیے جو حضرت
کی شہادت سے پیدا ہونے والا تھا کچھ مزید اسباب کا اضافہ ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ حضرت امام حسینؑ
وطن سے بے بسی اور بیکسی کے ساتھ نکلے تھے۔ مکہ میں بھی کوئی قابلِ اطمینان حالت نہ تھی مگر مکّہ سے
آپ کا سفر اختیار کرنا اہلِ کوفہ کے مہمان کی حیثیت سے تھا اور عرب کی غیرت و حمیّت کا تقاضا مہمان
کے بارے میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ عین موقع پر اہلِ کوفہ کثرت
کے ساتھ امام حسینؑ کی نصرت کے لیے نہیں پہنچ سکے یا نہیں پہنچے مگر انسانی اور عربی فطرت کے
لازمی نتیجہ کے طور پر یہ یقینی تھا کہ بعد کو اہلِ کوفہ کے دل میں ایک عجیب بیقرار احساس پیدا ہوگا اس
کا کہ ہم نے بلایا تھا اور مدد نہ کی اور یہی احساس آگے بڑھ کر اور پرورش پا کر ایک عظیم سیلاب کی صورت
میں اُمڈے گا جو اس سلطنت کے بیڑے کو ہمیشہ کے لیے ڈبو کر چھوڑے گا جس کا نتیجہ ہوگا امام کی
فتح اور دشمن کی شکست۔ بنی امیہ کی عداوت اور ان کے وسیع ذرائع حکومت کو دیکھتے
ہوئے یہ ماننا پڑے گا کہ امام حسینؑ تو ملک عرب میں جہاں جاتے آخر میں شہید ہوتے لیکن ظاہر ا
حیثیت سے یہ نتیجہ مرتب نہ ہوتا جو کوفہ کی طرف آنے کی صورت میں ہوا۔ وہ لوگ جو مسلم کی
شہادت کے بعد آپ کو واپسی کا مشورہ دے رہے تھے یقیناً نیک نیت اور اپنے نقطۂ خیال کے
لحاظ سے حق بجانب بھی ہوں گے مگر انھیں حسینی اقدام کی نوعیت کا اندازہ نہ تھا۔ عراق کا سفر
اختیار کرنا اگر کچھ خوشگوار توقعات پر مبنی ہوتا تو بیشک اب اس ارادہ کو بدل جانا چاہیے تھا
اس لیے کہ وہ توقعات اب مایوسی سے بدل گئے تھے لیکن جبکہ امام کے سامنے کوئی امید دل کا

سبز باغ نہیں تھا بلکہ اس حد سے بڑھے ہوئے اصرار کی پذیرائی اور غیر معمولی طلب و دعوت
کی قبولیت تھی جس سے اتمامِ حجت کا مقصد پورا ہوتا تھا تو اس ارادہ کو اتنے پر کہ آپ کو مسلم
کی خبر شہادت مل گئی متزلزل نہ ہونا چاہیے تھا۔ بلکہ استقلال و ثباتِ قدم، کوہ آسا عزم اور
پختگیٔ ارادہ، وعدہ کی پابندی اور اصول کے تحفّظ کا تقاضا یہ تھا کہ آپ عملاً اس کا ثبوت پیش
کر دیتے کہ آپ اپنے وعدہ پر قائم رہے۔ یہاں تک کہ آگے بڑھنے میں خونریزی اور نقضِ امن عام
کے باعث ہونے کا اندیشہ ہو گیا۔ اس کے علاوہ ابھی مسلم کی شہادت کے تفصیلی حالات بھی تو عام
طور پر لوگوں کو معلوم نہ تھے اور ظاہری اسباب کی بنا پر یہ ممکن تھا کہ وہ بڑی خونریز لڑائی کے بعد
شہید ہوئے ہوں جس میں اہلِ کوفہ نے پورے طور پر دادِ شجاعت دی ہو لیکن سرکاری فوج کے
مقابلہ میں سربر نہ ہوئے ہوں اور ممکن ہے ان کے دل میں یہ ارمان ہوتا یا بعد میں کہنے کا موقع
ملتا کہ اگر امام حسینؑ آجاتے تو ہمیں تازہ قوّت حاصل ہو جاتی اور حالات کا ورق بالکل پلٹ جاتا
اس صورت میں آپ کا یہیں سے واپس ہو جانا جبکہ کوفہ کے بہت سے لوگ گویا آپ ہی کی خاطر
سے ایک بڑی مصیبت اور کشمکش میں مبتلا ہو چکے، بڑی کمزوری اور کم ہمّتی کا نمونہ سمجھا جا سکتا
تھا۔ آپ نے ارادہ میں تبدیلی کی بس اس وقت جب حُر کا لشکر آپ سے دوچار ہوا اور یہ معلوم
ہوا کہ وہ آپ کو ابن زیاد کے پاس لے جانے پر مامور ہے۔ اب امام نے اپنا ارادہ بدل دیا اس
لیے کہ اب آپ کا آگے بڑھنا دو ہی صورتوں سے ہو سکتا تھا۔ ایک تو یہ کہ آپ جنگ آزمایانہ صورت
سے فوجوں کو درہم و برہم اور راستے کو صاف کرتے ہوئے کوفہ پر حملہ آور ہوتے اور ابن زیاد کو
کوفہ سے نکال کر وہاں اپنی عملداری قائم کرتے، دوسرے یہ کہ آپ صبر و خاموشی کے ساتھ جس طرح
اب تک آ رہے تھے اسی طرح کوفہ کی طرف اپنی رفتار کو جاری رکھتے۔

دوسری صورت موجودہ حالات میں غیر ممکن تھی چونکہ اب تک آپ کا آگے بڑھنا خود مختارانہ
حیثیت سے اور خود اپنے ارادہ سے تھا مگر حُر کی فوج کے اس قصد سے آنے کے بعد کہ وہ آپ
کو کوفہ ابن زیاد کے پاس لے جائے آپ کا خاموشی کے ساتھ آگے بڑھنا اس فوج کے ہاتھ میں اسیر

ہونے اور ابن زیاد کا قیدی بن جانے کا مرادف ہوتا کیونکہ ابھی یہ حُر کی سپاہ ہے اور آگے بڑھ کر
حصین کا فوجی مرکز ہے اور وہاں سے پھر افواج کے محاصرہ میں ابن زیاد کے پاس لے جایا جاتا ہے
جس کے بعد آپ کا معاملہ ابن زیاد کے ہاتھ میں ہے۔
اسی لیے آپ نے حُر کے اس اظہار کا کہ ہم آپ کو ابن زیاد کے پاس لے جانے کے لیے آئے
ہیں انتہائی ترش جواب دیا کہ موت تمھارے لیے اس سے قریب تر ثابت ہو گی۔
بیشک پہلی صورت باقی تھی اور وہ یہ کہ آپ کوفہ پر حملہ آور ہوتے اور غنیم کی فوج کو پسپا
کرکے وہاں اپنا قبضہ جماتے مگر ایک تو ظاہری اسباب کی بنا پر آپ کے ساتھ موجودہ فوجی طاقت
ایسی نہیں تھی کہ وہ یزید کی منظم افواج کا مقابلہ کرسکتی اور بغیر ایسی طاقت کے موجود ہوئے ایک
جگہ گھیر لیے جانے کے بعد دفاعی حیثیت سے بہتّر نفوس کو ساتھ لے کر تیس ہزار کا مقابلہ کر لینا تو
عین شجاعت و ہمت اور قابلِ ستائش طریقۂ کار ہے مگر اس قلیل تعداد کے ساتھ غنیم پر جارحانہ طرز
پر حملہ آور ہونا سوائے تہوّر اور ناعاقبت اندیشی کے اور کچھ قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔ دوسرے یہ
آپ کے اس مسلک کے خلاف ہے جو آپ نے اختیار کر رکھا تھا کہ آپ کی اس مقاومت میں عوامی
محاورہ کے لحاظ سے بغاوت اور شورش انگیزی کی صورت پیدا نہ ہونے پائے۔ اسی لیے آپ نے
اپنی گفتگو میں جو حُر کے ساتھ ہوئی تھی اپنے اس نقطۂ نظر کو واضح کر دیا تھا کہ میں بلایا ہوا آیا ہوں
اگر میرا آنا ناپسند ہے تو میں واپس جاتا ہوں۔
چنانچہ فوجِ حُر کی اس مزاحمت کے بعد آپ نے کوفہ کا خیال ترک کر دیا اور حُر کی معقول تجویز
کے مطابق ایک دوسرا راستہ اختیار فرمایا جس نے آگے بڑھ کر آپ کو میدانِ کربلا میں پہنچا دیا۔
اور یہی آپ کا اپنی طرف سے جنگ کی ابتدا نہ کرنے کا اصول اس کا بھی باعث ہوا کہ جب
کربلا کی سرزمین پر پہنچ کر فوجِ حُر نے سختی کے ساتھ آگے بڑھنے سے روکا تو آپ نے وہیں پر خیمے
نصب کرا لیے کیونکہ اب بغیر جنگ کیے ہوئے آگے بڑھنا ممکن نہ تھا پھر آگے بڑھنے کی صورت
... کے ساتھ زندگی بسر کریں تو ان

لوگوں سے اپنے مقصد میں سدِّ راہ ہونے کی بنا پر جنگ بھی کر لی جاتی لیکن جب آپ کے پیشِ نظر
ایسا کوئی خاص مرکز نہیں تھا تو صرف اس بات پر جنگ کرنا کہ ہم یہاں نہیں ٹھہریں گے بلکہ کچھ آگے
جا کر ٹھہریں گے ایک لاحاصل سی بات ہوتی۔
چنانچہ فوجِ مخالف کے مطالبہ پر آپ نے کربلا کی سرزمین پر فرات کے کنارے سے ہٹ کر خیمے
نصب کر لیے۔ جس زمین کو اب کربلا کہا جاتا ہے یہ حقیقتاً مجموعہ ہے چند زمینوں اور قریوں کا جو اس
زمانہ میں بالکل پاس پاس واقع تھے۔ اس کی مثال زمینداریوں اور جاگیروں اور مواضعات کی حیثیت
سے ہر ملک میں موجود ہے اور خصوصیت سے عرب میں ایسا پایا جاتا تھا کہ چھوٹے چھوٹے قطعاتِ ارض
کے مستقل نام ہوتے تھے جنھیں اگر ایک کی خصوصیت کے لحاظ سے دیکھا جاتا تو وہ کئی مقام متصوّر
ہوتے تھے اور اگر ان کے باہمی قرب پر نظر کی جاتی تو وہ سب ایک قرار پاتے تھے اور اس طرح ایک
جگہ کا واقعہ دوسری جگہ کی طرف منسوب کیا جاسکتا تھا۔
جیسا کہ علامہ سیّد ہبۃ الدین شہرستانی نے "نہضۃ الحسین" میں لکھا ہے، واقعۂ کربلا کے محل
وقوع کے ماتحت جو بہت سے نام گوش زد ہوتے ہیں کربلا، نینوا، غاضریہ، شط فرات انھیں
ایک ہی جگہ کے متعدد نام نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ وہ متعدد جگہیں تھیں جو باہمی قرب کی وجہ سے
ایک ہی سمجھی جاسکتی تھیں اور اس لیے محلِ وقوعِ واقعہ کے اعتبار سے ہر ایک کا نام تعارف
کے موقع پر ذکر کیا جانا صحیح قرار پاتا تھا۔
"نِینَوا"[1] یہ ایک قریہ تھا جسے موجودہ زمانہ کے سدّۂ ہندیہ کے قریب سمجھنا چاہیے۔ اس کے
پہلو میں "غاضریہ" تھا۔ یہ قبیلۂ بنی اسد کی ایک شاخ بنی غاضرہ کی طرف نسبت رکھتا تھا اور
ان ہی کا محلِ سکونت تھا۔ یہ غالباً وہ زمین ہے جو اب حسینیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اسی جگہ ایک
قریہ شَفَیہ تھا اور یہیں پر ایک قطعۂ زمین "کربلہ"[2] پایا جاتا تھا وہ اب موجودہ شہر کربلا کے مشرقی حصہ
میں جنوب کی طرف واقع ہے۔ اس کے متصل "عقر بابل" نام کا قریہ تھا جو غاضریات کے شمال

---

[1] نون کے کسرہ کے ساتھ [2] ... کے ساتھ

مغرب میں واقع تھا۔ وہاں اب کھنڈرہیں جن میں بہت اہم آثارِ قدیمہ کے انکشاف کی امید کی
جاتی ہے اور یہ بالکل دریائے فرات کے کنارے پہ تھا، اور اپنے قدرتی محلِ وقوع یعنی ٹیلوں میں
گھرے ہونے کی وجہ سے ایک قلعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے مقابل غاضریات کے دوسری جانب
نوآدیس کا مقام تھا جو مسلمانوں کے فتوحات کے قبل ایک عمومی قبرستان کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس
کے وسط میں زمین "حیر" تھی جو اب حائر کے نام سے معروف ہے اور جہاں حضرت امام حسینؑ کی
قبر مبارک ہے۔ حیر ایک وسیع میدان کی حیثیت رکھتا تھا جو تین طرف سے متصل اور پہلو بہ پہلو
ٹیلوں سے گھرا ہوا ہے۔ ان ٹیلوں کا سلسلہ شمال مشرق کی طرف سے جدھر حرم حسینی کا "باب السدر"
اور "منارۂ عبد" ہے شروع ہو کر غرب کی جانب "باب زینبیہ" کے حدود تک پہنچتا تھا اور وہاں سے
پیچیدہ ہو کر جنوب کی طرف در قبلہ کے مقام تک آکر ختم ہوتا تھا۔ ان متصل ٹیلوں کے اجتماع سے
ایک نصف دائرہ کی شکل بنتی تھی جو "ن" کی صورت سمجھی جا سکتی ہے۔ اس دائرہ میں داخل ہونے
کا راستہ مشرقی جہت میں اس جانب سے تھا کہ جدھر روضۂ حضرت عباس میں جانے کا راستہ ہے۔
تحقیقاتی انکشاف سے ابتک یہ بات پائی جاتی ہے کہ ان مکانات کے آثار جو قبرِ امام حسینؑ کے گرد
ہیں، شمالی اور مغربی جانب زمین کی تدریجی بلندی کے قرینے موجود ہیں اور مشرقی جانب سوا
نرم مٹی کے جو پستی کی طرف مائل ہے کچھ نظر نہیں آتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام کی قدیمی صورت
ایسی ہی تھی کہ شرق کی جانب سے ہموار اور شمال اور مغرب کی جانب ہلالی شکل کے طور پر بلند تھی۔
یہی ہلالی دائرہ وہ تھا جس میں امام حسینؑ کو گھیر کر شہید کیا گیا تھا۔ فرات کی اصلی نہر جسے ہماری زبان
کے اعتبار سے دریائے فرات کہا جاتا ہے اس کا براہِ راست کوئی تعلق کربلا کی زمین سے نہ تھا۔
اس کا خطِ سیر حلہ، مسیب وغیرہ مقامات سے ہوتا ہوا کوفہ کے بیرونی حصوں کی جانب جاتا
تھا۔ کربلا اور اس کے درمیان بڑا فاصلہ تھا لیکن اس نہر یا دریائے فرات کی ایک چھوٹی شاخ مقامِ
رضوانیہ کے پاس سے نکل کر جدا ہوتی تھی جو کربلا کے شمال مشرق کی جانب کے ریگستانوں اور ٹیلوں
سے ہوتی ہوئی اس مقام سے ہو کر گزرتی تھی جہاں علمدارِ حسینؑ ابوالفضل العباس کی قبر ہے

اور اس کے بعد موجودہ مقام ہندیہ کی طرف سے ہوتی ہوئی اس مقام کے شمال مغربی جانب
جس کا نام "قریہ ذی الکفل" ہے اصل دریائے فرات سے مل جاتی تھی۔ یہ چھوٹی نہر "علقمہ" کے نام
سے موسوم تھی اور اسے اپنی اصل کے اعتبار سے فرات بھی کہہ دیا جاتا تھا۔ "طف" کے معنی ہیں
"نہر کا کنارہ"۔ خصوصیت سے دریائے فرات کے اس کنارے کو جو جنوبی پہلو میں بصرہ سے ہیت
تک تھا طف کہا جاتا تھا اور اسی مناسبت سے "فراتِ صغیر" یعنی نہرِ علقمہ کے اس کنارہ
کو جس میں کربلا واقع تھا طف کہا جانے لگا اور اسی وجہ سے کربلا کے واقعہ کو "واقعۃ الطف"
کہا جاتا ہے اور کربلا کو شطِ فرات کے نام سے بھی اسی وجہ سے یاد کیا جاتا ہے۔

بیسواں باب!

یزیدی حکومت کی سرگرمی اور کربلا میں فوجوں کی آمد

مسلم بن عقیل کی شہادت کے بعد کوفہ میں سخت گیری انتہا کو پہنچ گئی۔ ابن زیاد کو اندیشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلم کی بیعت کرنے والے جو اُن کی امداد سے قاصر رہے وہ اب اپنی قوتوں کو مجتمع کر کے کوئی انقلاب پیدا کریں لہٰذا اس نے تلاش کر کے جن جن اشخاص کو حضرت امام حسینؑ کا ہمدرد سمجھا جا سکتا تھا یا ان پر ایسا شبہ بھی ہو سکتا تھا انھیں قتل یا قید کرنا شروع کر دیا۔
میثم تمار اور رشید ہجری اسی دوران میں شہید کیے گئے۔

مختار بن ابو عبیدہ جو مسلم کے جہاد کے زمانہ میں کوفہ کے اندر موجود نہ تھے اور اسی دن اطلاع پا کر آئے لیکن ایسے وقت پہنچے کہ مسلم شہید ہو چکے تھے اور عمرو بن حریث نے رایتِ امان بلند کیا تھا کہ جو شخص اس کے نیچے چلا آئے گا اس کا جان و مال محفوظ رہے گا۔ چنانچہ مختار موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اس جھنڈے کے نیچے چلے گئے مگر انھیں اس پر بھی امان نہ مل سکی اور وہ پا بزنجیر کر کے قید خانہ بھیج دیے گئے۔ اسی طرح عبداللہ بن حارث بن نوفل اور دیگر اشخاص۔

ادھر یزید کو دمشق میں جناب مسلم کے قتل کی خبر کے ساتھ ہی حضرت امام حسینؑ کی مکہ سے روانگی کی اطلاع پہنچی تو اس نے ابن زیاد کو خط لکھا:-

"مجھے خبر ملی ہے کہ حسینؑ بن علیؑ عراق کی طرف متوجہ ہو چکے ہیں لہٰذا تم کو لازم ہے کہ ہوشیاری کے ساتھ جاسوس مقرر کرو۔ مورچے مضبوط کر دو اور کسی شخص پر وہم و گمان بھی ہو تو اس کا تدارک کرو اور فوراً گرفتار کر لو۔"

اب کیا تھا، جیلخانے قیدیوں سے چھلکنے لگے جس کا اظہار خود ابن زیاد نے اس کے بعد ان الفاظ میں

کیا کہ "کوئی ایسا شخص نہیں جس پر گمان ہو سکتا تھا کہ وہ حکومت کی مخالفت کرے گا مگر یہ کہ وہ قید خانہ کے اندر ہے۔"

شہر کے اندرونی حالات پر اس طرح قابو پانے کے بعد اس نے باہر کی طرف توجہ کی اس لیے کہ اسے اندیشہ تھا کہ کہیں بصرہ و مدائن اور دیگر اطراف کے لوگ امام حسینؑ کی مدد کے لیے نہ آ جائیں۔ اس کے لیے حدود کی ناکہ بندی ہوئی اور قادسیہ میں جو حجاز و عراق و شام کے خطوط سیر کا محل اجتماع تھا، چار ہزار سواروں کے ساتھ حصین بن تمیم کو جو اب تک کوتوال شہر کی حیثیت رکھتا تھا مقرر کیا گیا اور وہ قادسیہ سے لے کر قطقطانہ، لعلع اور خفان اور اطراف و جوانب میں جو شام و بصرہ کے راستے تھے سب میں لشکر پھیلا دیا گیا۔ یہاں تک کہ نہ کوئی شخص آ سکتا تھا اور نہ جا سکتا تھا۔[1] چنانچہ قیس بن مسہر صیداوی جو امام حسینؑ کا فرستادہ خط اہلِ کوفہ کے نام لے جا رہے تھے اسی قادسیہ میں پہنچ کر حصین کے ہاتھوں گرفتار ہوئے اور جب امام نے بطن عقیق کے بعد یہ سن کر کہ آگے فوج سدِ راہ ہے سمتِ سفر میں تبدیلی فرمائی تو حُر ایک ہزار کے لشکر کے ساتھ اسی فوج میں سے بھیجا گیا جو قادسیہ میں حصین کی سرکردگی میں موجود تھی۔ جب حُر نے ابن زیاد کے خط کی تعمیل کرتے ہوئے حضرت امام حسینؑ کو کربلا میں اترنے پر مجبور کر دیا تو اس نے ابن زیاد کو اس کی اطلاع دی۔ یہ وقت وہ تھا کہ ملک عجم میں بغاوت ہو گئی تھی اور "دستبیٰ"[2] کے مقام پر قبیلۂ دیلم نے قبضہ کر لیا تھا۔ اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے مشہور فاتح عراق سعد بن ابی وقاص کے بیٹے عمر بن سعد کو چار ہزار فوج کا سردار بنایا گیا تھا اور اس کے لیے رے اور

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۲۲ و ۲۲۳۔ الاخبار الطوال ص ۲۴۳۔ [2] دستبیٰ کا نام تاریخ میں ہمدان اور رے کی فتح کے ساتھ ساتھ آتا ہے۔ نعیم بن مقرن نے ان مقامات کو ۲۲ھ یا ۲۳ھ میں فتح کیا۔ دستبیٰ چند اہلِ کوفہ میں تقسیم کر دیا گیا جن کے نام یہ ہیں۔ عصمہ بن عبداللہ ضبی، مہلہل بن زید طائی، سماک بن عبد عبسی، سماک بن مخرمہ اسدی اور سماک بن خرشہ انصاری۔ یہ لوگ مسلمانوں میں سب سے پہلے دستبیٰ کی چھاؤنیوں کے والی ہوئے اور انھوں نے دیلم سے جنگ کی۔ ایک قول یہ ہے کہ رے کو قرظہ بن کعب نے فتح کیا (طبری ج ۴ ص ۲۵۱) دستبیٰ ہمدان کا جزو تھا اور وہاں کی چھاؤنیاں ہمدان تک پھیلی ہوئی تھیں (طبری ج ۴ ص ۲۵۲) نعیم نے فتح کرنے کے بعد رے کا قدیم شہر برباد کر دیا اور اس سے ہٹ کر نئے شہر کی بنیاد قائم ہوئی (ص ۲۵۳)

سرحد دستبیٰ و دیلم کی حکومت کا پروانہ لکھ دیا گیا تھا چنانچہ یہ فوج ایران جانے کے لیے باہر نکل بھی چکی تھی[۱] اور عمر ابن سعد اس فوج کو ساتھ لیے کوفہ کے باہر مقام "حمام اعین" پر خیمہ زن تھا اور عنقریب آگے بڑھنے والا تھا۔[۲] اب امام حسینؑ کی مہم جو درپیش ہوئی تو ابن زیاد نے عمر بن سعد کو حکم دیا کہ پہلے اس مہم کو سر کرے اور پھر ایران کی طرف روانہ ہو۔[۳]

عمر سعد صحابی تو نہیں مگر عام مسلمانوں کی اصطلاح کے مطابق تابعی ضرور تھا۔ عین خلیفۂ دوم عمر بن خطاب کے انتقال کے دن اسکی پیدائش ہوئی تھی[۴] اور اس کے سن تمیز تک پہنچنے تک بہت سے صحابۂ رسولؐ موجود تھے۔ یقینی ان کی زبانی اس نے وہ احادیث بھی سنے ہوں گے جو پیغمبرِ اسلامؐ نے حسنؑ و حسینؑ کے بارے میں فرمائے تھے۔ نیز امام حسینؑ کے ساتھ رسولؐ کی انتہائی محبت کے واقعات بھی اس کے گوش زد ہوئے ہوں گے۔ پھر حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے زمانۂ خلافت میں جب کہ امام حسینؑ بھی کوفہ میں موجود تھے عمر بن سعد کا کچھ ایسا کم سنی اور بے شعوری کا دور نہ تھا۔ اسے یقینی قریب سے حضرت امام حسینؑ کے محاسن ذات اور بلند اوصاف و اخلاق کے مشاہدہ کا موقع ملا ہوگا اور جب سے آپ مدینہ تشریف لے گئے تھے تو اب تک بیس برس کی مدت میں آنے جانے والوں کی زبان سے اس نے امام کے زہد و تقویٰ، عبادت و ریاضت اور خوش اخلاقی و سخاوت کے کتنے ہی واقعات ضرور سنے ہوں گے۔

شاید انہی امور کا نتیجہ تھا کہ وہ حضرت امام حسینؑ سے جنگ کو پسند نہ کرتا تھا اور اسے ایک گناہ خیال کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے انکار کیا اور کہا کہ مجھے معاف کر دیجیے تو بہتر ہے۔ ابن زیاد نے جواب دیا کہ اچھا تو ہمارا پروانہ حکومت رَے کا واپس کر دو۔ یہ معاملہ سخت تھا۔ عمر سعد کو رَے کی حکومت دل سے عزیز تھی۔ جاہ طلبی اور حق شناسی کے جذبوں میں کشمکش ہوئی۔ یہاں تک کہ اسے یکسوئی حاصل کرنے کے لیے ایک دن کی مہلت مانگنا پڑی۔ مہلت ملی اور عمر سعد نے اپنے مخصوص احباب و اعزہ سے مشورہ کیا۔ سب نے مخالفت کی اور اس مہم کے لیے جانے سے منع کیا۔

[۱] الاخبار الطوال ص ۲۵۱ [۲] طبری ج ۶ ص ۲۳۲ [۳] طبری ج ۶ ص ۲۳۳ [۴] تقریب التہذیب ص ۱۹

حمزہ بن مغیرہ بن شعبہ نے جو اس کا بھانجا تھا حسب ذیل تقریر کی: "آپ حسینؑ سے جنگ کرنے کو نہ جایئے اور گنہگار ہونے کے ساتھ ساتھ رشتۂ قرابت کو قطع کرنے کے مرتکب نہ ہوجیے۔ خدا کی قسم اگر تمام دنیا کا مال و دولت اور عالم بھر کی سلطنت آپ کے قبضہ میں ہو اور پھر وہ نکل جائے تو بہتر ہے اس سے کہ آپ حسینؑ کے خون کا بار اپنی گردن پر لیں۔"[۱]

یہ وہ پہلو تھا جسے اس کے سچے مشیر کار پیش کر رہے تھے لیکن دوسری طرف اس کا جاہ طلبی کا جذبہ رہ رہ کر رَے کی حکومت کا خیال دلا رہا تھا۔ وہ ایک دماغی کشمکش میں مبتلا تھا جسے شب کے تاریک پردہ میں اس کے یہ اشعار ظاہر کر رہے تھے ؎

اأترك ملك الري والري رغبتي	ام ارجع مذموما بقتل حسينؑ
وفي قتله النار التي ليس دونها	حجاب وملك الري قرة عيني

(یعنی) "کیا میں رَے کی حکومت چھوڑ دوں درآنحالیکہ وہ مجھے دل سے پسند ہے یا میں حسینؑ کو قتل کر کے طوق مذمت میں گرفتار ہوں؛ ان کے قتل کرنے میں دوزخ کی آگ ہے جس کے متعلق شک و شبہ کی گنجائش نہیں اور رَے کا ملک میری آنکھوں کے لیے ٹھنڈک ہے۔"[۲]

بعض مؤرخین اس کے ساتھ مزید اشعار اور نقل کرتے ہیں جن کا مضمون یہ ہے کہ حسینؑ کے قتل کا جو کچھ جرم ہے اس کا نتیجہ مرنے کے بعد نمایاں ہوگا جو معلوم نہیں صحیح بھی ہے یا نہیں، پھر رَے کی نقد حکومت کو چھوڑ کر آخرت کے راحت و آرام کی امید باندھنا کس سمجھدار آدمی کا کام ہو سکتا ہے؟

غالباً ان اشعار کی روایت صحیح ہے۔ اس لیے کہ نتیجۃً عمر بن سعد کے عمل سے بھی اسکی تصدیق ہوتی ہے۔ نتیجہ یہی تھا کہ دنیا کی وقتی دلفریبی غالب آئی اور اس نے فرزندِ رسولؐ سے جنگ کرنے پر کمر باندھ لی مگر ایک آخری بار ضمیر کی چٹکیوں نے اسے پھر آمادہ کیا کہ وہ ابن زیاد سے کمزور الفاظ ہی میں سہی معذرت کرے۔ چنانچہ اس نے آکر کہا کہ آپ مجھ کو دستبیٰ اور دیلم کے حدود کی طرف جانے پر مامور کر چکے ہیں۔ لوگوں کو اس کا علم بھی ہو گیا ہے اور میری فوج والوں نے

[۱] طبری ج ۶ ص ۲۳۲ [۲] کتاب البلدان ص ۲۷۱

بھی وہیں جانے کی تیاری کی ہے۔ بہتر ہے کہ آپ مجھ کو ادھر ہی روانہ کیجیے اور حسینؑ بن علیؑ کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے کسی اور کو اشراف اہلِ کوفہ میں سے جو کسی طرح شخصیت و شہرت اور فنِ سپہگری و مہارتِ جنگ میں مجھ سے کم نہیں روانہ کر دیجیے۔ چنانچہ اس نے چند آدمیوں کے سرداران اہلِ کوفہ میں سے نام بھی لے دیے مگر ابن زیاد برہم ہو گیا اور اس نے کہا کہ تمھیں سردارانِ کوفہ کے نام مجھے گنوانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اگر کسی کو بھیجنا ہو گا تو تم سے مشورہ لے کر نہیں بھیجوں گا۔ تم تو اپنے متعلق کہو کہ تمھیں جانا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں جانا ہے تو ہمارا پروانہ حکومت رَے کا واپس کرو۔ عمر سعد نے سمجھ لیا کہ بغیر قربانی کے اس جرم سے چھٹکارا ملنا ممکن نہیں اور قربانی کے لیے اس کا نفس تیار نہیں ہوتا تھا۔ آخر اس نے اقرار کر لیا کہ اچھا میں ہی جاؤں گا۔ چنانچہ وہی چار ہزار کی فوج جو ملک ایران جانے پر کمربستہ تھی کربلا کی طرف روانہ ہو گئی اور عمر سعد اس فوج کے ساتھ امام حسینؑ کے ورود کربلا کے دوسرے ہی دن[1] یعنی تیسری محرّم کو یہاں پہنچ گیا۔

کربلا میں حُر کے ساتھ ایکہزار کی فوج پہلے ہی سے موجود تھی۔ اب عمر سعد کی فوج ملا کر پانچہزار ہوئی۔ حضرت امام حسینؑ اور ان کی مختصر جماعت کے لیے ظاہری حیثیت میں اتنا لشکر بہت تھا مگر امام حسینؑ کی خاندانی شجاعت اور ان کی سچائی کی طاقت کا ابن زیاد کے دل پر اتنا رعب تھا کہ وہ فوج کی زیادہ سے زیادہ مقدار کو بھی کم سمجھتا رہا۔ چنانچہ حصین بن تمیم کوتوال شہر کوفہ کی سرداری میں قادسیہ کے ناکے پر جو باقی تین ہزار فوج تھی وہ پوری کی پوری کربلا کی طرف منتقل کر دی گئی اس کے بعد کوفہ میں عام بھرتی کا اعلان کر دیا گیا اور ابن زیاد خود کوفہ سے باہر نکل کر نخیلہ میں جو کربلا کے راستہ پر تھا آکر خیمہ زن ہو گیا تاکہ اپنے سامنے افواج کا معائنہ کر کے پے درپے کربلا کی جانب روانہ کرے اور بڑے بڑے سرداران کوفہ حجار بن ابجر، شبث بن ربعی، عمرو بن الحجاج وغیرہ کو مامور کیا گیا کہ وہ اپنی اپنی جماعت کے ساتھ کربلا روانہ ہوں۔ ان میں سے ہر ایک کثیر فوج کے ساتھ روانہ ہوتا تھا۔ ان میں سے کسی ایک کا کوئی عذر بھی سنا نہیں جاتا تھا۔ چنانچہ

[1] [illegible]

شبث نے بیماری کا عذر کیا تھا لیکن ابن زیاد نے کہا، تم بیمار بن رہے ہو، اگر تم ہماری اطاعت میں ہو تو ہمارے دشمن سے جنگ کے لیے روانہ ہو۔ مجبوراً شبث بھی روانہ ہوا۔ بعض اشخاص ایسے تھے کہ ابن زیاد کو اپنی صورت دکھا کر پھر کوفہ واپس چلے جاتے تھے۔ جب ابن زیاد کو اس کا علم ہوا تو اس نے سوید بن عبدالرحمٰن منقری کو کچھ سواروں کے ساتھ کوفہ روانہ کیا کہ جو شخص کوفہ میں نظر آئے اور وہ ابھی تک حسینؑ سے جنگ کرنے کو نہیں روانہ ہوا اسے گرفتار کر کے میرے پاس لاؤ۔ چنانچہ سوید نے کوفہ کے قبیلوں میں گردش کی۔ اتفاق سے ایک شخص شام کا رہنے والا اپنے کسی متروکہ کے جھگڑے میں کوفہ آیا تھا۔ سوید نے اسے پکڑ کر ابن زیاد کے پاس بھیج دیا۔ اس کی گردن مار دی گئی۔ اس واقعہ سے تمام لوگوں پر دہشت طاری ہو گئی اور سب امام حسینؑ سے جنگ کے لیے نکل کھڑے ہوئے[1]۔ اس کے بعد تاریخ کے لحاظ سے مردم شماری کی ضرورت نہیں اور نہ علماء کے اقوال دیکھنے کی حاجت کہ بیس ہزار تھے جسے ابن طاؤس نے ترجیح دی ہے یا تیس ہزار جسکو علامہ مجلسی نے مانا ہے، یا پینتیس ہزار جیسا کہ ابن شہر آشوب نے لکھا ہے، یا ایک لاکھ تک مطابق بعض اہلِ مقاتل کی تحریر کے بلکہ گزشتہ انتظامات ہی سے ظاہر ہے کہ کوفہ کی تمام قابل جنگ آبادی کربلا میں انڈیل دی گئی تھی۔ جس کے بعد کربلا کی زمین فوجوں کی کثرت سے موجیں مارنے لگی تھی۔

[1] الاخبار الطوال ص۲۵۲

اکیسواں باب

انصار امام حسینؑ، ان کی قلتِ تعداد اور اسکے اسباب

سابقہ ابواب میں ان واقعات وحالات کا تذکرہ ہوچکا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کوفہ کی اس جماعت میں سے جو حضرت امام حسینؑ کی ہمدرد تھی اور جنھیں آپ کی نصرت کا فریضہ محسوس ہو سکتا تھا ایک کثیر تعداد پا بزنجیر کرلی گئی تھی۔ نیز حدود کی ناکہ بندی[1] نے اطراف وجوانب کے رہے سہے اشخاص کے لیے حضرت تک پہنچنا دشوار سے دشوار تر بنا دیا تھا اور کوفہ سے اگر کوئی آنے کا قصد کرتا تو نخیلہ میں جہاں ابن زیاد نے اپنا پڑاؤ ڈالا تھا گرفتار کرلیا جاتا اور کسی دوسری طرف سے آنا چاہتا تو قادسیہ وخفان وقطقطانہ، لعلع وغیرہ کی کسی نہ کسی منزل پر وہ مقید ہوجاتا۔

اس کے علاوہ کربلا میں آپ کا ورود اچانک طور پر تھا اس لیے اطراف وجوانب میں اس کی اطلاع تک ممکن نہ تھی جبکہ بعد کے واقعات بتاتے ہیں کہ اس وقت تک بھی کہ جب امام حسینؑ شہید ہوچکے ہیں اور اسیروں کو کوفہ لے جایا گیا ہے بہت سے اشخاص ان واقعات سے بےخبر تھے ایسی صورت میں یہ ممکن ہی نہ تھا کہ آپ کے پاس کوئی بڑی جمعیت نصرت کے لیے پہنچ جاتی۔ خصوصاً جبکہ آپ نے پہلے ہی سے اپنے ساتھ تعداد کے بڑھانے کی کوئی کوشش بھی نہ فرمائی تھی۔ پھر بھی مذکورۂ بالا تمام مشکلات کے باوجود شیعانِ کوفہ کی وفاداری اور اولوالعزمی کا ایک بڑا تاریخی کارنامہ یہ ہے کہ وہ افراد جو امام حسینؑ کے کوفہ کی طرف تشریف لانے کی تحریک کے ذمہ دار تھے جنھوں نے حضرت مسلم بن عقیل سے ان کے ورود کے موقع پر پہلے جلسہ میں وفاداری کا اقرار اور جانبازی کا عہد کیا تھا وہ کسی نہ کسی طرح حسینؑ بن علی تک پہنچ گئے اور اپنی جانیں آپ کے قدموں پر نثار

---

[1] طبری ج ۶ ص۲۲۳

کردیں اور جو لوگ اس جماعت میں سے حسینؑ کی نصرت کے لیے نہ پہنچے یا نہ پہنچ سکے ان میں سے بھی کسی متنفس کی امام حسینؑ کے خلاف معرکۂ کربلا میں موجودگی ہرگز پائی نہیں جاتی۔ بلکہ کچھ کمزور عزم و ایمان رکھنے والے اشخاص جو بظاہر ضعیف العمر بھی تھے اس لیے ابن زیاد کی فوج میں جانے سے بھی مستثنیٰ ہوسکے تھے اس وقت جب کربلا میں جہاد ہو رہا تھا، بیرونِ کوفہ ٹیلے پر کھڑے ہوئے آنسو بہا رہے تھے اور دعائیں مانگ رہے تھے کہ خداوندا اپنی نصرت نازل فرما اہل بیتِ رسولؐ اور ان کے انصار پر۔ جنھیں اس طرح دیکھ کر راوی کو غصہ آیا اور کہا اے کم بختو تمھارے جذبات یہ ہیں تو آخر خود جاکر نصرت کیوں نہیں کرتے؟[1]

مگر یہ توقع ہر شخص سے کرنا کہ وہ عزم وہمت میں مسلم بن عوسجہ اور حبیب بن مظاہر ہی ثابت ہو ایک دور از کار بات ہے۔ بہرحال ان کمزور نفوس والے افراد کے بالمقابل ان پُرجگر اور باوفا افراد کی تعداد جنھوں نے امام حسینؑ کا اس نازک موقف میں ساتھ دیا اور وہ کوفہ ہی کے باشندہ تھے بجائے خود قلیل ہونے کے باوجود تاریخ عالم کے تجربات کو سامنے رکھتے ہوئے ہرگز کم نہیں ہے۔

یہی وہ پہلو ہے جسے اہلِ کوفہ کی حمایت میں پیش کیا گیا۔ اس وقت جب ابوالعباس سفاح کے سامنے ابوبکر ہذلی بصری اور ابن عیاش میں بصرہ اور کوفہ کی باہمی فضیلت کے بارے میں مناظرہ ہوا اور ابن عیاش نے شجاعت کے تذکرہ میں کچھ شہسواران کوفہ کے نام لیے اور ابوبکر ہذلی نے دکھتی ہوئی رگ کو دباتے ہوئے کہا کہ "کوفہ والوں کی بہادری کا کیا کہنا کہ ان میں جتنے بھی تھے وہ یا امام حسینؑ اور ان کے اقربا وانصار کے قاتل تھے یا عدم تعاون کرنے والے یا ان کا مال واسباب لوٹنے والے یا ان کی لاشوں کو پامال کرنے والے۔" یہ سنکر ابن عیاش نے کہا کہ جو فخر کا پہلو ہے وہ تم نے چھوڑ دیا اور طعنے دینے پر اُتر آئے۔ تم نے امام حسینؑ کے والد بزرگوار حضرت علیؑ بن ابی طالب کو قتل کیا (ابن ملجم بصرہ کا رہنے والا تھا) رہ گئے اہلِ کوفہ

---

[1] طبری ج ۶ ص۲۲۲

ان میں سے حضرت امام حسینؑ کے ساتھ روزِ شہادت چالیس آدمی تھے جب کہ آپ کے سپاہیوں کی مجموعی تعداد تقریباً ستر تھی اور کوفہ کے یہ جتنے آدمی تھے ان میں سے کوئی ایک بھی زندہ واپس نہیں گیا بلکہ سب نے امام پر اپنی جان نثار کی اور ہر ایک نے قتل ہونے سے پہلے کچھ نہ کچھ اپنے دشمنوں کو قتل بھی کیا[1]

حقیقت یہ ہے کہ فوج عمر سعد میں کوفہ کے عوام تھے اور اطراف و جوانب کے قبائل جن کا مسلک صرف اطاعتِ شیوخ تھا اور کچھ نہیں۔ ان میں سے اکثر کا نصب العین قتل امام حسینؑ میں صرف حکمِ حاکم کی تعمیل اور اپنی فوجی ذمہ داری کا پورا کرنا اور جائزہ و انعام کی ہوس تھی اور کچھ ایسے بھی تھے جو حضرت امام حسینؑ سے جنگ کرنے پر خوشی سے رضامند نہ تھے مگر ان میں اتنی قوتِ ارادی نہ تھی کہ وہ حکومت کے خلاف اپنے اختیار سے کام لیں۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ ان میں بہت سے ایسے جوان اور نوعمر بھی ہوں جو حسینؑ کی شخصیت سے آگاہ ہی نہ ہوں اور وہ صرف سمجھتے ہوں کہ ہم کو حاکم کی طرف سے ایک باغی سے مقابلہ کرنے کے لیے روانہ کیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف حضرت امام حسینؑ کے ساتھ کوفہ کے جتنے آدمی تھے وہ وہاں کی خلقت کے دل و دماغ تھے۔ وہ وہ تھے جو دنیا کے تمام محرکات کے مقابل میں اپنے شعور اور ارادہ کے مالک ثابت ہوئے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ ان میں سے بہت سوں سے کوفہ کے عوام واقف بھی تھے اور ان کی شخصیت سے متاثر ہوتے تھے اور ان کے لیے یہ عجیب معمہ بن گیا تھا کہ ایسے عابد و زاہد اور پرہیزگار لوگ آج کس طرح میدانِ جنگ میں آگئے ہیں؟ ان شخصیتوں کا فوجِ مخالف کے افراد پر اتنا زبردست اثر پڑ رہا تھا کہ ان کے دلوں کی طاقت نے جواب دے دیا تھا۔ واقعۂ کربلا کی جنگ میں بارہا تاریخ کے اوراق پر نظر آتا ہے کہ فوجِ مخالف نے حسینی مجاہدین کے سامنے سے فرار کیا۔ حقیقتاً یہ فرار مادی قوت کی کمی کا نتیجہ نہیں بلکہ ان میں سب سے زیادہ ضمیر کی کمزوری کا دخل تھا۔

---

[1] کتاب البلدان ص ۱۷۲

درحقیقت یہ ایک مارے باندھے کا سودا تھا جو کیا جا رہا تھا جس کے لیے آخر وقت تک فوج کی اکثریت سپر انداختہ ثابت ہو رہی تھی اور کچھ افسران فوج کی زبردستیاں اور جائزہ و انعام وغیرہ کے ترغیبات اور عتابِ حکومت کے تازیانے ہی تھے جو ان کے جذباتِ صداقت کی کمزوری کے باعث ان کے رکتے ہوئے قدموں کو بار بار آگے بڑھاتے تھے۔ اس کے برخلاف حسینی سپاہیوں کا ضبط و نظام ایک بے مثال نمونہ ہے۔ یہاں نہ بڑھنے کے موقع پر قدم پیچھے ہٹنے کا امکان تھا، نہ بے موقع قدم آگے بڑھنے کا سوال۔ ان کا کوئی اقدام جوش کے ماتحت نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ برابر اپنے سالار کے اشارہ کے منتظر رہتے تھے اور جس وقت تک امام اتمامِ حجت کی منزلوں کو ختم کر کے جنگ کے اقدام کو حق بجانب نہ سمجھ لیں۔ اس وقت تک ایک سپاہی بھی ایسا نہ تھا جو حسینی نظام کے خلاف خودرائی یا خودسری سے کام لے۔ یہ بات صرف اس لیے تھی کہ یہ جتنے افراد تھے سب عارفِ حق امام کے تربیت یافتہ اور صاحبِ اخلاق تھے۔

بائیسواں باب

صُلح کی باتیں

عمر سعد چاہتا تو تھا ہی کہ کسی طرح اس جرم عظیم سے جس میں وہ حرص دنیا کی بدولت اپنے ہاتھوں گرفتار ہونے جا رہا ہے چھٹکارا حاصل کرے چنانچہ اس نے کربلا آکر ایک کوشش معاملات کے سلجھانے کی شروع کی۔ اس طرح کہ عزرہ بن قیس احمسی کو بلا کر یہ چاہا کہ وہ امام حسینؑ کے پاس جا کر آپ کے مقصدِ تشریف آوری کو معلوم کرے مگر عزرہ' یہ ان سات آدمیوں میں سے تھا جنھوں نے وقتی سیاست سے متاثر ہو کر جماعتِ شیعہ کے خطوط جانے کے بعد اپنی جانب سے امام حسینؑ کو ایک دعوتی خط لکھ دیا تھا۔ اس لیے اس کو آپ کے پاس جانے اور اس قسم کی گفتگو کرنے سے حجاب دامن گیر ہوا اور اس نے انکار کر دیا کہ میں نہیں جاؤں گا۔ دوسرے ایسے اشخاص کو بھی جو خطوط لکھ چکے تھے جانے میں اسی صورت سے توقف ہوا اور آخر کثیر بن عبداللہ شعبی ایک دُرشت خو اور سخت آدمی یہ کہتا ہوا سامنے آیا کہ میں جانے کے لیے تیار ہوں بلکہ مجھے حسینؑ کے قتل کرنے کے لیے کہا جائے تو اس میں بھی عذر نہیں ہے۔ عمر سعد نے کہا نہیں، یہ مطلب نہیں ہے۔ تم بس جا کر اتنا دریافت کر لو کہ آپ اس ملک میں کس لیے آئے ہیں؟ کثیر خیمہ گاہ حسینی کی طرف روانہ ہوا۔ بہادر ابو ثمامہ صائدی نے جو شاید اس وقت خیمۂ امام حسینؑ پر پہرا دے رہے تھے اسے دور سے دیکھ لیا اور امامؑ سے عرض کیا کہ آپ کی طرف بدترین خلق اور انتہائی سفاک و خونریز شخص آ رہا ہے۔ اس کے بعد وہ خود آگے بڑھ گئے اور انھوں نے کثیر کو روک کر ہتھیار کھول کر رکھ دینے کا مطالبہ کیا۔ اس نے کہا، نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ میں پیغام لے کر آیا ہوں۔ اگر مجھے موقع دو تو میں پیغام پہنچا دوں، نہیں تو واپس جاؤں۔ ابو ثمامہ نے کہا، اچھا میں تمھاری تلوار کے

قبضہ پہ ہاتھ رکھے رہوں گا اور اس طرح تم کو امام کی خدمت میں لے جاؤں گا۔ کثیر نے اسے بھی منظور نہ کیا اور کہا، میری تلوار کو تو تم ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔ ابو ثمامہ نے کہا کہ اچھا پھر اپنا پیغام تم مجھ سے کہہ دو۔ میں اس کا جواب امام سے لا دوں گا۔ اس طرح گفتگو بڑھتے بڑھتے بالآخر سخت کلامی کی نوبت آگئی اور کثیر نے واپس جا کر عمر سعد کو اپنی سرگزشت سے مطلع کر دیا۔

اب اس نے قرہ بن قیس حنظلی کو بلایا اور اس سے کہا تم جا کر حسینؑ سے دریافت کرو کہ وہ اس سرزمین پر کس لیے آئے ہیں[1]؟ چنانچہ قرہ بن قیس روانہ ہوا۔ امام نے جو اسے آتے دیکھا تو دریافت فرمایا کہ تم لوگ اسے پہچانتے ہو؟ حبیب بن مظاہر نے کہا، جی ہاں۔ یہ قبیلۂ حنظلہ کا ایک شخص ہے۔ بنی تمیم میں سے، اور ننھیال کی طرف سے ہمارا عزیز ہوتا ہے میں ایک عرصہ سے اس کو جانتا ہوں اور میرے خیال میں یہ سنجیدہ و فرزانہ شخص تھا۔ مجھے یہ خیال نہ تھا کہ یہ اس موقع پر جنگ کے لیے ہمارے مقابل میں آئے گا۔ اتنی دیر میں وہ آگیا اور امام کی خدمت میں تسلیم بجا لاتے ہوئے اس نے عمر سعد کا پیغام پہنچایا۔ وہی کہ آپ کی تشریف آوری کا مقصد کیا ہے؟ حضرت نے فرمایا۔ "مجھ کو تمھارے شہر کے لوگوں نے لکھا تھا کہ میں آؤں لیکن اب جبکہ وہ میرا آنا ناپسند کرتے ہیں تو میں واپس چلا جاؤں گا۔" یہ جواب اتمامِ حجت کے مقصد کا حامل اور صلح پسندی کے مطابق ہونے کے ساتھ ساتھ بالکل صاف تھا۔ قاصد واپس جانے لگا، حبیب ابن مظاہر کو موقع تبلیغ کا مل گیا۔ کہنے لگے "اے قرہ بن قیس ظالم جماعت کی طرف کہاں واپس جاتے ہو، آؤ اور اس مظلوم کی مدد کرو جس کے بزرگوں کی بدولت تمھاری اور ہماری ہدایت ہوئی ہے۔" قرہ نے کہا۔ میں جو پیغام لایا تھا اس کا جواب پہنچا دوں، پھر غور کروں گا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اس نے جا کر عمر سعد سے جواب امام حسینؑ کا بیان کیا۔ اس جواب سے اسے توقع پیدا ہوئی کہ اب صُلح ہو جائے گی لہٰذا اس نے عبیداللہ بن زیاد

[1] طبری ج ۶ ص ۲۳۳۔ دینوری نے قرہ بن سفیان حنظلی درج کیا ہے (الاخبار الطوال ص ۲۵۱)

کے نام خط لکھا کہ "میں نے یہاں پہنچکر حسینؑ کے پاس اپنا نمائندہ بھیجا اور اس کے ذریعہ سے دریافت کیا کہ وہ ادھر کیوں آئے ہیں؟ کیا چاہتے ہیں اور کیا مطالبہ رکھتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ اس ملک کے لوگوں نے مجھ کو لکھا تھا اور میرے پاس ان کے قاصد گئے تھے اور مجھے ادھر آنے کی دعوت دی تھی۔ لیکن اب جبکہ وہ میرا آنا ناپسند کرتے ہیں اور ان کے خیالات میں تبدیلی ہوگئی ہے تو میں جہاں سے آیا ہوں ادھر ہی واپس چلا جاؤں گا۔"

خط پہنچا۔ ابن زیاد نے پڑھا اور غرور و تکبّر، فرعونیت اور ظلم و سفاکی کے جذبہ کے ماتحت اس نے یہ شعر پڑھ کر اپنی تاریک ذہنیت کا ثبوت دیا ؎

الآن اذ علقت مخالبنا بہ
یرجو النجاۃ ولات حین مناص

(یعنی) "اب جبکہ ہمارے چنگل ان تک پہنچ گئے ہیں تو وہ نجات کے طالب ہیں۔ ہرگز نہیں۔ اب وہ ہم سے بچ کر کہاں جائیں گے۔"

اس نے عمر سعد کو لکھا۔ "خط پہنچا اور حال معلوم ہوا۔ تم حسینؑ کے سامنے یہ سوال پیش کرو کہ وہ اور ان کے تمام اصحاب یزید بن معاویہ کی بیعت کرلیں۔ جب وہ ایسا کر چکیں گے تو پھر ہم رائے قائم کریں گے۔"[1]

اس خط سے عمر سعد کی امیدوں کی دنیا میں ایک دفعہ پھر تاریکی چھا گئی۔ اس خط کے عنوان میں ابن زیاد کی مفسد اور فتنہ پسند ذہنیت کا پورا پورا ثبوت موجود تھا۔ اول بیعتِ یزید کا امام حسینؑ سے مطالبہ ہی ایسا تھا جس کا اثر قبول کرنا آپ کے لیے ناممکن تھا، پھر اس پر طرّہ یہ کہ بفرضِ محال بیعت کر لینے کی صورت میں بھی حکومت کی طرف سے کسی خوشگوار نتیجہ کا وعدہ نہ تھا بلکہ یہ کہا جا رہا تھا کہ ہم پھر رائے قائم کریں گے۔ اس کے یہی معنی ہوسکتے تھے کہ اس کے بعد بھی حکومت امام حسینؑ کے گزشتہ انکارِ بیعت کی بنا پر آپ کے لیے کچھ سزا

[1] الاخبار الطوال ص ۲۵۲

تجویز کرنے کا حق رکھے گی۔

خط کا انداز بتاتا ہے کہ ابن زیاد حضرت امام حسینؑ کے اتمام حجت پر مبنی جواب کی صحیح نوعیت کو نہیں سمجھا اور اس نے خیال کیا کہ فوج کی کثرت کو دیکھ کر آپ ڈر گئے ہیں اور اس لیے کہ میں جہاں سے آیا ہوں وہیں واپس چلا جاؤں گا۔ مگر عمر سعد حسینؑ اور ان کے اصحاب کے تیوروں کو قریب سے دیکھ رہا تھا اور سمجھتا تھا کہ آپ کا جواب صرف امن پسندی اور سلامت روی کا نتیجہ ہے کسی ہیبت اور خوف پر مبنی نہیں ہے۔ اس لیے اس نے ابن زیاد کے اس خط کو بالکل نامعقول سمجھتے ہوئے کہا۔ "مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ امیر ابن زیاد امن و سکون کے خواہاں نہیں ہیں"[1]

پھر بھی اس نے یہ کیا کہ ابن زیاد کا خط امام حسینؑ کے پاس بھیج دیا۔ امام حسینؑ نے وہی کہا جو عمر سعد سمجھ چکا تھا۔ یعنی "یہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔ زیادہ سے زیادہ موت ہی تو ہے۔ میں اس کا خیر مقدم کرنے کے لیے تیار ہوں"[2] عمر سعد نے یہ جواب امام حسینؑ کا ابن زیاد کے پاس بھیج دیا۔

[1] طبری ج ۶ ص ۲۳۴، ارشاد ص ۲۳۹ - ۲۴۰ - الاخبار الطوال ص ۲۵۱ [2] الاخبار الطوال ص ۲۵۲

تئیسواں باب

بندشِ آب اور غلبۂ تشنگی

حقیقتِ امر یہ ہے کہ امام حسینؑ اور آپ کے اصحاب و اقرباء یہاں تک کہ اطفال خورد سال پر پانی بند کرنے کا انتظام دوسری محرم ہی کو ہو گیا تھا۔ اس خط کے ذریعہ سے جو ابن زیاد نے حُر بن یزید ریاحی کے پاس بھیجا تھا اور جس میں صاف صاف لکھا تھا کہ حسینؑ کے ساتھ سختی سے پیش آؤ۔ اور انھیں ایک ایسی جگہ قیام پر مجبور کرو جہاں پانی موجود نہ ہو۔ اس حکم کے نفاذ میں اتنا اہتمام تھا کہ قاصد کو یہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ حُر سے اس وقت تک جدا نہ ہو جب تک اس حکم کی تعمیل نہ ہو جائے۔ چنانچہ حُر نے امام کے سامنے اپنی مجبوری کا اظہار کر کے حضرت کو کربلا میں ایسے ہی بے آب مقام پر قیام کے لیے مجبور کیا[1] اس کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ پہلے ہو چکا ہے۔

اس کے بعد اب صورت حال یہ تھی کہ امام حسینؑ آپ کے اصحاب و اعزّہ مخدراتِ عصمت اور اطفال ان سب کے خیمے نہر سے دور جلتی ہوئی ریت پر تھے۔ صحرائے عرب کا سورج دن بھر اپنی پوری قوت سے ان خیام پر چمکتا تھا جس کے اندر رہنے والے یقیناً تمازتِ آفتاب شدّت کے ساتھ محسوس کر سکتے تھے۔ نہر فرات فاصلہ پر رواں تھی اور وہاں دشمن فوج کا قیام تھا۔

کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ابن زیاد کے خط کے جس جزو پر ہر دیکھنے والے کی نظر سب سے پہلے پڑتی ہے اور جسے حُر نے بھی خاص اہمیت دی "بے آب مقام" اس کے مقصد کی طرف خود ابن زیاد کی فوج کے سپاہیوں کی نظر نہ گئی ہو گی جبکہ ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ حکومت کے اقتدارِ اعلیٰ والے افراد فریقِ مخالف کے ساتھ جس سخت گیری کا حکم نہیں بھی دیتے، چھوٹے درجہ کے عمّال اور سپاہی

[1] الاخبار الطوال ص ۲۴۹۔ ۲۵۰، طبری ج ۶ ص ۲۳۲، ارشاد ص ۲۱۳، کامل ابن اثیر ج ۴ ص ۲۶، ابو الفداء ج ۱ ص ۱۹۰

برنائے تعصب اور نیز اپنے بڑوں کو ان کے مخالف کے ساتھ سختی کر کے خوش کرنے کے لیے اس کے لیے بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ چہ جائیکہ حاکم کی طرف سے شرت کے ساتھ سختی کرنے کا حکم اور پھر صاف صاف پانی سے دور رکھنے کا فرمان بھی ہو گیا ہو۔ اس کے بعد یہ کسی طرح سمجھا ہی نہیں جا سکتا کہ اب حسینؑ اور اصحابِ حسینؑ کے لیے پانی باطمینان و سکون اور بالکل بآسانی بغیر کسی رکاوٹ کے حاصل ہو جاتا ہو گا۔

ہاں ممکن ہے حُر اپنی ذات سے سختی نہ کرتا ہو۔ چونکہ وہ پہلے ہی امام کی حقانیت سے کچھ متاثر ضرور تھا مگر جب ابھی وہ "با زمانہ بساز" پر عامل تھا اور حکومتِ وقت کی مخالفت پر کھل کر آمادہ نہ تھا تو دوسرے سپاہیوں کو وہ صاف صاف سختی و درشتی سے باز بھی نہ رکھ سکتا تھا پھر یہ تو دو ایک دن کی بات تھی کہ حُر سالارِ فوج تھا۔ اس کے بعد عمر سعد آ گیا اور مزید فوجیں کربلا میں جمع ہو گئیں جس کے بعد حُر کی کوئی اہم حیثیت باقی نہیں رہی تھی اور نہ اس کی آواز کوئی آواز بھی جا سکتی تھی اس لیے یقیناً ان دنوں میں بھی اصحابِ امام کے لیے پانی تک پہنچنا اور پانی بھر کر لانا ہر مرتبہ ایک خطرہ اور کشمکش کا مقابلہ کرنا تھا جسے اسی وقت اختیار کیا جاتا ہو گا جب بچوں کی پیاس بہت بڑھ جائے یا پوری جماعت پر پیاس کا شدید غلبہ ہو۔ چنانچہ اس سلسلہ میں بعض وقت جنگ بھی ہو گئی ہے اور جنگ کر کے پانی حاصل کیا گیا ہے[1]

ساتویں محرم کو وہ خاص تاریخ تھی جب ابن زیاد کا دوسرا خط عمر سعد کے پاس پہنچا۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ:-

"حسینؑ اور ان کے اصحاب پر پانی بند کر دو، اس طرح کہ انھیں ایک قطرہ بھی پانی ملنے نہ پائے جیسا عثمان بن عفّان کے ساتھ سلوک کیا گیا تھا۔"[2]

عمر سعد نے اس خط کو دیکھتے ہی عمرو بن حجاج زبیدی کو پانچسو سواروں کی فوج کے ساتھ گھاٹ پر مقرر کر دیا اور یہ تاکید کر دی کہ ایک قطرہ خیام حسینی کی طرف جانے نہ پائے۔

[1] الامامۃ والسیاستہ لابن قتیبہ ص ۱۸۷ [2] الاخبار الطوال ص ۲۵۵، طبری ج ۶ ص ۲۳۴، ارشاد

تاریخ میں تصریح ہے کہ یہ امام حسینؑ کی شہادت سے تین روز قبل کا واقعہ ہے[1] پانی کی اس بندش کے بعد جماعت حسینی کے تمام افراد اور بالخصوص صغیر اطفال پر پیاس کا شدید غلبہ ہو گیا[2]

پھر دشمن کی یہ تنگ ظرفی تھی کہ اس ظلم و تشدد کے ساتھ زخم زبان بھی لگائے جا رہے تھے۔ جیسے یہ فقرہ کہ :۔ "حسینؑ ! دیکھتے ہو یہ پانی نیلا نیلا آسمانی رنگت کا کس طرح بہہ رہا ہے مگر تم مرتے دم تک اس میں سے ایک قطرہ بھی نہیں پا سکتے۔"[3]

اور یہ کہ "اے حسینؑ ! یہ پانی موجود ہے۔ جس میں کتے تک منہ ڈالتے ہیں اور عراق کے سؤر، گدھے اور بھیڑیے تک اس میں سے پیتے ہیں۔ مگر تم اس میں سے بخدا ایک قطرہ چکھ بھی نہیں سکتے۔"[4]

بعید نہیں ہے کہ فوج یزیدی کا خیال یہ ہو کہ جماعت حسینی سے کسی جنگ کی ضرورت ہی نہ پڑے گی۔ پیاس کی شدت ہی ان کے ختم کرنے کے لیے کافی ہو گی۔ چنانچہ ایک موقع پر جب حضرت نے اتمام حجت کے لیے خطبہ پڑھا اور پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ اپنے خصوصی تعلق کا اظہار کر کے ان نام نہاد مسلمانوں میں احساس فرض پیدا کرنے کی کوشش فرمائی تو اس کے جواب میں کہا گیا کہ "ہم یہ سب جانتے ہیں مگر اس کے باوجود تم کو چھوڑیں گے نہیں۔ یہاں تک کہ پیاس کی شدت کی وجہ سے ہی تم دنیا سے رخصت ہو جاؤ۔"[5]

حالانکہ حسینی اصحاب نے اپنی شجاعت سے یہ ثبوت دے دیا کہ ہم اب بھی جب چاہیں تمھیں گھاٹ سے ہٹا کر پانی حاصل کر لیں چنانچہ حضرت ابوالفضل العباس کے ساتویں کے بعد بھی جہاد کر کے پانی لانے کا تذکرہ تاریخ میں ملتا ہے[6]

غالباً یہ آٹھویں شب کا واقعہ ہے اس کے بعد آٹھویں، نویں اور دسویں تین دن کی مسلسل پیاس پھر بھی مسلم طور پر قائم رہتی ہے۔

[1] الاخبار الطوال ص۲۵۲۔ طبری ج ۶ ص۲۳۴۔ ارشاد، کامل ابن اثیر ج ۴ ص۲۶۔ تذکرہ خواص الامہ سبط ابن جوزی ص
[2] لہوف سید ابن طاؤس [3] طبری ج ۴ ص۲۳۴، ابن اثیر ج ۴ ص۲۷۔ ارشاد۔ تذکرہ سبط ابن جوزی ص۴۲
[4] تذکرہ ص۱۴۱ [5] لہوف ابن طاؤس [6] الاخبار الطوال ص۲۵۲، طبری ج ۶ ص۲۲۴

یہ اقربا و انصار حسینی کی یادگار وفاداری ہے کہ بغیر امام کے ان میں سے ایک نے بھی باوجود نہر تک پہنچ جانے کے لب تر نہیں کیے اور صاف کہہ دیا کہ یہ ناممکن ہے کہ ہم پانی پی لیں اور حضرت امام حسینؑ پیاسے رہیں[1] اور یہ امام کی بلند نظری تھی کہ پانی کے حاصل کرنے پر اپنی طاقت صرف نہیں کی بلکہ تین دن تک صرف اتمام حجت کے طور پر ان کے ضمیر کے بیدار کرنے کی کوشش "سوال آب" کی صورت میں کرتے رہے اور اصحاب کو بھی اسی کی اجازت عطا فرمائی چنانچہ جب شدت عطش کا عالم دیکھتے ہوئے بریر ہمدانی نے اجازت چاہی کہ میں ابن سعد کے پاس جا کر پانی کے باب میں گفتگو کروں ممکن ہے کہ اس پر کچھ اثر ہو۔ حضرت نے فرمایا، تمھیں اختیار ہے۔ بریر، عمر سعد کے پاس گئے اور کہا۔ "تم کیسے مسلمان ہو کہ آل رسولؐ کے قتل پر تیار ہو کر آئے ہو۔ پھر اس پر طرہ یہ ہے کہ یہ آب فرات ہے جس میں سے عراق کے کتے اور سؤر تک پانی پیتے ہیں مگر یہ حسینؑ ہیں اور ان کے اہل حرم اور اعزا و اقارب کہ پیاس سے ہلاک ہو رہے ہیں اور انھیں فرات کے پانی تک پہنچنے نہیں دیا جاتا۔"

عمر سعد نے جواب میں گویا اقرار جرم کرتے ہوئے یہ عذر پیش کیا "کہ کیا کروں، رے کی حکومت مجھ سے جاتی رہے گی اگر ابن زیاد کے خلاف کروں اور رے کی حکومت کا ترک کرنا میرے لیے کسی طرح ممکن نہیں ہے[2]"

صبح عاشور جب حر بن یزید لشکر شام سے جدا ہو کر جماعت حسینی کی طرف گئے تو انھیں سب سے زیادہ فوج یزیدی کے جس ظلم و تعدی کا احساس ہوا وہ پانی کا بند کرنا تھا اور ہونا بھی چاہیے تھا اس لیے کہ امام حسینؑ نے اس کے پہلے حر اور اس کی جماعت کو انتہائی تشنگی کے عالم میں سیراب کیا تھا۔ پھر یہ کہ اسی نے ابن زیاد کے حکم سے خیام حسینی کو نہر کے کنارے برپا نہ ہونے دیا اس لیے ایک طرح بندش آب کا وہ اپنے کو ذمہ دار سمجھتے تھے چنانچہ انھوں نے امام حسینؑ سے عفو قصور کرانے کے بعد فوج مخالف کے سامنے جو تقریر کی اس میں انتہائی

[1] طبری ج ۶ ص۲۳۴ [2] کشف الغمہ ص۱۸۹

پُراثر انداز میں جماعتِ حسینی بالخصوص خواتین و اطفال کی عطش کا بیان اور بندشِ آب پر اعتراض کیا ہے۔

اس کا تفصیلی تذکرہ آئندہ آئے گا۔

جب اس تمام اتمام حجت اور موعظہ و نصیحت کا اس ستمگار اور قسی القلب فوج پر کوئی اثر نہ ہوا تو امام حسینؑ اور آپ کے ساتھ کے ہر بچہ نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ راہِ حق پر اُن کے قیام اور ثبات و استقلال میں کسی تشدد اور ایذا رسانی سے ذرہ بھر کمی نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے شدتِ تشنگی کی تکلیف کو برداشت کیا اور تین دن کی پیاس کے عالم میں فریضۂ جہاد کو پورے طور سے ادا کرنے کے ساتھ شہادت کا خیر مقدم کیا۔

چوبیسواں باب

صُلح کی آخری کوشش اور اس کا انجام

حسینؑ اپنے دامن پر یہ دھبہ لینا نہیں چاہتے تھے کہ آپ مسلمانوں کے درمیان خونریزی کو پسند کرتے ہیں۔ اس لیے آپ نے اتمام حجت کے لیے دوبارہ خود اپنی جانب سے صُلح کی گفتگو کا آغاز فرمایا۔ اس طرح کہ عمرو بن قرظہ بن کعب انصاری کو عمر بن سعد کے پاس بھیجا کہ آج شب کو مجھ سے دونوں طرف کے لشکروں کے درمیان مل لینا۔ چنانچہ عمر سعد کوئی بیس سوار اپنے ساتھ لے کر نکلا اور امام بھی اتنے ہی ساتھیوں کے ساتھ تشریف لے گئے مگر جب قریب پہنچے تو آپ نے اپنے ساتھیوں کو ہٹا دیا جس کے بعد ابن سعد نے بھی اپنے ساتھیوں سے علیحدگی اختیار کی۔ یہ مکالمہ بڑی رات گئے تک جاری رہا جس کے بعد امام اپنے خیام کی طرف واپس ہوئے اور ابن سعد اپنے لشکرگاہ کی طرف چلا گیا۔[1]

یہ تمام گفتگو صیغۂ راز میں تھی۔ مختصر طور پر اتنا معلوم ہو سکا کہ امام حسینؑ اس پر آمادہ تھے کہ عراق میں قیام کے خیال کو ترک کر دیں گے اور اگر ضرورت سمجھی جائے تو عرب کا ملک بھی چھوڑ دیں گے اور کسی دور و دراز مقام پر چلے جائیں گے۔[2]

حقیقت کے لحاظ سے اس صورت میں بھی امام حسینؑ کی فتح تھی یعنی آپ کا ملک ترک کرنا بھی اس مقصد کا ایک اعلان تھا جس کی خاطر آپ کو جان دینا پڑی پھر بھی آپ کا رویہ ملائم اور سلجھا ہوا تھا کہ یزیدی فوج کے افسر عمر سعد نے صاف اعتراف کر لیا کہ آپ صلح کے راستے پر گامزن ہیں اور اس نے بہت خوش ہو کر ابن زیاد کو خط لکھا اور حضرت

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۳۵ [2] طبری ج ۶ ص ۲۳۵

امام حسینؑ کی اس شرطِ مصالحت سے اطلاع دی - ان الفاظ کے ساتھ کہ "الحمد للہ فتنہ کی آگ فرو ہو گئی اور مسلمانوں کا شیرازہ مجتمع رہنے کی صورت پیدا ہو گئی اور امتِ اسلامی کا معاملہ روبہ اصلاح ہو گیا۔ آخر میں اس نے اپنی رائے بھی لکھی کہ میرے نزدیک اب مخاصمت کی کوئی وجہ نہیں ہے اور اب اس معاملہ کو ختم ہونا چاہیے" ۱؎

کہا جاتا ہے کہ ابن زیاد نے بھی اس رائے کو منظور کرنا چاہا اور کہا کہ عمر سعد کا یہ خط بہت خیرخواہانہ ہے مگر شمر ۲؎ بگڑ گیا اور کہنے لگا "بھلا ایسا موقع جس کے ہاتھ آئے وہ اسے چھوڑ دے۔ حسینؑ آپ کے پاس پہلو میں آ گئے ہیں۔ اگر آج وہ چلے گئے اور انھوں نے آپ کی اطاعت اختیار نہ کی تو پھر یاد رکھیے کہ قوت و عزت ان ہی کا حق ہو گا اور کمزوری و عاجزی آپ کا حصہ۔ میری رائے میں ان کی یہ خواہش کبھی منظور نہ کرنا چاہیے کیونکہ یہ بڑی ذلت کی بات اور کمزوری کی نشانی ہے۔ بیشک انھیں غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دینا اور آپ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا چاہیے۔ پھر اگر آپ انھیں ان کے جرم کی سزا میں قتل کرنا چاہیں تو آپ کو حق اس کا ہے اور اگر معاف کر دیں تو اس کا بھی اختیار ہے۔ رہ گیا عمر سعد اس کا کیا ذکر، میں نے تو سنا ہے کہ پوری پوری راتیں وہ حسینؑ کے ساتھ باتوں میں گزار دیتا ہے" ۳؎

یہ خوشامد آمیز، غیرت انگیز، مفسدہ پرداز اور فتنہ پرور تقریر وہ تھی جس سے ایک طرف تو تفوق طلبی اور ظفر انجامی کے جذبہ میں حرکت پیدا ہوئی۔ دوسری طرف انانیت، غرور اور خود بینی کی رگ میں جنبش ہوئی اور تیسری طرف ابن سعد کی طرف سے بدگمانی ہو گئی اور وہ خلوص اور خیرخواہی کا قرینہ جو اس کی تحریر میں پایا جاتا تھا نیست و نابود ہو گیا۔ شمر بڑا خیرخواہ دوست اور سچا مشیر کار شمار کیا جانے لگا اور عمر سعد پر غصہ آنے لگا کہ وہ لڑنے گیا تھا اور رات رات بھر بیٹھ کر دشمن سے باتیں کرتا ہے، حسینؑ سے مل گیا ہے اور ہم کو خواہ مخواہ دھوکا دیتا ہے۔ پھر ایسے

۱؎ طبری ج ۶ ص۲۳۵-۲۳۶ - ارشاد ص۲۴۱ ۲؎ شمر کا اصلی نام تھا شرحبیل بن عمرو بن معاویہ۔ وہ بنی عامر بن صعصعہ میں آلِ وحید کلابی میں سے تھا (الاخبار الطوال ص۳۳۲ - ۲۵۴) ۳؎ طبری ج ۶ ص۲۳۶

مشتبہ شخص کا سردارِ لشکر باقی رکھنا کیا؟ یقیناً شمر کو بھیجا جائے تاکہ ابن سعد کے طرزِ عمل کا تدارک اور حسینؑ کے ساتھ ہر قسم کی مصالحانہ گفتگو کا سدِّ باب کر سکے۔ چنانچہ ابن زیاد نے اسی دماغی الجھن کے عالم میں عمر سعد کے نام خط لکھا: "میں نے تم کو حسینؑ کی جانب اس لیے نہیں بھیجا ہے کہ تم ان کے ساتھ مراعات کرو یا ان کے ساتھ معاملات کو طول دو یا ان کو زندگی کی امیدیں دلاؤ یا میرے پاس ان کی سفارش کرنے بیٹھو، دیکھو اگر حسینؑ اور ان کے اصحاب میرے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں اور اپنے کو میرے رحم و کرم پر چھوڑ دیں تو ان کو خاموشی کے ساتھ میرے پاس بھیج دو اور اگر وہ انکار کریں تو ان پر حملہ کر دو ۱؎ انھیں قتل کر دو اور ان کے اعضا و جوارح کو قطع کر دو کیونکہ وہ اسی کے مستحق ہیں۔" اتنا ہی نہیں بلکہ اسلام کے نام کو بدنام، انسانیت کی پیشانی کو عرق انفعال سے تر اور تاریخ کو ہمیشہ کے لیے انگشت بدنداں کرنے والے یہ الفاظ تھے جو کسی اور کی نسبت نہیں رسولِ اسلامؐ کے سب سے پیارے راستباز نواسے حسینؑ کی نسبت لکھے جا رہے تھے کہ اگر حسینؑ قتل ہو جائیں تو اُن کے سینہ اور پُشت کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال کرانا کیونکہ وہ سلطنت کے باغی، مخالف اور حریف ہیں میرا مقصد نہیں ہے کہ اس سے موت کے بعد ان کو کوئی نقصان پہنچے گا۔ لیکن یہ زبان سے کہہ چکا ہوں کہ اگر حسینؑ قتل کیا تو ان کے ساتھ یہ سلوک کروں گا۔ اگر تم نے ان احکام کا اجراء کیا تو خیر تمھیں معاوضہ ملیگا ایک وفادار فرماں بردار کو ملنا چاہیے اور اگر تمھیں یہ منظور نہ ہو تو لشکر کی سرداری سے علیحدہ ہو جاؤ اور اس منصب کو شمر کے سپرد کر دو، جسے ہم نے پورے طور سے مناسب ہدایتیں کر دی ہیں" اس نے یہ خط شمر کے سپرد کیا اور زبانی بھی اس سے کہہ دیا کہ اگر عمر سعد اس حکم کی تعمیل نہ کرے تو وہ معزول تصور ہو گا اور تم اس کی جگہ سردارِ لشکر قرار پاؤ گے۔ تم حسینؑ سے جنگ کرنا اور عمر سعد کو قتل کر کے اس کا سر میرے پاس بھیج دینا ۲؎

یہ تعجیلی اور تنبیہی حکم نامہ شمر کے ہاتھ عمر سعد کے پاس بھیج دیا گیا۔ اب جنگ کا التواء غیر ممکن سا تھا۔ خود عمر سعد کو اس کا خوب اندازہ تھا کہ حسینؑ یزید کی بیعت یا ابن زیاد کی غیر مشروط اطاعت

۱؎ الاخبار الطوال ص۲۵۳ ۲؎ طبری ج ۶ ص۲۳۶، ارشاد ص۲۴۱، ۲۴۲

پرہرگز آمادہ نہ ہوں گے اس لیے جُونہی اسے ابن زیاد کا خط شمر کے ہاتھ پہنچا اور اس نے کھول کر اسے پڑھا فوراً شمر سے کہنے لگا "کم بخت یہ تو نے کیا کیا؟ خدا تجھ سے سمجھے، خدا تجھے غارت کرے اور اس پیغام کو غارت کرے جو تو میرے پاس لایا ہے۔ بخدا میں سمجھتا ہوں کہ تو نے ہی ابن زیاد کو میرے مشورہ پر عمل کرنے سے روک دیا اور اس بات کو بگاڑ دیا جس کے بن جانے کی امید تھی۔ خدا کی قسم حسینؑ کبھی اپنے کو ابن زیاد کے رحم و کرم پر چھوڑنا پسند نہ کریں گے۔ یقیناً حسینؑ اپنے باپ کا دل اپنے سینے میں رکھتے ہیں[1]۔" شمر نے کہا "ان باتوں کو جانے دو۔ یہ بتاؤ کہ اب کیا کرو گے؟ اپنے امیر کے حکم پر عمل یا سرداری کو میرے سپرد کرو گے؟"

کمزور دل اور دنیا پر جان دینے والا عمر سعد اپنی تمام قلبی کیفیتوں اور ضمیر کی ہدایتوں کو اُس وقت بھول جاتا تھا جب دنیا کے وقتی اعزاز اور جاہ و ثروت کے اس کے ہاتھ سے جانے کا سوال پیش ہوتا تھا اور اس طرح وہ دنیا کے عشق میں اپنی تمام وجدانی کیفیتوں کے پامال کر دینے پر اس حد تک تیار ہو جاتا تھا کہ اس کے ذیل میں اس کو بڑے سے بڑے جرم کا ارتکاب بھی گوارا ہو جاتا تھا۔ خطرہ بالکل قریب اور اس کا رقیب سرداری شمر سامنے موجود تھا اور صرف ایک ہاں یا نہیں کا جواب وہ تھا کہ جس پر تمام اُس کی آئندہ زندگی کا دارومدار تھا۔ جس میں فقط سرداری رہنے یا نہ رہنے کا سوال ہی نہ تھا بلکہ ابن زیاد کے صریحی حکم کے مطابق جان جانے کا اندیشہ بھی تھا ہی کے لیے تو ویسے ہی [illegible] حق کے فداکاروں میں ہوا کرتا ہے کہ عمر سعد [illegible] شمر کے اس سوال پر اسے کہہ دینا پڑا کہ نہیں میں ہی اس مہم کو سر کروں گا[2]۔ ہاں تمھیں پیادوں کا افسر بنائے دیتا ہوں۔ اس کے بعد سے شمر کا وجود اس کے لیے سوہانِ روح ثابت ہو رہا تھا۔ ابن زیاد کی بدگمانی اس کی نسبت ظاہر ہو چکی تھی لہٰذا اسے اپنی وفاداری اور خیرخواہی کا ثبوت فراہم کرنا تھا۔ اس لیے جنگ میں ذرا بھی تاخیر اس کے نزدیک مناسب نہ تھی۔

[1] ارشاد ص ۲۴۲ [2] الاخبار الطوال ص ۲۵۳ [3] طبری ج ۶ ص ۲۳۶ - ۲۳۷

چنانچہ اس نے اسی وقت حملہ کی تیاری کا حکم جاری کر دیا اور روز پنجشنبہ نویں تاریخ کی شام ہونے نہیں پائی تھی کہ امام حسینؑ پر حملہ کر دیا گیا۔ یہ حملہ بالکل بغیر اطلاع تھا۔ امام حسینؑ عصر کی نماز کے بعد خیمہ کے دروازے پر تلوار کا سہارا لیے گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھے تھے اور آپ کی آنکھ لگ گئی تھی کہ ایک مرتبہ گھوڑوں کی ٹاپوں اور فوج کے غل کی آواز جناب زینبؑ کے کان میں گئی۔ آپ گھبرا کر پردے کے پاس آئیں اور امام حسینؑ کو مخاطب کیا کہ دیکھیے فوج دشمن کی آوازیں بہت نزدیک سے آ رہی ہیں۔ آپ نے سر اٹھایا اور فرمایا میں نے ابھی خواب میں دیکھا رسول اللہؐ کو، حضرت نے مجھ سے فرمایا کہ تم عنقریب ہمارے پاس آیا چاہتے ہو۔ ادھر اچانک دشمنوں کے حملہ سے زینبؑ کا دل پریشان تھا ہی۔ ادھر جو امام نے یہ خواب بیان کیا تو جناب زینبؑ مضطرب ہو گئیں۔ دونوں ہاتھوں سے منہ پیٹ لیا اور کہا "ارے یہ غضب!" امام نے بہن کو تسکین دی۔ فرمایا "اے بہن غضب تمھارے دشمنوں کے لیے، خاموش رہو۔ خدا مالک ہے۔" ابھی یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ ابوالفضل العباس نے آ کر اطلاع دی کہ فوج اعداء نے چڑھائی کر دی ہے۔ حضرت یہ سنکر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ عباس سوار ہو جاؤ اور ان سے پوچھو کہ اس وقت حملہ کا سبب کیا ہے؟ جناب عباس بیس سواروں کے ساتھ تشریف لے گئے اور آپ نے فوج مخالف سے خطاب کرتے ہوئے دریافت کیا کہ تمھاری رائے میں کیوں تبدیلی ہوئی اور اب تم کیا چاہتے ہو؟ جواب ملا کہ "امیر ابن زیاد کا حکم آیا ہے کہ تم لوگوں سے امیر کی اطاعت قبول کرنے کا مطالبہ کیا جائے اور نہیں تو پھر جنگ شروع کر دی جائے۔" آپ نے فرمایا کہ اچھا پھر جلدی نہ کرو۔ میں امام کے پاس جا کر تمھارا مطالبہ پیش کرتا ہوں۔ اس کے بعد جیسا کچھ امام فرمائیں گے اس سے تم کو مطلع کر دوں گا۔ جناب عباس گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے امام حسینؑ کی خدمت میں واپس گئے اور آپ کو واقعہ کی اطلاع دی[1]۔ حضرت نے فرمایا اگر ممکن ہو تو آج کی شب کی ان سے مہلت حاصل کر لو تاکہ

[1] طبری ج ۶ ص ۲۳۸

آج رات بھر ہم عبادت الٰہی اور دعا و استغفار میں بسر کرلیں۔ اللہ ہی واقف ہے کہ میں اُس کی نماز و عبادت، تلاوتِ قرآن اور دعا و استغفار سے کتنی محبت رکھتا ہوں[۱] ادھر اس دوران میں حبیب بن مظاہر اور زہیر بن قین فوجِ مخالف سے گفتگو اور حضرت امام حسینؑ پر بلا وجہ ظلم وستم کرنے پر اُن کو قائل معقول کرتے رہے یہاں تک کہ جناب عباس واپس آئے اور امام کے ارشاد کے مطابق ان سے ایک رات کی مہلت طلب کی[۲] عمر سعد گزشتہ واقعات کی بنا پر شمر کی موجودگی کو اپنے لیئے انتہائی خطرناک سمجھتا تھا۔ اس لیے اب وہ امام حسینؑ کے متعلق خواہ مخواہ بھی تشدد سے کام لینا چاہتا تھا۔ لہٰذا وہ شمر کی طرف متوجہ ہُوا اور کہا، تمھاری اس بارے میں کیا رائے ہے؟ شمر نے جواب دیا کہ جیسا آپ مناسب سمجھیں۔ اس لیے کہ آپ افسر ہیں اور آپ کی رائے معتبر ہے۔

عمر سعد نے سمجھ لیا کہ شمر کا یہ جواب طنزیہ انداز کا حامل ہے، اس نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ مہلت نہ دی جائے۔" مگر چونکہ دراصل اس کا ضمیر اس کے خلاف تھا اس لیے اب وہ متوجہ ہُوا دوسرے سرداروں کی طرف اور ان سے دریافت کیا کہ کیوں تمھاری کیا رائے ہے۔ عمرو بن حجاج زبیدی، ہانی بن عروہ کے برادرِ نسبتی نے جو اُن کے قتل کی خبر سنکر فوج لے کے دارالامارہ پر چڑھ دوڑا تھا، کہا۔ "سبحان اللہ! اگر یہ لوگ قبیلۂ ترک و دیلم سے بھی ہوتے اور اتنی مراعات کے طالب ہوتے تو تمھیں ان کے ساتھ یہ مراعات لازم تھی"۔ قیس بن اشعث نے بھی یہی مشورہ دیا کہ مہلت دینی چاہیے[۳] حضرت عباس کے ضبط و صبر کا بےنظیر نمونہ تھا کہ یہ تمام گفتگوئیں آپس میں ہوتی رہیں اور آپ خاموش نتیجہ کے منتظر کھڑے رہے۔ آخر کو مہلت کا مسئلہ طے پایا اور جناب عباس واپس ہوئے۔ اس طرح کہ آپ کے ساتھ عمر سعد کی طرف کا ایک نمائندہ بھی تھا اور اس نے آکر کہا کہ ہم آپ کو کل تک کی مہلت دیتے ہیں۔ اگر کل آپ نے ہتھیار ڈال دیے تو ہم آپکو اپنے امیر عبیداللہ بن زیاد کے پاس بھیج دیں گے اور اگر آپ نے انکار کیا تو پھر جنگ یقینی ہوگی[۴]

---

[۱] طبری ج ۶ ص ۲۳۶-۲۳۸ - ارشاد ص ۲۴۲-۲۴۳ [۲] طبری ج ۶ ص ۲۳۵ [۳] طبری ج ۶ ص ۲۳۸ - ارشاد ص ۱۴۳

پچیسواں باب

شبِ عاشور یعنی محرّم کی دسویں رات

کوشش کے ساتھ اس رات کی مہلت اس لیے نہیں لی گئی تھی کہ جنگ کی کوئی خاص تیاری کرلی جائے، نہ یہ کہ کہیں سے کسی امداد کے آنے کی کل تک امید ہو اور نہ یہ کہ امام چاہتے تھے کہ اپنے اہل بیت اور پسماندگان کو آئندہ کے لیے کچھ وصیتیں فرمادیں اور انھیں آئندہ کے لیے تیار کردیں یا اپنے بعد ان کی حفاظت کا کوئی سامان کرنا منظور تھا۔ ان میں سے کوئی بات نہ تھی۔ بلکہ ایک تو مقصد اس مہلت کا وہی تھا جو خود آپ نے جناب عباس سے ظاہر فرمادیا تھا۔ اس وقت جب انھیں مہلت لینے کے لیے بھیجا ہے وہ یہ تھا کہ ہم آج کی رات اپنے پروردگار کی خوب عبادت کرلیں اور دعا و استغفار میں مصروف رہیں۔ چنانچہ آپ نے اور آپ کے اصحاب نے تمام شب اس عالم میں گزاری کہ وہ مسلسل نماز اور دعا اور دعا اور استغفار اور بارگاہِ الٰہی میں تضرع و زاری میں مصروف تھے[۱]

دوسری بڑی مصلحت اس ایک شب کی مہلت میں یہ مضمر تھی کہ آپ خطرہ کے یقینی ہونے کے بعد اپنے ساتھیوں کو اپنی اپنی طبیعتوں کے تول لینے کا موقع دینا چاہتے تھے اور ایک بار اور یہ کہہ دینا چاہتے تھے کہ جو آپ کا ساتھ چھوڑ کر جانا چاہتا ہو وہ چلا جائے۔ تاکہ عین موقع پر کوئی ایک متنفس بھی ایسا باقی نہ رہنے پائے جو خطرہ کے ہنگامی ہونے کی وجہ سے بادلِ ناخواستہ آپ کا ساتھ دینے پر مجبور ہُوا ہو۔ چنانچہ آپ نے شام ہوتے ہوتے اپنے ساتھیوں کو مجتمع کرکے یہ خطبہ ارشاد فرمایا: ـ

---

[۱] طبری ج ۶ ص ۲۴۰

"تمام تعریفیں خدا کے لیے ہیں۔ راحت و تکلیف ہر حال میں اس کا شکر ہے۔ بارالٰہا تیرا شکر ہے کہ تو نے ہم کو نبوّت کی عزت عطا کی۔ قرآن کا علم دیا۔ دینی معلومات کا خزانہ مرحمت فرمایا اور ہمیں گوشِ شنوا، چشمِ بینا اور دلِ دانا کی نعمتوں سے مالا مال کیا۔"

اس کے بعد حضرت نے فرمایا "معلوم ہونا چاہیے کہ میں دنیا میں کسی کے ساتھیوں کو اپنے ساتھیوں سے زیادہ باوفا اور ان سے بہتر نہیں جانتا اور نہ اپنے اعزا سے زیادہ نیکوکار اور ادائے حق کرنے والے اعزا کسی کے مجھے معلوم ہیں۔ خدا تم سب کو میری طرف سے جزائے خیر دے۔ آگاہ ہو کہ دشمن کل ضرور جنگ کرے گا۔ میں بخوشی اجازت دیتا ہوں کہ جہاں تمھارا جی چاہے چلے جاؤ۔ میں بیعت کی ذمہ داری تم سے ہٹاتا ہوں۔ رات کا پردہ پڑا چاہتا ہے اسی کو اپنا مرکب بنا کر روانہ ہو جاؤ۔ تم ہی کو میں جانے کے لیے نہیں کہتا بلکہ ہر ایک تم میں سے میرے عزیزوں میں سے بھی ایک ایک شخص کا ہاتھ پکڑ لے اور اپنے ساتھ لیتا جائے۔ اس لیے کہ یہ لوگ صرف میرے طالب ہیں، اگر مجھے قتل کر ڈالیں تو پھر کسی دوسرے کی طرف متوجہ نہیں ہوں گے[1]۔"

اس تقریر کو سن کر سب سے پہلے حضرت ابوالفضل العباس کھڑے ہوئے اور کہا "کس لیے ہم ایسا کریں؟ کیا اس لیے کہ آپ کے بعد ہم زندہ رہیں؟ ہرگز نہیں، خدا ہم کو یہ روزِ بد نصیب نہ کرے۔" دوسرے تمام اعزا بھی حضرت عباس کے ساتھ ہم آواز ہوئے اور متفق اللہجہ ہو کر یہی الفاظ زبان پر جاری کیے جس کے بعد امام نے خاص طور سے اولادِ عقیل کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ "تمھارے لیے تو مسلم کا قتل ہو چکنا بہت کافی ہے۔ تم چلے جاؤ، میں تمھیں اجازت دیتا ہوں۔" ان سب نے متفق اللہجہ ہو کر کہا "ہم ایسا نہیں کریں گے۔ آپ کے بعد زندہ رہنے کا کوئی مزہ نہیں۔"

اس کے بعد اصحاب میں سے مسلم بن عوسجہ کھڑے ہوئے، کہا کہ "ہم آپ کو چھوڑ دیں؟ یہ نہیں ہو سکتا

[1] ارشاد ص۲۴۳-۲۴۴ - طبری ج ۶ ص۲۳۸

خدا کی قسم میں ان دشمنوں سے نیزہ کے ساتھ جنگ کروں گا۔ یہاں تک کہ میرا نیزہ ان کے سینوں میں ٹوٹ جائے اور تلوار چلاؤں گا جب تک کہ اس کا قبضہ میرے ہاتھ میں ٹھہر سکے اور میں آپ سے کسی طرح جدا نہ ہونگا۔ اگر ہتھیار نہ ہوں گے کہ جن سے جنگ کروں تو میں انھیں پتھر ماروں گا اور آپکی حمایت کروں گا یہاں تک کہ آپ کے قدموں پر اس جان کو نثار کر دوں۔" اس کے بعد سعید بن عبداللہ حنفی نے کہا "بخدا ہم آپ کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے جب تک کہ خدا کی بارگاہ میں یہ ثابت نہ کر لیں کہ ہم نے رسالتمآبؐ کے غائبانہ حق کو آپ کے بارے میں ادا کر دیا۔ بخدا اگر مجھے یہ معلوم ہو کہ میں قتل ہونگا پھر زندہ کیا جاؤں گا، پھر جیتے جی جلا دیا جاؤنگا، پھر میری خاک ہوا میں منتشر کی جائے گی اور ایسا ہی میرے ساتھ ستّر مرتبہ ہوگا تب بھی میں آپ کا ساتھ نہ چھوڑوں گا جب تک کہ آخری مرتبہ بھی آپ کے قدموں پر موت نہ آجائے۔ چہ جائیکہ یہ تو ایک مرتبہ کا قتل ہونا ہے اور اس کے بعد وہ دائمی عزت ہے جو کبھی ختم ہونے والی نہیں۔" زہیر بن قین نے کہا "بخدا میری تو آرزو یہ ہے کہ میں قتل کیا جاؤں، پھر زندہ ہوں اور پھر قتل کیا جاؤں۔ ایسا ہی ہزار مرتبہ ہو مگر کسی طرح آپ سے اور آپ کے خاندان کے نوجوانوں سے یہ مصیبت دفع ہو جائے۔" دیگر اصحاب نے بھی ملتے جلتے الفاظ میں اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا اور سب کا متفق اللہجہ مطلب یہی تھا کہ یہ غیر ممکن ہے کہ ہم آپ سے جدا ہو جائیں بلکہ اپنی جانیں آپ پر فدا کر دیں گے۔ ہاں جب ہم مر جائیں تو پھر چاہے جو ہو ہم تو اپنا فرض ادا کر چکے ہوں گے[1]۔ امام نے دعائے خیر دی اور اپنے خیمہ میں واپس تشریف لے گئے[2]۔

یہ تھا مجاہدِ کربلا کی حقانیت کا ایک بے مثال مظاہرہ۔ آپ زورِ تقریر سے جوش و خروش پیدا کرنے والے بیانات اور خوش آیند و دلفریب توقعات سے اپنے ساتھ والوں کو ساتھ رکھنا نہیں چاہ رہے تھے بلکہ ان کے سامنے حقیقتِ حال کو واضح کر کے غلط فہمیوں کو دور کر رہے تھے۔ یہ کوشش شبِ عاشور ہی تک نہیں رہی بلکہ اس کا آپ کی جانب سے مظاہرہ روزِ عاشور بھی ہوا۔ اس طرح کہ جب بشیر بن عمر حضرمی کو جو انصارِ امام میں سے ایک تھے یہ خبر پہنچی کہ ان کا فرزند

[1] طبری ج ۶ ص۲۳۹   [2] ارشاد ص۲۴۴

عمر د رے کی سرحد پر قید ہوگیا ہے انھوں نے کہا کہ خدا پر چھوڑتا ہوں اس کو بھی اور اپنے آپ کو بھی۔ بیشک اگر مجھے زندہ رہنا ہوتا تو یہ پسند نہ کرتا کہ وہ قید میں رہے۔" امام کو اس کی خبر ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ تم میری بیعت سے آزاد ہو، جاؤ اور اپنے فرزند کی رہائی کی فکر کرو۔ وفادار مجاہد نے جواب دیا کہ "مجھے جیتے جی درندے کھا جائیں اگر میں آپ سے جدا ہوں، یہ بھلا کیونکر ہو سکتا ہے۔" حضرت نے فرمایا۔ "اچھا اپنے فرزند محمد کو بھیجدو اور یہ کپڑے اس کو دے دو کہ ان کی قیمت سے اپنے بھائی کی رہائی کا سامان کر سکے۔" آپ نے پانچ کپڑے مرحمت کیے جن کی قیمت ہزار اشرفی کے قریب تھی۔ اس کے بعد جتنے جان نثار امام کے ساتھ رہ گئے تھے وہ وہی ہو سکتے تھے جو موت کو اپنے لیے یقینی سمجھتے ہوئے دل و جان سے مقصدِ حسینؑ کی حمایت کے لیے آمادہ تھے اور ان کے کردار میں کمزوری کے شائبہ کا امکان بھی نہ تھا۔

تیسری مصلحت اس ایک رات کی مہلت میں یہ ہو سکتی تھی کہ آپ دشمن کو ایک موقع اور اپنے کردار کے جائزہ لینے کا دینا چاہتے تھے تاکہ اگر کسی میں صلاحیت راہِ راست پر آنے کی ہو تو وہ آجائے۔ چنانچہ عمر سعد کی فوج کا ایک بڑا افسر حُر بن یزید ریاحی جو سب سے پہلے حسینؑ کو گھیر کر کربلا میں لانے کا ذمہ دار تھا اپنے ضمیر کی ہدایت کی بنا پر فوج مخالف سے علیحدہ ہو کر اصحابِ حسینؑ میں داخل ہو گیا اور اس نے بھی آپ کی نصرت میں اپنی جان دی۔ اسی طرح اور بھی چند سپاہی نصرتِ باطل چھوڑ کر نصرتِ حق پر آمادہ ہو گئے۔

حقیقت میں ایک داعی حق کی بڑی کامیابی یہی قرار پا سکتی ہے کہ وہ کسی ایک متنفس کو ہی سہی حقیقی معنی میں راہِ ہدایت دکھا سکے اور حضرت امام حسینؑ کی یہ ایک بڑی کامیابی اس رات کی مہلت کا نتیجہ تھی جو آپ نے دشمن سے مانگ کر حاصل کی تھی۔

گزشتہ خطبہ کے بعد تمام رات امام اور اصحابِ امام نے عبادت خالق میں بسر کی۔ اس کے ساتھ آپ نے جنگ کے ہنگام کے لیے امکانی حد تک تحفظی تدابیر بھی کیے۔ آپ نے اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ وہ خیموں کو بالکل ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیں اور ہر خیمہ کی

طناب کو دوسرے خیمہ کے ساتھ باندھ دیں[1]

اس کے علاوہ آپ نے پشت کی جانب ایک ایسے نشیب کو جو ایک نالی کی طرح سے تھا کھدوا کر خندق تیار کرا دی اور اس میں لکڑیاں جمع کرا دیں کہ جب ان میں آگ دی جائے تو اس طرف سے دشمن کے حملہ کا اندیشہ نہ رہے۔

یہ تیاریاں شب عاشور مکمل ہو گئیں اور صبح کو اس خندق میں آگ روشن کر دی گئی اس طرح فوج دشمن کو بالکل گھیر کر چاروں طرف سے حملہ کرنے کا موقع باقی نہ رہا۔

---

[1] ارشاد ص ۲۴۵

چھبیسواں باب

دسویں محرّم ۶۱ھ

اتمامِ حجّت اور آغازِ حرب

عاشور کی رات اپنی تمام کیفیتوں سمیت ختم ہوئی۔ یقین کرنا چاہیے کہ اس شب کربلا کے میدان میں کسی کی آنکھ لگنے نہ پائی ہوگی۔ اس طرف عبادت خدا اشتیاقِ شہادت، بی بیوں میں بے تابی بچوں میں پریشانی اور سب سے بڑھ کر پیاس کا غلبہ اور اس طرف جنگ کی تیاری، اسلحہ کی درستی تدابیرِ جنگ کے متعلق مشورے اور اپنے ظالمانہ ارادوں کی تکمیل کے لیے صبح کا انتظار۔

بہرحال رات ختم ہوئی اور سپیدۂ سحری نمودار ہوا۔ حضرت امام حسینؑ نے اصحاب واقرباؑ کے ساتھ نمازِ صبح بجماعت ادا کی، وہ نماز جس کے تعقیبات میں کربلا کا جہاد تھا۔

عام انسانی دل وجگر کے معیار کو پیش نگاہ رکھتے ہوئے ظاہر بیں افراد خیال کر سکتے ہیں کہ اس وقت اصحابِ حسینؑ پر عجیب ہراس کا عالم طاری ہوگا۔ سامنے نظر جاتی ہوگی تو ان کو دشمن کی فوج کا عظیم سمندر موجیں لیتا ہوا نظر آتا ہوگا اور اپنی ہستی اس میں حباب کی سی نظر آرہی ہوگی مگر نہیں حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔ ان کے دل اطمینان سے معمور تھے۔ ان کے سینوں میں خوشی اور مسرت کی لہریں تھیں اور ان کے چہروں پر فرحت وانبساط کی سرخی تھی۔ وہ جیسے کبھی خوش نہیں تھے ویسے آج خوش نظر آرہے تھے جیسی پرمذاق باتیں کبھی نہ کرتے تھے ویسی آج کر رہے تھے۔

چنانچہ عبدالرحمٰن بن عبد ربّہ انصاری اور بریر بن خضیر ہمدانی کا واقعہ ہے کہ بریر نے عبدالرحمٰن ... ... عبدالرحمٰن نے کہا "چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے"

بریر نے جواب دیا کہ "خدا کی قسم میرے قوم وقبیلہ والے اچھی طرح واقف ہیں کہ مجھے جوانی سے لیکر اس عمر تک کبھی مذاق سے دلچسپی نہیں رہی۔ مگر میرا دل اس وقت مستقبل کے تصوّر سے محفوظ ہو رہا ہے۔ خدا کی قسم ہمارے اور سعادتِ ابدی کے درمیان بس اب اتنا فاصلہ ہے کہ یہ دشمنان دین تلواریں لے کر ہم پر ٹوٹ پڑیں اور مجھے تو تمنا ہے کہ کسی طرح وہ وقت جلد آئے کہ ان کی تلواریں ہم پر پڑنے لگیں"۔[1]

بے شک یہ حقانیت پر اعتماد اور اخروی کامیابی کے کامل یقین ہی کا نتیجہ ہوسکتا ہے۔ یہی چیز کمزور دل میں طاقت پیدا کرتی اور مایوسیوں کی ظلمت میں امید کی شمع روشن کرتی ہے۔

اتنی دیر میں فوج مخالف میدانِ جنگ میں آگئی، پرے جمائے گئے اور لشکر کی ترتیب ہوئی میمنہ پر عمرو بن حجاج زبیدی، میسرہ پر شمر بن ذی الجوشن، سواروں کا سردار عزرہ بن قیس احمسی اور پیادوں کا افسر شبث بن ربعی یربوعی اور علم عمر سعد نے اپنے غلام درید کے سپرد کیا۔[2]

امام حسینؑ بھی میدانِ جہاد میں آگئے۔ یقیناً تاریخ ایک ایسے سپہ سالار کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے جس نے ایسی چھوٹی سی جماعت کو کم از کم بیس تیس ہزار فوج کے مقابلہ میں جنگ کے لیے کھڑا کیا ہو۔

ایک تاریخی صراحت کے مطابق یہ بتیس سوار اور چالیس پیادوں سے زیادہ نہیں تھے[3] اور اسی لیے شہدائے کربلا کے لیے بہتّر کی لفظ زبان زدِ خلائق ہے۔

مگر کربلا کے حالاتِ جنگ اور مجاہدین کے ناموں کی تفصیل اور دوسرے متعلقہ واقعات سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ تعداد سو سے زیادہ اور دو سو سے کم تھی۔[4] ممکن ہے کہ عام طور پر تاریخ میں جو تعداد درج اور عموماً زبان زدِ خلق ہے اور جو اس کتاب میں بھی بعض جگہ نظر آئیگی۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۱ [2] الاخبار الطوال ص ۲۵۴ طبری ج ۶ ص ۲۴۱ ارشاد ص ۲۴۶

[3] الاخبار الطوال ص ۲۵۴ طبری ج ۶ ص ۲۴۱، ارشاد ص ۲۴۶

[4] عمار دہنی کی روایت ابو جعفر سے اس کے مطابق ہے۔ اس میں ہے کہ جماعت حسینی ۴۵ سواروں اور سو پیادوں پر مشتمل تھی (طبری ج ۶ ص ۲۲۰)

ان جانبازوں کی جو فوجی انداز پر تربیت یافتہ تھے لیکن سلسلۂ جہاد میں بہت سے ایسے افراد بھی میدان میں آ گئے جو فوجی حیثیت سے سپاہی نہ سمجھے جا سکتے تھے۔

میدان جنگ میں آنے کے بعد پہلے امام نے اپنے ہاتھ درگاہِ احدیت میں بلند کیے اور یہ مناجات زبان پہ جاری کی۔ کیا نسبت دی جا سکتی ہے نبیٔ خدا حضرت عیسٰیؑ کی آواز کو جو بائبل (عہد جدید) کی نقل کے مطابق صلیب پر بلند ہوئی تھی۔ اس انداز سے کہ ایلی ایلی لما سبقتنی "اے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا" فرزندِ رسولؐ امام حسینؑ کی اس مناجات کے ساتھ جو اس سیلابِ مصیبت کے اندر آپ کے لبوں پہ جاری ہو رہی تھی۔

خداوندا! تو میرا سہارا ہے ہر تکلیف میں اور میرا قبلۂ امید ہے ہر سختی میں اور تجھ پہ مجھے ہر مہم میں جو درپیش ہو بھروسا ہے۔ کتنے ہی صدمے ایسے ہیں جن کے برداشت کرنے سے دل کمزور ثابت ہوتا ہے اور حیلہ و تدبیر کی راہیں بند نظر آتی ہیں۔ دوست ان میں ساتھ چھوڑ دیتے اور دشمن ان میں طعنہ زنی کرنے لگتے ہیں۔ میں ان کو تیرے حضور میں پیش کرتا اور تیری بارگاہ میں عرض معروض کرتا ہوں اس لیے کہ میں تجھے چھوڑ کر کسی اور سے لَو لگانا ہی نہیں جانتا تو اس تکلیف کو دور کرتا اور اس کا تدارک کرتا ہے۔ یقیناً تو ہی ہر نعمت کا مالک اور احسان کا مرکز اور ہر مطلب کے لیے آخری جائے پناہ ہے۔"[1]

اس کے بعد آپ نے اپنے چھوٹے سے لشکر کو ترتیب دیا۔ میمنہ پہ زہیر بن قین، میسرہ پہ حبیب بن مظاہر اور علمدار عباس بن علیؑ قرار دیے گئے۔[2]

چونکہ امام حسینؑ کی جدوجہد کا مقصد یہ تھا کہ دین و آئینِ شریعت کی حقانیت کو ظاہر کرتے ہوئے اپنے دشمن کی سیرت و کردار کے متعلق دنیا کے سامنے اس حقیقت کو ثابت کر دیں کہ اسے اسلام سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے اس کے لیے ضرورت تھی کہ ایک تو آپ کے کردار میں کوئی ایسا شائبہ بھی نہ آنے پائے جو آپ کے خلاف تشدد کے جواز کی دلیل بن سکے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۱ - ارشاد ص ۲۴۶ [2] طبری ج ۶ ص ۲۴۱، ارشاد ص ۲۴۶ - الاخبار الطوال ص ۲۵۳

اسی لیے آپ نے مصالحت کی گفتگوئیں کیں۔ ملک عرب کو چھوڑنے اور دربدری کی زندگی بسر کرنے پر آمادگی ظاہر کی اور اسبابِ اشتعال پیدا کیے جانے کے باوجود بھی اپنے ساتھیوں کو جنگ میں سبقت سے روک کے رکھا اور لڑائی کی مکمل تیاری ہو چکنے کے بعد بھی اپنی طرف سے پہل نہ ہونے دی چنانچہ صبح عاشور ابھی جب خیامِ امام کے ساتھ خندق میں آگ بھڑک رہی تھی تو ادھر کا ایک سوار سر سے پیر تک لوہے میں غرق اس طرف سے گزرا اور اس خندق کی آگ کو شعلہ ور دیکھ کر ایک انتہائی اشتعال انگیز جملہ کہا۔ معلوم ہوا کہ شمر بن ذی الجوشن ہے۔ مسلم بن عوسجہ نے امام سے عرض کیا کہ اجازت ہو تو اس کو تیر کا نشانہ بنا لوں کیونکہ یہ بڑا فاسق و فاجر شخص ہے اور اس وقت بالکل تیر کی زد پر ہے۔ حضرت نے فرمایا۔ "نہیں ایسا نہ کرو۔ میں جنگ میں پہل نہیں کرنا چاہتا۔"[1]

یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ایک تیر جو اس وقت کمان سے رہا ہو جاتا نوعیتِ جنگ کو تبدیل کر دیتا۔ امامؑ نے اس کا سختی کے ساتھ لحاظ رکھا۔

دوسرے اس کی ضرورت تھی کہ آپ کے خلاف دشمنوں کے طرزِ عمل میں تاویل کی کوئی گنجائش باقی نہ رہ جائے۔ سب سے بڑی تاویل کسی ناروا عمل کے متعلق اسکا بے خبری اور ناواقفیت پر محمول کیا جانا ہے۔ بنی امیہ نے اپنے حدودِ مملکت میں یہ پروپیگنڈا کیا تھا کہ پیغمبر اسلامؐ نے اپنے بعد کوئی اولاد نہیں چھوڑی اور ہم ان کے وارث جائز ہیں۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ امام حسینؑ اپنے نام و نسب اور خاندانی خصوصیات نیز اپنے بارے میں اسلامی روایات کو فوج مخالف پر اس طرح واضح کر دیں کہ ان میں سے کسی ایک فرد کے لیے بھی ناواقفیت کے عذر کی گنجائش باقی نہ رہ جائے اور آپ کے خلاف جو ظلم ہو رہا ہے اس کے جرم کی اہمیت ہر ایک پہ بالکل روشن ہو جائے۔ ان میں سے ہر ایک نہ خود اپنے نفس کو دھوکا دے سکے اور نہ دوسروں کو ان کی نسبت کسی "تاویل" یا "حمل بر صحت" کا راستہ مل سکے۔ امام حسینؑ دیکھ چکے تھے کہ ان سے پہلے ان کے والد حضرت علیؑ کا مقابلہ کیا گیا اور اس مقابلہ کو "خطائے اجتہادی" کا پردہ ڈال کر قابلِ معافی سمجھ

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۲

لیا گیا۔ حسینؑ کے خلاف تلوار اٹھانے والوں کے عمل میں اگر کہیں سے اس طرح کی گنجائش ہوتی تو سادہ لوح افراد یا ہوا خواہان بنی امیہ اس سے فائدہ اٹھانے سے چوکتے تھوڑے ہی اور اس سے مقصد اور مفاد دینی کو سخت نقصان پہنچ جاتا۔ اس سے تحفظ کے لیے امام حسینؑ نے وہ سب کچھ کیا جسے "اتمامِ حجت" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس کے بعد دشمن کے "اصرارِ گناہ" یا باطل پر ضد کی حیثیت اتنی نمایاں ہو گئی کہ کسی تاویل یا حمایت کا موقع باقی نہ رہا۔

تاریخی بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ صبحِ عاشور دونوں طرف کی صف بندی ہو چکنے کے بعد کافی وقت تک آغازِ جنگ نہیں ہوا۔ اس کا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ دشمن اس کا موقع ڈھونڈ رہا تھا کہ کسی صورت سے حسینی جماعت کی طرف سے کوئی ایسا اقدام ہو جو بنائے جنگ بن سکے اور امام حسینؑ کا منشاء یہ تھا کہ میری طرف سے آغازِ جنگ ہونے نہ پائے بلکہ اس کے برخلاف آپ نے دشمن کو راہِ راست پر لانے کی پُرامن کوشش کر کے چاہا کہ اتمامِ حجت فرمائیں اس لیے آپ نے ناقہ طلب فرمایا اور اس پر سوار ہوئے۔ قرآن اپنے سامنے رکھا[1]

پھر صفوفِ دشمن کے قریب آ کر بلند آواز سے ارشاد فرمایا "اے گروہ مردم میری بات سنو جلدی سے کام نہ لو۔ یہاں تک کہ مجھ پر جو تمھارا حق ہے اس کے ماتحت تم کو نصیحت و ہدایت کا فرض ادا کر دوں اور تمھارے سامنے یہ حقیقتِ حال بیان کر دوں کہ میں تمھاری جانب کیوں آیا؟ اگر تم نے میرے بیان کو صحیح سمجھتے ہوئے تسلیم کر لیا اور میرے ساتھ انصاف سے کام لیا تو یہ تمھاری خوش قسمتی ہو گی اور تمھیں معلوم ہو گا کہ تمھیں میری مخالفت کی کوئی وجہ ہو ہی نہیں سکتی اور اگر تم نے میرے بیان کو قبول نہ کیا اور انصاف سے کام نہ لیا تو شوق سے مجتمع کر لو اپنی طاقتوں کو اور اکٹھا کر لو جن جن کو چاہو اپنے ہم خیالوں میں سے اور کوئی کوشش اٹھا نہ رکھو، پھر پوری طاقت سے بغیر ایک دم کی بھی مہلت دیے ہوئے میرا خاتمہ کر دو۔ میرے لیے وہ پروردگار کافی ہے۔ جس نے قرآن کو نازل کیا اور وہی اپنے نیک اعمال بندوں کا مددگار رہے" امام حسینؑ کی آواز خیمہ میں پہنچنا تھا

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۱

کہ اہلِ حرم میں گریہ و بکا کا شور بلند ہوا۔ حضرت نے عباسؑ و علی اکبرؑ کو بھیجا کہ انھیں خاموش کرو۔ رونے کا وقت بعد کو آئے گا۔ جب آوازِ گریہ کی موقوف ہو گئی تو حضرت نے حمدِ الٰہی ادا فرمائی اور خدا کے اوصاف ذکر فرمائے پھر جنابِ رسالتمآبؐ پر درود بھیجا اور آنحضرت کے اوصاف و فضائل دیر تک بیان فرماتے رہے۔ راوی کا بیان ہے کہ میں نے حسینؑ کے پہلے اور حسینؑ کے بعد کوئی متکلم نہیں دیکھا جو فصاحت و بلاغت میں آپ سے بڑھا ہوا ہو۔ حمد و صلوٰۃ ادا کرنے کے بعد حضرت نے فرمایا۔ "ذرا میرے نام و نسب پر غور کرو اور دیکھو تو میں کون ہوں پھر اپنے گریبانوں میں منہ ڈالو۔ غور کرو کہ تمھارے لیے میرے خون کا بہانا اور میری ہتکِ حرمت کرنا جائز ہے؟ کیا میں تمھارے نبیؐ کا نواسا نہیں ہوں اور ان کے وصی، ان کے چچا زاد بھائی اور ان پر سب سے پہلے ایمان لانے والے اور ان کی تصدیق کرنے والے کا فرزند؟ کیا حمزہ سید الشہداء میرے باپ کے چچا اور جعفر طیار خود میرے ہی چچا نہیں تھے؟ کیا یہ حدیث جو زبان زدِ خلائق ہے تمھارے گوش زد نہیں ہوئی کہ حضرت رسولِ خداؐ نے میرے اور میرے بھائی کے بارے میں فرمایا تھا کہ یہ دونوں جوانانِ اہلِ جنت کے سردار ہیں؟ اگر تم میری بات کو سچ سمجھتے ہو اور حقیقتاً وہ سچ ہی ہے، اس لیے کہ کبھی میں نے غلط بات نہیں کہی، پھر تو کوئی بات نہیں اور اگر تم میری بات کو غلط سمجھو تو اسلامی دنیا میں ابھی ہیں ایسے اشخاص جن سے اگر تم پوچھو تو وہ بتلا دیں گے۔ پوچھ لو جابر بن عبد اللہ انصاری سے، ابو سعید خدری سے، سہل بن سعد ساعدی سے، زید بن ارقم سے، انس بن مالک سے۔ وہ تمھیں بتائیں گے کہ انھوں نے رسالتمآبؐ سے اپنے کانوں سے اس حدیث کو سنا ہے۔ پھر کیا یہ تمھیں میری خونریزی سے روکنے کے لیے کافی نہیں ہے[1] اس موقع پر شمر آپ کا کلام قطع کرتے ہوئے بول اٹھا کہ "میں اللہ کی عبادت ایک حرف پر کرتا ہوں۔ اگر میری سمجھ میں آتا ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو" (قرآن میں منافقین کی نسبت آیا ہے ومن الناس من یعبد اللہ علیٰ حرف لہٰذا اس کا مقصود

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۲

تھا کہ میں مسلمان نہیں، منافق ہوں اگر کچھ سمجھتا ہوں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں)

اصحاب خاموش کھڑے ہوئے امام کی تقریر سن رہے تھے انھیں شمر کی یہ بدتمیزی اور حضرت کے خطبہ میں مداخلت سخت ناگوار ہوئی۔ حبیب بن مظاہر نے پکار کر جواب دیا۔ "بخدا میں جانتا ہوں کہ تو خدا کی عبادت ستر حرفوں پر کرتا ہے (یعنی انتہائی مکّار اور عبادت کے معاملہ میں فریبی ہے) اور میں گواہی اس کی بھی دیتا ہوں کہ تو سچ کہتا ہے تیری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت کیا کہہ رہے ہیں۔ خدا نے تیرے دل پر مہر لگا دی ہے۔" امام نے پھر سلسلۂ تقریر جاری فرمایا۔ اگر تمھیں اس حدیث کی صحت میں پھر بھی شک ہے تو کیا اس میں بھی شک ہے کہ میں تمھارے رسولؐ کا نواسا ہوں۔ خدا کی قسم مشرق و مغرب کے عالم میں کوئی بھی نبیؐ کا نواسا میرے سوا موجود نہیں ہے نہ تم میں اور نہ تمھارے سوا دوسرے اقوام میں اور میں تو خود تمھارے ہی نبیؐ کا نواسا ہوں۔ ذرا بتاؤ تو سہی کہ میرے قتل پر تم کس لیے آمادہ ہوئے ہو؟ کیا کسی اپنے مقتول کا قصاص لینا چاہتے ہو جسے میں نے قتل کر دیا ہو؟ یا کسی اپنے مال کا مطالبہ رکھتے ہو جسے میں نے تلف کیا ہو؟ یا کسی زخم کا بدلہ چاہتے ہو جو میرے ہاتھ سے کسی کو لگا ہو؟" ایک خاموشی سی چھائی رہی اور ان میں سے کسی سے کچھ جواب دیتے نہ بن پڑا۔[1] دیکھیے تو کہ ایک انسان ایک طرف اور ہزاروں زبانیں دوسری طرف۔ بے شک حق میں ایسی طاقت ہونا چاہیے اور ایک انسان اپنی سچائی اور حسنِ عمل پر اتنا اعتماد رکھتا ہو۔ حسینؑ اس وقت جبکہ اپنا کوئی گواہ نہ تھا اور مجمع دشمن تھا مجمع سے اپنی بے جرمی کا اقرار لے رہے تھے۔ تمام لشکر کو دعوت دی جا رہی تھی کہ کوئی شخص کسی جرم کا پتہ دے دے۔ ہوتا کوئی جرم کسی کی نگاہ میں تو اس تیس ہزار کے مجمع میں کوئی زبان کھولتا۔ کیا دنیا کی کوئی مادی طاقت زبانوں کو روکنے والی تھی؟ مگر معلوم ہوتا ہے کہ سچائی کی طاقت تھی جو ذہنوں پر قفل اور زبانوں پر گرہ لگائے ہوئے تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک یکہ و تنہا انسان ہزاروں آدمیوں کو مخاطب کر رہا تھا اور کسی کو اسکے خلاف زبان کشائی کی جرأت نہ تھی۔

[1] طبری ج ۶ ص۲۴۳۔ ارشاد ص۲۴۸

فوجِ مخالف کے سکوت کو ملاحظہ فرمانے کے بعد آپ نے نام بنام ان لوگوں کو پکارا جن کے اس خط پر دستخط موجود تھے اور یہ لوگ معمولی درجہ کے سپاہی بھی نہ تھے بلکہ ان میں سے ہر ایک کم از کم ہزار پانچسو آدمیوں کا سردار تھا۔ آپ نے فرمایا "اے شبث بن ربعی، اے حجار بن ابجر، اے قیس بن اشعث، اے یزید بن حارث کیا تم نے مجھے نہیں لکھا تھا کہ کھیتیاں لہلہا رہی ہیں، چشمے پانی سے چھلک رہے ہیں۔ آئیے لشکر آپ کی مدد کے لیے تیار ہیں۔"[1] اب معاملہ ان اشخاص کے لیے انتہائی نازک تھا۔ چار آدمیوں کی بابت نام لے لے کر یہ انکشاف کیا جا رہا تھا کہ انھوں نے بھی آپ کو خط بھیجا تھا۔ گویا یزیدی افواج اور ان کے سالار عمر سعد کے سامنے ان لوگوں کی سازش، دورنگی اور حکومت سے ایک طرح کی بغاوت کا ثبوت مہیا کیا جا رہا تھا حالانکہ وہ کوفہ کے سربرآوردہ اشخاص تھے اور ابن زیاد کی طرف سے بڑے بڑے معزز عہدوں پر فائز تھے۔ انھوں نے تو وہ خط جیسا پہلے بتایا جا چکا ہے محض سازشی انداز میں ہوا کے رخ کو دیکھ کر لکھا تھا۔ اس خیال سے کہ حسینؑ کے نام اتنی کثرت سے خطوط آ رہے ہیں اور بلایا جا رہا ہے۔ اگر کہیں حسینؑ آ گئے اور فضا ان کے موافق رہی تو ہمارے لیے بھی جگہ باقی رہنا چاہیے اس لیے انھوں نے یہ خط لکھا مگر اس وقت اتنے گواہوں کے سامنے ان کی سازش منکشف ہو رہی تھی اور اندیشہ تھا کہ واقعۂ کربلا کے بعد ابن زیاد کے ہاتھ سے ان لوگوں کا فیصلہ ہو جائے اور سلطنت بنی امیّہ کی جانب سے راندۂ درگاہ قرار پا جائیں اس لیے بربنائے ضرورت ان کو اس موقع پر بے غیرتی کے ساتھ بولنا ناگزیر تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی تحریروں سے انکار کیا اور کہا "ہم نے اس طرح کے خطوط نہیں لکھے تھے۔" امام نے فرمایا۔ "اللہ اکبر! اتنا کھلا ہوا حقیقت سے انکار! تم نے خط لکھا تھا اور ضرور لکھا تھا۔ اچھا اگر بالفرض محال نہیں بھی لکھا تھا اور تم لوگ میرا آنا حقیقتاً نہیں بھی چاہتے تھے تو مجھے واپس

[1] طبری ج ۶ ص۲۴۳، ارشاد ص۲۴۸

چلا جانے دو کسی ایسی جگہ جہاں میں امن و امان کی زندگی گزار سکوں۔"

قیس بن اشعث نے (جس کی بہن جعدہ بنت اشعث نے حکومت شام کے ساتھ سازش میں شریک ہو کر امام حسنؑ کو زہر دیا تھا اور جس کا بھائی محمد بن اشعث حضرت مسلم کے قتل کا ذمہ دار تھا) پکار کر کہا "آپ یزید کی بیعت کیوں نہیں کر لیتے؟" حضرت نے فرمایا "تم ایسا کیوں نہ کہو گے! تم محمد بن اشعث ہی کے تو بھائی ہو۔ کیا تم اتنے کو کافی نہیں سمجھتے کہ مسلم بن عقیل کے خون کی ذمہ داری تم پر ہے۔ خدا کی قسم میں ذلت کے ساتھ اپنا ہاتھ تمھارے ہاتھ میں نہ دوں گا۔ اور نہ غلاموں کی طرح خطرہ سے اپنی جان بچا کر بھاگوں گا۔" [1]

فوج مخالف کے متاثر ہونے کی پہلے ہی سے امید نہ تھی۔ اپنا فرض پورا کرنا تھا وہ پورا ہو گیا۔ حضرت نے ناقہ کو بٹھا دیا۔ اتر پڑے اور عقبہ بن سمعان کو حکم دیا کہ اسے باندھ دیں۔ چونکہ اصحاب حسینؑ آپ کے مقصد سے واقفیت حاصل کر چکے تھے اس لیے وہ بھی مسلک حسینی ہی کو پیش نظر رکھنے کی کوشش کرتے تھے اور افواج یزید کی اکثریت عوام اہل کوفہ کے ممتاز افراد کی تقریروں کا ان پر کافی اثر ہو سکتا تھا۔ پھر ان میں بھی حبیب بن مظاہر جو ہمیشہ سے شیعۂ علیؑ ہونے کی حیثیت سے مشہور تھے اور حضرت کو کوفہ کی جانب دعوت دینے والوں میں سے تھے۔ ہوا خواہان بنی امیہ کے لیے ان کی تقریر ایسی مؤثر نہ ہو سکتی تھی جیسی زہیر بن قین کی جو کہ ابھی قریبی زمانہ تک "عثمانی" گروہ میں شمار ہوتے تھے اور وہ مکہ اور کربلا کے راستے ہی میں امام کے پاس آ کر شریک ہوئے تھے اس لیے فوج مخالف کے سامنے سب سے زیادہ تقریریں انھوں نے کی ہیں جن کا ظاہری حیثیت سے اس وقت کوئی نتیجہ مرتب ہوا ہو یا نہیں۔ لیکن یہی نتیجہ کیا کم ہے کہ افواج مخالف پر ہر ممکن ذریعہ سے اتمام حجت ہو گیا۔ چنانچہ امام حسینؑ کے مذکورہ بالا خطبہ کے بعد زہیر بن قین گھوڑے پر سوار، سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق صف سے باہر نکلے۔ پکار کر کہا "کوفہ والو

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۳ - ارشاد ص ۲۴۴

کے عذاب سے ڈرو۔ ایک مسلمان کی گردن پر اس کے اسلامی بھائی کا یہ حق ہے کہ وہ اسے خیر خواہانہ نصیحت کرے اور ہم آپس میں بھائی بھائی اس وقت تک ہیں اور ایک ہی ملت کے تابع کی حیثیت رکھتے ہیں جب تک کہ ہمارے تمھارے درمیان تلوار چلنے نہیں لگی ہے یعنی جب تک باقاعدہ جنگ شروع نہیں ہو جاتی ہم میں اور تم میں رشتۂ اخوت قائم ہے اور تم ابھی ہماری طرف سے نصیحت کے مستحق ہو۔ بے شک جب تلوار چلنے لگے گی تو یہ رشتہ خود بخود ٹوٹ جائے گا اور ہم علیحدہ علیحدہ ملتوں کے تابع قرار پا جائیں گے۔ یقیناً اللہ نے ہماری اور تمھاری آزمائش کی ہے۔ اپنے نبی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد کے ذریعہ سے تاکہ وہ دیکھے کہ ہم ان کے ساتھ کیا کرتے ہیں اور تم کیا سلوک کرتے ہو۔ ہم تم سب کو دعوت دیتے ہیں کہ ان کی مدد کرو اور عبید اللہ بن زیاد کا ساتھ چھوڑ دو۔ یزید اور ابن زیاد سے تم کو ان کی حکومت کے تمام دور میں کبھی سوا برائی کے کوئی اچھا سلوک نظر نہ آئے گا۔ وہ تمھاری آنکھوں میں سلائیاں پھروا دیتے۔ تمھارے ہاتھ پاؤں قطع کرا دیتے۔ تم کو سولیاں دلواتے اور تمھارے نیک اعمال حفاظِ قرآن مثلاً حجر بن عدی اور ان کے ہمراہیوں اور ہانی بن عروہ وغیرہ کے ایسے اشخاص کو قتل کرتے رہے ہیں۔" [1]

مضمون کے لحاظ سے امام حسینؑ کے خطبہ اور زہیر بن قین کی تقریر میں بہت نمایاں فرق ہے۔ اس کا انداز خاص طور پر انفرادی حیثیت سے حقیقت حال کو واضح کرنے اور اپنی شخصیت کے تعارف پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ اور اس میں موجودہ حکومت کے متعلق ایک سیاسی تبصرہ ہے جس میں یزید سے زیادہ ابن زیاد کی حکومت کے کردار پر تبصرہ کیا گیا۔ اس مصلحت سے کہ مخاطب کوفہ کے باشندے تھے اور ان کو براہِ راست ابن زیاد کے مظالم سے سابقہ پڑ رہا تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ زہیر بن قین کو اپنی تقریر کے سلسلے میں سخت مزاحمت سے دوچار ہونا پڑا۔ اس طرح کہ ابن زیاد کے ہوا خواہوں اور خوشامدیوں نے خود زہیر کی مذمت اور ابن زیاد کی مدح شروع کر دی اور کہا ہم اس وقت تک دم نہ لیں گے جب تک تمھارے سردار اور ان کے ساتھیوں کو قتل نہ کر لیں یا

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۳

گرفتار کرکے ان کو ابن زیاد کے پاس نہ لے جائیں۔ زہیر اس کے بعد بھی خاموش نہ ہوئے اور ان کو ہدایت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ شمر نے تیر لگایا اور کہا "بس خاموش۔ خدا تیری زبان کو چپ کرے"، مگر زہیر نے تیر کی بھی کوئی پروا نہیں کی اور وہ شمر سے مصروفِ کلام ہو گئے۔ شمر کے اس کہنے پر کہ "دیکھو تھوڑی دیر میں تم اور تمھارے سردار سب قتل ہوا چاہتے ہیں،" زہیر نے بڑی جگرداری اور قوتِ ایمانی کے ساتھ جواب دیا۔ "تو مجھے موت سے خوف دلاتا ہے؟ خدا کی قسم ان کے ساتھ مرنا مجھے تم لوگوں کے ساتھ زندگیٔ جاوید حاصل کرنے سے زیادہ محبوب ہے۔" اس کے بعد پھر وہ لشکرِ مخالف کی طرف مخاطب ہوئے اور کہا "اے اللہ کے بندو! ایسے بندگانِ زر کے کہنے میں نہ آؤ۔ خدا کی قسم پیغمبرِ خداؐ کی شفاعت ان لوگوں کو کبھی نصیب نہیں ہو سکتی جنھوں نے پیغمبرِ خداؐ کی اولاد کا خون بہایا ہو اور ان کے مددگاروں کو قتل کیا ہو۔" امام حسینؑ نے یہ دیکھ کر کہ باتوں کا جواب تیر سے دیا جا رہا ہے اور اتمامِ حجت کا فرض ادا ہو چکا ہے کسی سے پکار کر کہلوایا کہ زہیر! واپس چلے آؤ، اگر مومنِ آلِ فرعون نے اپنی قوم کو نصیحت کرکے اپنے فرض کو ادا کر دیا تھا تو یقیناً تم بھی اپنا فرض پورا کر چکے اور نصیحت کا حق ادا کر دیا۔ مگر نصیحت و تبلیغ کا کوئی فائدہ بھی تو ہو۔[۱] اس آواز کو سنکر زہیر واپس چلے آئے۔

ان مصلحانہ رجحانات، ان حقیقت ریز بیانات اور بصیرت افروز نصائح و اظہارات کا کوئی اثر ہو رہا تھا یا نہیں۔ یہ امر بالکل تاریکی میں تھا، جب تک کہ حُر کے باطن نے پردہ الٹ کر اپنے کو ظاہر نہیں کیا۔ ہماری کتاب کے ناظرین کے لیے یہ نام کوئی اجنبی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہی حُر وہ تھا جس نے ایک ہزار فوج کی جمعیت کے ساتھ آکر کوفہ کے راستے میں امام حسینؑ کو روکا تھا جو آپ کو گھیر کر کربلا لایا تھا اور جس نے ابن زیاد کا خط آنے کے بعد اتنی سختی برتی تھی کہ خیامِ حسینی کو دریا کے کنارے برپا نہ ہوتے دیا تھا۔ اس کے بعد محرّم کی دوسری تاریخ سے دسویں تک اس کی کیا حالت رہی تھی اس کا بعد کی صورتِ حال اور خود حُر کے اقوال سے پتہ چلتا ہے کہ جس وقت سے وہ

[۱] طبری ج ۶ ص۲۴۳ ، ۲۴۴

امام حسینؑ کو کربلا میں پہنچا کر ابن زیاد کو مطلع کر چکا اس وقت سے برابر خاموشی کے عالم میں مگر بے چینی کے ساتھ حالات کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا۔

اس کے قبل اس نے راستے ہی میں اس طرح کی سلسلہ جنبانی کرنا چاہی تھی کہ کسی طرح امام حسینؑ اور یزید یا ابن زیاد کے درمیان کچھ خط و کتابت ہو اور معاملات روبہ اصلاح ہو جائیں۔ اس کے بعد میدانِ کربلا میں پہنچنے کے بعد بھی اسے یہ توقع تھی کہ بیچ میں کوئی ایسا مشترک نقطہ پیدا ہو جائے گا جہاں امام اور ان کے مخالف مجتمع ہو جائیں اور جنگ کی صورت پیش نہ آئے۔ اسے کوفہ سے متواتر فوجیں آنے سے انتشار ضرور پیدا ہوتا ہوگا مگر عمر بن سعد کا طرزِ عمل اس کے لیے امید افزا تھا جو خود صلح کی گفتگوئیں کر رہا تھا اور یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح جنگ نہ ہو۔ ایسا بھی وقت آیا جب سلسلۂ گفتگو ایسے نقطہ پر پہنچا جہاں عمر سعد تک نے یہ طے کر لیا کہ اب معاملہ یکسو ہو گیا اور مقابلہ کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ پھر ایسی صورت میں حُر کو یہ سمجھنے کی کیا وجہ تھی کہ جنگ ضرور ہوگی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ امام کا طرزِ عمل روادارانہ ہے۔ آپ اپنی جانب سے معقول شرائط پیش کر رہے ہیں جن پر صلح نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ توقعات تھے جو اس کے دل و دماغ پر نویں محرّم کی سہ پہر تک چھائے رہے ہونگے مگر ۹ محرّم کی شام کو یہ سب امیدیں منقطع ہو گئیں۔ ابن زیاد کے اس خط سے جو شمر بن ذی الجوشن کے ہاتھ عمر سعد کے پاس پہنچا جس کے بعد عمر سعد مجبور تھا کہ وہ اسی وقت حسینی جماعت پر حملہ آور ہو اور بدقت تمام حسینؑ اور اصحابِ حسینؑ کو صرف ایک شب کی مہلت عبادتِ خدا کے لیے دینا منظور کرے۔ یقیناً یہ وہ وقت تھا کہ جب حقیقتاً حُر کے سامنے امام حسینؑ سے کھل کر جنگ کرنے اور آپ کے قتلِ ناحق میں شرکت کرنے کا سوال صریحی طور پر پیدا ہو گیا اور اس کو یہ نظر آنے لگا تھا کہ میں نے اس سے پہلے حسینؑ کے خلاف جتنے بھی اقدامات کیے تھے وہ اس مظلوم مقدس ہستی کو فنا کی منزل سے قریب کرنے کے سامان تھے۔ اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے اور اس کے بعد پھر اب کیا مجھ کو اس سے بڑے اقدامات میں شرکت کرنا چاہیے؟ کیا میں حسینؑ کے خون میں اپنے ہاتھوں کو رنگین کر سکتا ہوں؟ اس کا ضمیر سختی سے انکار کرتا تھا کہ ہرگز نہیں۔

مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا۔ اسے اب سب کچھ یاد آتا ہوگا کہ حسینؑ وہ تھے جنھوں نے اس سخت موقع پر مجھے اور میری تمام فوج کو پانی سے سیراب کیا تھا۔ اب ان پر اور ان کے ننھے ننھے بچوں تک پر پانی بند ہے اور یہ بڑی حد تک میری ہی وجہ سے، اس لیے کہ میں نے ہی انھیں اس بے آب و گیاہ مقام پر اترنے کے لیے مجبور کیا۔ یہ سوچ کر اس کے قلب میں خود اپنی ہستی سے انتقام لینے کا جذبہ پیدا ہوتا ہوگا یا کم از کم اس کی کسی صورت سے تلافی کی صورتوں پر غور کرتے ہوئے وہ خیال کرتا ہوگا کہ اگر میں حسینؑ کے پاس جا کر اپنی اس خطا کو معاف کرنے کی درخواست کروں تو کیا اتنا بڑا مجرم دنیا میں معافی کے قابل بھی ہے؟ پھر اگر حسینؑ نے میری خطا کو معاف نہ کیا تو میں کہاں کا رہا؟ نہ دنیا ملی نہ آخرت۔ پھر بھی اس کا ضمیر کہتا ہوگا کہ چل کر معافی مانگنا تو چاہیے اپنا امکانی فرض تو بہرحال انجام دینا ضروری ہے۔ پھر میں جب اپنی جان ان کے قدموں پر ڈال دوں گا تو وہ کریم النفس ہیں ضرور معاف کر دیں گے۔ قرآئن کی بنا پر یقین کیا جا سکتا ہے کہ یہ خیالات تھے جو اس کے دماغ میں ایک تلاطم برپا کیے ہوئے تھے اور وہ شب عاشور ہی تھی جس کی سیاہی کے بے پناہ سمندر میں اس کے خیالات کی کشتی تھپیڑے کھا رہی تھی۔

ہُو مارتا ہوا جنگل اور رات کا سناٹا! صفحۂ تاریخ بھی سنسان ہے، کون مورخ ہے جو اس معرکہ کی داستان قلم بند کرے جو حُر کے دل و دماغ میں برپا تھا۔ بے شک سچا شاعر اکثر حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے۔ میر انیس علیہ الرحمۃ اور ان کے خاندان کے دوسرے باکمال مرثیہ گویوں نے جس طرح اس رات کو حُر کی حالت کی خیالی تصویرکشی کی ہے۔ وہ یقیناً ایک ایسا بیان حال ہے جس کی روایت خاموش فطرت کے واسطہ سے شاعر کے دل تک پہنچی ہے اور واقعات کے قرآئن اسکی تصدیق کرتے ہیں۔

بہرطور رات کسی طرح گزری اور صبح ہوئی۔ حُر کو پھر بھی یہ دیکھنا ہے کہ اب کیا ہوتا ہے کیا واقعی جنگ ہی ہوگی یا کوئی اور صورت رونما ہوگی۔ اس نے انتہائی صبر و ضبط کے ساتھ دیکھا کہ افواج کی ترتیب ہوئی۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ ایک حصہ فوج کا افسر قرار دیا گیا

اس نے امام کا بے نظیر مؤثر خطبہ سنا جس نے اس کے دل میں گھر کر لیا۔ مگر پھر اس نے انتظار کیا کہ اس کا اثر فوجِ مخالف پر کیا پڑتا ہے۔ اسی اثنا میں زہیر بن قین نے بڑھ کر تقریر کی اور ناصحانہ انداز میں اہلِ کوفہ کو مخاطب کیا۔ ان تمام باتوں کے بعد بھی اسے محسوس ہوا کہ افواج یزید کے ارادوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے اور وہ جنگ پر آمادہ ہیں۔ بس اس کے بعد حُر کے صبر و ضبط کا پیمانہ چھلک گیا اور وہ خیال جو اس کے دل میں پرورش پا رہا تھا اب رازداری کے حدود سے آگے بڑھ گیا۔ وہ عمر سعد کے پاس آیا اور کہا "کیا تم ان سے واقعی جنگ کرو گے؟"[1] اسی ایک سوال کے انداز میں وہ سب کیفیتیں مضمر تھیں جن میں حُر کئی روز سے دل ہی دل میں غلطاں و پیچاں تھا۔ اسے یہ یقین آنے کے قابل بات ہی نہیں معلوم ہوتی تھی کہ فرزندِ رسولؐ سے جنگ عملی شکل بھی اختیار کرے گی۔ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے آثار و قرآئن کو جنگ کے قطعی پا رہا ہے مگر پھر بھی اس کی آرزو رکھتا ہے کہ یہ سب نمائشی ہو اور اس کو واقعیت سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ عمر بن سعد اس کے ضمیر کے اندرونی کیفیات سے بالکل بیگانہ تھا۔ اس نے حُر کے سوال کا فوجی انداز میں بڑے اطمینان کے ساتھ جواب دیا۔ "ہاں قسم بخدا، ایسی جنگ جس کا بہت ادنیٰ نتیجہ یہ سمجھنا چاہیے کہ سروں کی بارش ہو اور ہاتھ قلم ہو کر زمین پر گریں۔" حُر نے کہا "کیا اتنی صورتیں مصالحت کی جو حسینؑ نے پیش کیں ان میں سے کوئی تم لوگوں کے نزدیک منظوری کے قابل نہیں ہے؟"[2] اس سوال سے صاف ظاہر ہے کہ وہ صلح کی گفتگو کو پورے غور سے نتیجہ کی جستجو کے ساتھ سن رہا تھا اور یہ یقین رکھتا تھا کہ ان صورتوں میں سے کوئی ضرور مان لی جائے گی۔ عمر بن سعد نے کہا کہ "خدا کی قسم اگر معاملہ میرے ہاتھ میں ہوتا تو میں ضرور منظور کر لیتا مگر کیا کروں؛ تمھارا حاکم نہیں مانتا۔"[3] عمر سعد کا یہ جواب خود کمزوری کا پہلو لیے ہوئے تھا اور اس کا عنوان حُر کی رائے اور خیال کو مزید تقویت دینے والا تھا اس لیے کہ وہ تسلیم کر رہا تھا کہ حسینؑ کا مسلک صلح جوئی کا حامل ہے اور ابن زیاد کی ہٹ دھرمی ہے کہ وہ قتل

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۴ [2] طبری ج ۶ ص ۲۴۴ [3] طبری ج ۶ ص ۲۴۴

حسینؑ سے کم کسی بات پر رضامند نہیں۔ اس کے بعد حُرؑ کچھ گفتگو کرنا بیکار سمجھا اور اب یہ وقت آگیا تھا کہ وہ اپنے اس فیصلہ کو جو بہت مشکل سے اسکے دل و دماغ کے انتہائی کشمکش کے نتیجہ میں طے پاسکا تھا عملی لباس پہنائے۔

حُرؑ کو یہ اندیشہ قطعی تھا کہ اگر فوج سے نکلنے کے پہلے یہ ظاہر ہو گیا کہ میری نیت کچھ اور ہے تو مجھے فوراً گرفتار کر لیا جائے گا اور میں اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکوں گا۔ اس لیے ظاہر ہے کہ وہ اس وقت بہت احتیاط سے کام لے رہا ہوگا۔ اس کے قبیلہ کا ایک شخص قرّہ بن قیس اس وقت اس کے نزدیک تھا[1] غالباً یہ وہی شخص ہے جو عمر بن سعد کا پیغام لے کر امام کی خدمت میں گیا تھا اور حبیب بن مظاہر کے نصیحت کرنے پر اس نے کہا تھا کہ میں جو پیغام لایا ہوں جاکر اس کا جواب دے دوں تو پھر غور کروں گا کہ خود مجھے کس کا ساتھ دینا چاہیے۔ حُرؑ کو اس کا اپنے پاس رہنا ناگوار ہو رہا تھا، وہ چاہتا تھا کہ یہ کسی طرح میرے پاس سے ہٹ جائے مگر کچھ بنتا نہ تھا۔ آخر اس نے پوچھا کہ "قرّہ! تم نے آج اپنے گھوڑے کو پانی نہیں پلایا؟" اس نے کہا "نہیں ابھی نہیں"۔ کہا، "پھر پلاؤ گے نہیں[2]؟" انسان کا چہرہ، اس کی بات چیت، اس کے چہرہ کا رنگ سب ہی اسکے خلاف جاسوسی کرتے ہیں۔ حُرؑ لاکھ چھپائے مگر دل کا اضطراب چھپنے کی چیز نہیں۔ قرہ کچھ نہ سمجھا ہو اتنا تو سمجھ لیا کہ یہ مجھے اپنے پاس سے ٹالنا چاہتے ہیں۔ بعد میں اس کا بیان تھا کہ اگر حُرؑ مجھ سے بتلا دیتے کہ میں امام حسینؑ کی طرف جا رہا ہوں تو میں بھی یقیناً ان کے ساتھ ہو لیتا اور نکل جاتا[3] مگر یہ کہنے کی باتیں ہیں اور خواہ مخواہ کے عذر ہیں جو احساس گناہ پر وقت نکلنے کے بعد پیش کیے جاتے ہیں۔ اگر ایسی اخلاقی جرأت اس میں موجود ہوتی تو حُرؑ کے بے کہے چلے جانے پر بھی قرّہ کے لیے راستہ نہیں بند ہو گیا تھا۔ وہ جانا چاہتا تو چلا جاتا۔ بہرحال یہ محسوس ہوتے ہوئے کہ حُرؑ کو میرا اپنے پاس رہنا ناگوار ہے اس نے اُس کے پاس سے ہٹ جانا ہی مناسب سمجھا۔ حُرؑ نے اپنے خیال کے مطابق اس کو ہٹا کر ایک رکاوٹ کو اپنے راستے سے دور کر دیا اور آہستہ آہستہ گھوڑا

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۴ [2] طبری ج ۶ ص ۲۴۴ [3] طبری ج ۶ ص ۲۴۴

اپنا جماعت حسینی کی طرف بڑھانا شروع کیا۔ نفسیاتی حیثیت سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت اس کا دل دھڑک رہا ہوگا۔ اس کے سینہ میں طوفان برپا ہوگا اور یقیناً وہ محسوس کر رہا ہوگا کہ اب میں کہیں اور رہوں۔ اس پر اُس وقت ایک خود فراموشی اور مدہوشی کا عالم طاری ہوگا۔ اس وقت کسی کا ٹوک دینا! معاذ اللہ۔

مہاجر بن اوس اس کے قبیلہ کا ایک شخص کہنے لگا "کیوں حُرؑ! کیا ارادہ ہے؟ کیا حملہ کرنا چاہتے ہو[1]؟" حُرؑ اس کا کیا جواب دیتا؟ اس نے پھر بھی سکوت کر کے پردہ داری کی کوشش کی۔ کچھ جواب نہیں دیا، مگر جسم میں لرزہ سا پیدا ہو گیا۔ مہاجر نے کہا "حُرؑ تمھاری یہ کیا حالت ہے؟ میں نے تمھاری یہ کیفیت کبھی نہیں دیکھی۔ مجھ سے پوچھا جاتا کہ کوفہ میں سب سے زیادہ بہادر کون ہے تو میں تمھارے سوا کسی کا نام نہ لیتا۔ مگر اس وقت میں تمھاری عجیب حالت دیکھ رہا ہوں۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟" یہ سنکر حُرؑ نے مزید رازداری کی کوشش کو بے سود سمجھا۔ کہا "میرے سامنے اس وقت بہشت و دوزخ کا سوال ہے۔ میں تو بہشت پر کسی چیز کو مقدم نہ سمجھوں گا۔ چاہے میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں اور مجھے آگ میں جلا دیا جائے۔" یہ کہتے کہتے اس نے گھوڑے کو چابک لگایا اور اصحاب حسینؑ کی طرف پہنچ گیا[2]

اس موقع پر شاید حُرؑ کو اندیشہ ہوا کہ اس کے اس طرح بے تحاشا گھوڑا اڑائے ہوئے آنے سے کہیں انصار امام کو پریشانی نہ پیدا ہو اور اس کی مزاحمت نہ کی جائے اس لیے اس نے انکے قریب پہنچتے ہی اپنی سپر کو پلٹ کر ہاتھ میں لے لیا[3] یہ طرز عمل عرب کے دستور کے مطابق تھا اس لیے کہ جب کسی کو حملہ کرنا مقصود ہو تو اس کے ایک ہاتھ میں کھنچی ہوئی تلوار اور دوسرے میں حفاظت کے لیے سپر ہوتی تھی لیکن اگر کوئی تلوار نیام میں رکھے اور پلٹی ہوئی سپر کو ہاتھ میں لیے آتا دکھائی دے تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ امان کا طالب ہے یا کچھ پیغام لے کر آ رہا ہے[4]۔ اس نے اس طرح اصحاب حسینؑ پر واضح کر دیا کہ وہ جنگ کا ارادہ نہیں رکھتا ہے۔ چنانچہ

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۴ [2] طبری ج ۶ ص ۲۴۴ [3] طبری ج ۶ ص ۲۲۲ [4] ابصار العین ص ۱۱۹

بلا روک ٹوک وہ سیدھا امام کے سامنے آیا اور کہنے لگا، فرزندِ رسولؐ! میری جان آپ پر فدا، میں وہی گنہگار ہوں جس نے آپ کو واپس جانے سے روکا۔ راستے میں آپ کے ساتھ ساتھ رہا اور آپ کو اس جگہ ٹھہرنے پر مجبور کیا۔ قسم ہے اس خدا کی جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں کہ مجھے یہ گمان ہرگز نہیں تھا کہ یہ لوگ آپ کے تمام شرائط کو جو آپ پیش کریں گے مسترد کر دیں گے اور نوبت یہاں تک پہنچے گی۔ میں نے اپنے دل میں خیال کیا تھا کہ کیا حرج ہے، میں کسی حد تک ان لوگوں کا ساتھ دوں اور معلوم نہ ہو کہ میں ان کی اطاعت سے باہر ہوں۔ پھر یہ لوگ ان شرائط کو تو قبول ہی کر لیں گے جو امام ان کے سامنے پیش کریں گے۔ بخدا اگر مجھے یہ علم ہوتا کہ یہ لوگ ان شرائط کو آپ کے منظور نہیں کریں گے تو میں کبھی آپ کے ساتھ یہ طرزِ عمل اختیار نہ کرتا۔ اچھا اب میں حاضر ہوا ہوں انتہائی شرمساری کے ساتھ توبہ کرتا ہوا اپنے گناہ سے خدا کی بارگاہ میں اس غرض سے کہ جان و دل سے آپ کا شریکِ مصیبت ہوں۔ یہاں تک کہ آپ کے قدموں پر نثار ہو جاؤں۔ کیا اس طرح میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟" حضرت نے بلا توقف فرمایا۔ "ہاں ہاں! خدا تمھاری توبہ قبول کرے گا اور تمھیں بخش دے گا۔ مبارک ہو۔ واقعی تم حُرّ (آزاد منش) ہو۔ ویسے ہی جیسا تمھاری ماں نے نام رکھا ہے۔ تم آزاد ہو انشاء اللہ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔[1] گھوڑے سے تو اُترو۔" حُر نے کہا۔ "میرا آپ کی نصرت میں گھوڑے پر سوار رہنا نیچے اترنے سے بہتر ہے۔ چاہتا ہوں تھوڑی دیر ان سے جنگ کر لوں، پھر تو (مر کر) گھوڑے سے نیچے اترنا ہی ہے۔" امام نے یہ دیکھ کر کہ حُر کو جہاد کا ولولہ ہے۔ فرمایا۔ "اچھا جو تمھاری خوشی ہو وہ کرو۔ خدا اپنی رحمت تمھارے شاملِ حال رکھے۔"[2] وہ ضبط بہت کر چکا تھا۔ امام سے خطا معاف کرا کے اس کا دل بڑھ چکا تھا۔ اب اسے حق محسوس ہوتا تھا کہ وہ افواجِ یزید کے سامنے جا کر ان کو بھی حق کے راستے پر آ جانے کی دعوت دے۔ چنانچہ وہ فوراً میدان میں آ گیا۔ پہلے تو اس نے ملاتم الفاظ میں صفوفِ اہلِ کوفہ سے تخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "بھائیو! آخر حسینؑ کی ان باتوں میں سے

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۴، الاخبار الطوال ص ۲۵۴ [2] طبری ج ۶ ص ۲۵۴، ارشاد ص ۲۲۹

جن کو وہ پیش کرتے ہیں کسی ایک بات کو تم کیوں نہیں منظور کر لیتے تاکہ تمھیں ان کے مقابلہ میں جنگ کرنے سے نجات ملے۔" لشکریوں نے کہا کہ امیر عمر سعد موجود ہیں جو کچھ تمھیں کہنا ہے ان سے کہو۔ حُر نے عمر سعد سے مخاطب ہو کر پھر یہی الفاظ کہے اور ویسا ہی جواب ملا جو اس کے قبل مل چکا تھا "کہ اگر مجھ سے ممکن ہوتا تو میں ضرور ایسا کرتا۔" یہ سنکر حُر کو غصّہ آ گیا، اتنے تلخ الفاظ میں جن کا اسے خود اسی فوج کے ایک نمایاں افسر ہونے کی بنا پر پورے طور سے حق حاصل تھا۔ اس نے کہا۔ "اے کوفہ والو خدا تمھیں غارت کرے۔ تم نے اس بزرگوار کو بلایا اور جب وہ آیا تو تم نے اسے دشمن کے سپرد کر دیا۔ تم نے خیال ظاہر کیا تھا کہ تم ان پر جان نثار کر دو گے۔ پھر تم نے خود ان پر چڑھائی کر دی اور ان کے قتل پر آمادہ ہو گئے۔ تم نے ان کے نفس کی آمد و شد کو مسدود کر رکھا ہے اور گلا گھونٹنے پر آمادہ ہو اور چاروں طرف سے انھیں گھیر رکھا ہے۔ تم نے ان کو خدا کی چوڑی چکلی زمین میں جدھر وہ امن کا راستہ پائیں اُدھر جانے سے روک دیا ہے۔ اور وہ تمھارے ہاتھ میں قیدی کے مثل ہو گئے ہیں اور بے بس کر دیے گئے ہیں اور تم نے ان کو، ان کے اہلِ حرم اور بچوں کو اور ان کے اصحاب کو فرات کے اس بہتے ہوئے پانی سے روک دیا ہے جس کو یہودی مجوسی اور نصرانی تک پیتے ہیں اور عراق کے سؤر اور کتے تک اس میں لوٹتے ہیں مگر یہ لوگ ہیں کہ پیاس کی شدت نے ان کو جاں بلب کر رکھا ہے۔ حقیقتاً کیا بُرا وہ سلوک ہے جو تم نے محمد مصطفےٰ ؐ کے بعد ان کی اولاد کے ساتھ جائز رکھا ہے۔ تم کو خدا اس شدت والی پیاس کے دن سیراب نہ کرے اگر تم آج ابھی اسی دم توبہ نہ کر لو اور اپنے طرزِ عمل سے پشیمان ہو کر باز نہ آ جاؤ۔"

حُر کی تقریر دشمن کے مفاد کے خلاف بہت خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ اس لیے تیراندازوں کو حکم دیا گیا اور انھوں نے کچھ تیر چلائے۔ یہ دیکھ کر حُر نے تقریر موقوف کر دی اور چونکہ جنگ باقاعدہ شروع نہ ہوئی تھی وہ واپس آ کر امام کے سامنے کھڑے ہو گئے۔[1]

جیسا کہ شبِ عاشور کی مہلت پر بحث کے سلسلہ میں کہا جا چکا ہے یہ امام حسینؑ کی ایک

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۵، ارشاد ص ۲۵۰

بہت بڑی فتح تھی جو عین موقع جنگ پر خود آپ کی آنکھوں کے سامنے اور آپ کے دشمنوں کی نگاہوں کے سامنے ظاہر ہوگئی کیونکہ ہر شخص اندازہ کرسکتا ہے کہ جس قدر ہمت بڑھانے اور دلوں کو اپنی طرف جذب کرنے کے مادی اسباب ہوسکتے ہیں سب فوج یزید کی طرف تھے۔ کثرت تعداد طاقت وقوت، یقین کامیابی، آسائش وراحت، آب وغذا کا اطمینان، پھر جائزہ وانعام اور بارگاہِ حکومت میں تقرّب کے توقعات اس کے برخلاف جتنے ہمت شکن اور جی چھڑانے والے اسباب ہوسکتے ہیں وہ سب اصحابِ حسینؑ میں مجتمع تھے۔ قلّتِ تعداد، بےکسی وبےبسی، یقین بربادی اور تین دن کی بھوک پیاس اور حکومت کا عتاب جس کا نتیجہ اپنے ہی لیے نہیں بلکہ اپنے بعد اپنے پسماندگان اور اولاد کے لیے بھی ہمت شکن اور طاقت ربا ہونے کے لیے کافی ہے۔ اس سب کے باوجود تاریخ یہ بتانے سے عاجز ہے کہ ان میں سے کوئی ایک معمولی سپاہی بلکہ بچہ بھی الگ ہو کر فوج مخالف سے جا کر ملا ہو۔ نہ حسینؑ کی زندگی میں اور نہ حسینؑ کے بعد۔ اس کے برخلاف فوج مخالف کا کوئی معمولی شخص نہیں بلکہ ایک نمایاں افسر جنگ شروع ہونے سے قبل ہی اُدھر سے ٹوٹ کر ادھر آگیا۔ یہ وہ غیر معمولی فتح تھی جس نے فوج مخالف کو دنگ کر دیا اور شاید فوج کا رنگ بے رنگ پا کر ہی سالار فوج نے مزید تاخیر کو خطرناک پایا۔

اب دھوپ کافی چڑھ چکی تھی اور دن کا اچھا خاصا حصّہ گزر گیا تھا۔ عمر سعد نے لشکر کو آگے بڑھایا اور اپنے غلام دُرَید کو جو علمبردارِ لشکر تھا آواز دی کہ جھنڈا اپنا میرے قریب لاؤ۔ وہ رایتِ جنگ لیے اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ عمر سعد نے تیر اپنا چلہٗ کمان میں جوڑ کر فوج حسینی کی طرف رہا کیا اور لشکرِ یزید کو مخاطب کرتے ہوئے پکار کر کہا "گواہ رہنا کہ سب سے پہلا تیر میں نے لگایا ہے۔"

سپہ سالارِ لشکر ان الفاظ کو اپنی زبان پر جاری کرتے ہوئے تیر رہا کرے اور لشکر والوں میں جوش وخروش پیدا نہ ہو، یہ ناممکن ہے۔ یقیناً ہزاروں کمانیں کڑکیں، ہزاروں چلّے کھنچے

ہزاروں تیر روانہ ہو گئے۔

نہیں سمجھا جاسکتا کہ حضرت امام حسینؑ کے ساتھ والی قلیل جماعت اس اچانک حملہ کا مقابلہ کرنے کے لیے کسی طریقہ پر تیار ہوسکتی تھی مگر انھیں تیاری کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ان کے تنے ہوئے سینے تیروں کے استقبال کے لیے موجود اور ان کے دل وجگر، شوقِ شہادت میں ناوکوں کو ہاتھوں ہاتھ لینے پر آمادہ تھے۔

یزیدی لشکر والوں کو اندازہ تھا اور خوب اندازہ کہ اگر حسینی جماعت سے وہ کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہی دست بدست مقابلہ کیا گیا تو کربلا کی جنگ صرف عاشور کے دن ختم نہیں ہوسکے گی اور وہ اس کو بھی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ جنگ کا طول کھینچنا ان کے لیے انتہائی اندیشہ کا باعث ہے۔ اس لیے کہ امام کی مکہ سے روانگی کی اطلاع بصرہ میں ہوچکی ہے اور وہاں سے مدد پہنچنے کی توقع ہے۔ کوفہ کے بہت سے افراد جو ابھی تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ یقیناً موقع کے منتظر اور نصرتِ حسینؑ کے لیے بےچین ہوں گے نیز یہ بھی کہ ایران کچھ دور نہیں ہے اور وہاں کے بھی کچھ افراد کا امام حسینؑ کے ساتھ عقیدت رکھنا یقینی ہے۔ خصوصاً جبکہ ان کے ساتھ علیؑ بن الحسینؑ بھی موجود ہیں جو ننھیالی رشتہ سے مملکتِ ایران کے شہزادے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا بہت امکان ہے کہ قومی تعصب ہی ایرانیوں کو حسینؑ کی حمایت پر آمادہ کردے۔ یہ بھی خیال ہوسکتا تھا کہ اجا وسلمیٰ پہاڑ بھی بہت فاصلہ پر نہیں ہیں جہاں کا قبیلۂ طے کافی اہمیت وطاقت کا مالک ہے اور طرماح بن عدی، امام حسینؑ سے یہ وعدہ بھی کر چکے ہیں کہ اگر آپ اپنے کو وہاں پہنچا دیں تو آپ کی مدد کے لیے ہزاروں جوان قبیلۂ طے کے بالکل تیار پائے جائیں گے۔ پھر خود طرماح صحرائے کربلا کے قریب حضرت سے یہ کہہ کر رخصت ہوئے ہیں کہ میرا کچھ غلّہ ہے، اسے گھر پر رکھ آؤں تو آتا ہوں۔ ممکن ہے وہ آئیں تو اپنے ساتھ کچھ جوانانِ طے کو لیتے ہوئے آئیں۔ بہرحال اسباب کچھ بھی ہوں مگر بظاہر فوج یزید کو بہت جلدی تھی اور وہ چاہتی تھی کہ [illegible] جلدی [illegible] ہو جائے مگر تیروں کی اس ابتدائی بارش سے جماعت حسینؑ کو کوئی خاص نقصان